تذکرۂ طیبؒ



مرتب محمد ابوبکر غازیپوری

ناشر المکتبۃ الاثریہ قاسمی منزل، سید واڑہ، غازی پور (یوپی)

تذکرۂ طیّب

یعنی

حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہٗ مہتمم دار العلوم دیوبند کے حالات زندگی اور ان کی گوناگوں دینی و ملّی و علمی خدمات کا ایک مکمل تعارف اور ارباب علم و دانش کا خراج عقیدت

مرتبہ:- محمد ابوبکر غازیپوری نگرانِ اعلیٰ مکتبہ اثریّہ غازی پور

ناشر:- مکتبہ اثریّہ قاسمی منزل،
سیّد واڑہ، غازیپور (یوپی)

کتابت چھپائی سنٹر جلالپور، فیض آباد

(تاج آفسٹ پریس الہ آباد-۳)

فہرست

تواریخ وفات

تاثرات

سوانح و حالات زندگی

فضل و کمال

خدمات و کارنامے

تواریخ وفات

جانفزا لوحِ تواریخ

١٤٠٣ھ

بسم اللہ الوکیل الفتاح الرحمٰن الرحیم

١٤٠٣ھ

نحمد الحق العظیم ونصلی علی النبی الکریم

١٩٨٣ء

قال المجید، وَسَقَاھُمْ رَبُّھُمْ شَرَابًا طَہُوْرًا

١٤٠٣ھ

حکیمُ الاسلام رحمہ اللہ الخبیر

١٤٠٣ھ

موتُ العالِمِ المؤمنِ موتُ العالَم

١٤٠٣ھ

اِنَّ اللہ القدوس لیرفعُ العلمَ برفعِ العلما

١٤٠٣ھ

حکیمِ انام قاری محمد طیب صاحب طاب ثراہ

١٤٠٣ھ

مولانا القاری محمد طیب مہتمم دار العلوم دیوبند رحمۃ اللہ الوکیل

١٩٨٣ء

زیں جہانِ آب و گل خوش طالبِ علیین رفت

١٩٨٣ء

رحمۃ الملکِ الخالقِ الکریم

١٤٠٣ھ

نوّر مرقدَہُ النورُ الغنی

١٩٨٣ء

بَرَّدَ مضجعَہُ القدوسُ الولی

١٤٠٣ھ

قطعہ بتواریخ

١٤٠٣ھ

قاریِ طیب زعیمِ باصفا — عالمِ دیں ہادیِ راہِ خدا
مہتمم دار العلوم دیوبند — رشد و تقویٰ را امینِ باوفا
سنگِ میلِ مدرسہ دار العلوم — ماہرِ اسرارِ دینِ مصطفیٰ
شیخِ وقت و ہم مجازِ تھانویؒ — صوفیِ حق کیش راہِ حق نما
ماہِ تاباں بود در ہر انجمن — تشنگانِ علم را بحرِ سخا
سندِ احباب، امیرِ کارواں — واعظِ شیریں بیاں شیریں نوا
بود ذاتش منفرد در انجمن — اہلِ علم و فضل را ہم مقتدا
ماہ انور داخلِ جنت بود — از دلم سالِ وفات آید ندا
١٤٠٣ھ
ہاتف از عثماں سراجِ دین گفت — رحلتش ہم مہتمم و ہم پُرضیا
١٩٨٣ء

بدلِ زار محمد عثمان معروفی

١٤٠٣ھ

تشکر و امتنان اور شکوہ

از مرتب

لیجئے تذکرۂ طیب حاضر ہے یہ کیسا ہے؟ یقین جانئے کہ مجھے خود بھی اس کا شدید احساس ہے کہ میری خواہش کے مطابق نہیں ہے لیکن اس میں میرا قصور نہیں ہے میں نے اپنے مقدور بھر پوری کوشش کی کہ اس تذکرۂ طیب کو ہر اعتبار سے خوبصورت بنا کر پیش کروں ظاہری اعتبار سے بھی اور معنوی اعتبار سے بھی لیکن ہندوستان کی علمی فضا عجیب سی ہے یہاں تعاون مفقود ہے اور سہارا دینے والے کم پائے جاتے ہیں ہر شخص کا ایک حلقہ ہے وہ اس حلقہ سے باہر ہو کر دوسروں کی مدد کرنا شاید اپنے مقام و مرتبہ سے گری ہوئی بات سمجھتا ہے۔

ہندوستان کی علمی و ادبی فضا میں تنقید ہے۔ دوسروں پر تنقید کرنا یہاں کا مزاج ہے مگر تعمیری کام میں مدد کرنے کا جذبہ یہاں بہت کم ہے بلکہ مفقود ہے۔

اس کام کا جب نے پروگرام بنایا تھا تو مجھے ان دشواریوں کا احساس نہیں تھا جن کا تجربہ بعد میں ہوا اصحاب قلم حضرات کی خدمت میں خطوط لکھتے لکھتے میں تھک گیا۔ عموماً جوابات حوصلہ شکن ملے اگر عزم پختہ نہ ہوتا اور ہمت بلند نہ ہوتی تو شاید میں اس پروگرام کو منسوخ کرنے کا اعلان کر دیتا مگر الحمد للہ میری طبیعت اتنی کمزور نہیں ہے کہ ان بے رخیوں اور بے وفائیوں کی وجہ سے جن کا قدم قدم پر مجھے سامنا کرنا پڑا ہے میں ہمت ہار جاؤں اور توبہ توڑ ڈالوں، حالات بہت شکن ضرور تھے جس سے قلب و دماغ متاثر ہو رہے تھے مگر اللہ کی ذات پر اعتماد تھا اور نیت بخیر تھی اس لئے کام میں لگا رہا ڈٹا رہا جما رہا خوشامدیں کرتا رہا طعنے سنتا رہا اور اب انھیں حالات میں یہ تذکرہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے جیسا بھی ہے بہر حال اس کی قدر کیجئے اس لئے کہ جو کام ایک جماعت کا ہوتا ہے اس کو تنہا مجھ جیسے ناتواں نے انجام دیا ہے ساتھیوں نے ساتھ چھوڑ دیا معلوم نہیں انھیں کس بات کا خوف تھا بڑوں نے اپنی مشغولیات کا عذر کیا کسی نے کہا کہ کیا بیوقوفی ہے کوئی یہ کام بھی کرنے کا ہے یہ وقت کا ضیاع ہے پیسہ کی بربادی ہے کسی نے اخلاص کے ساتھ کہا کہ تم جو یہ کام کر رہے ہو اس میں تمھاری بدنامی ہے تمھاری شخصیت مجروح ہو گی نہ تم ادھر کے رہو گے نہ اُدھر کے ایک دوست نے بڑے درد کے ساتھ لکھا کہ اگر قاری صاحب مظلوم نہ ہوتے تو میں اس تذکرہ کیلئے کچھ ضرور لکھتا گویا قاری صاحب کی مظلومیت عدم تحریر کا باعث ہو گئی ایک صاحب نے طنز کے لہجے میں لکھا کہ یہ تمھارا تذکرۂ طیب، ثمرۂ طیب نہیں بن سکے گا ایک ہمارے بزرگ نے لکھا کہ اس تذکرہ میں شائع ہونے والی تحریروں سے ہمارے مخالفین غلط فائدہ اٹھائیں گے اس نوع کی باتیں مسلسل سنتا رہا اور سہتا رہا اور یہ شعر گنگناتا رہا۔

کم نظر ہر گام پہ خوف و خطر دیکھا کئے
اہلِ ہمت معجزاتِ بال و پر دیکھا کئے

حضرت قاری طیب صاحب کے بارے میں کچھ لکھنے کے لئے کسی کا تردد اور کسی کا عذر سمجھ میں نہیں آتا

اگر قاری محمد طیب کی گراں قدر ذات بھی اس کی مستحق قرار نہیں پاتی کہ ہمارے اصحاب علم و فضل اس کا لحاظ کریں اور انہوں نے تقریباً پون صدی تک دین و مذہب اور علم ادب کی جو روشن خدمات انجام دی ہیں اس کی قدر اور اس کا اعتراف کریں اور اس کے لئے تھوڑا سا اپنا وقت قربان کریں تو پھر اب کس کے بارے میں توقع رکھی جائے کہ ان اصحاب فضل و کمال کی نگاہ میں اس کی قدر اور وقعت ہو گی کیا یہ ہماری علمی و دینی تاریخ کا زبردست المیہ نہیں ہے کہ ہم اس شخص کو فراموش کر دیں جس کی زندگی کا بیشتر حصہ دین و ملت کی خدمت میں اور دعوت حق کی راہ میں گذرا اور جس نے دار العلوم دیوبند جیسی دینی و علمی درسگاہ کی پچاس سال سے زیادہ مدت تک سربراہی کی کیا اس سے بھی بڑھ کر ہماری ناقدری اور حق ناشناسی کا ثبوت ہو سکتا ہے ؟ اگر اپنوں کو فراموش کر دینے کی یہی خصلت ہم میں باقی رہی تو ہندوستان کی دینی و علمی تاریخ بڑی تاریک ہو گی۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ قاری صاحب کے خاندان والوں نے بھی اس بارے میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا اور قاری صاحب کے وہ قریبی لوگ جو قاری صاحب سے ہمیشہ وابستہ رہے اور جن کے دل میں قاری صاحب کے لئے بظاہر بڑا درد تھا انہوں نے میرے خطوط کا جواب تک نہیں دیا ایک نہیں کئی کئی خط میں نے ان کو لکھا مگر صدائے برنخاست ۔ ع

مجھے شکوہ ہے تو اس گراں خوابی سے

بہرحال جو تجربات ہوئے ہیں ان کی تفصیل دردناک اور بڑی بے مزہ ہے ان کا ذکر نہ کرنا ہی بہتر ہے ہاں انہیں حوصلہ شکن حالات میں بعض دوستوں اور بزرگوں نے ڈھارس بھی بندھائی ہمت بھی بڑھائی اور اپنے قلمی تعاون اور مشوروں سے اور بعض ہمدردوں نے اپنے مالی تعاون سے ہمیں ممنون کرم بھی کیا۔ ہم ان کے شکرگذار ہیں اگر ہمیں یہ بھی تعاون نہ ملتا تو نہ معلوم یہ "تذکرۂ طیب" اس شکل میں بھی آپ کے سامنے ہوتا یا نہیں !

حضرت قاری صاحب کی گراں قدر شخصیت کو دیکھتے ہوئے یہ تذکرہ ناقص اور نامکمل ہے اس کا مجھے احساس ہے حضرت قاری صاحب پر اس سے زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے اور انشاء اللہ یہ کام ہو گا ہمیشہ جناب قاری صاحب کی شخصیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا وقت کا انتظار ہے اب ضرورت اس بات کی ہے کہ قاری صاحب کی مکمل سوانح حیات شائع کی جائے اور انکی کتابوں کو نئے سرے سے عصری ذوق کے مطابق عمدہ کتابت و طباعت کیساتھ شائع کیا جائے ان کا عربی اور انگریزی میں ترجمہ ہو اور ان کی اشاعت کی بھرپور کوشش کی جائے یہ کام چند باحوصلہ مخلصین اور اصحاب ہمت کی توجہ سے انجام پا سکتا ہے اور قاری صاحب کے متعلقین میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ضرورت صرف احساس اور عملی اقدام کی ہے۔

"مکتبہ اخریہ" ایک بہت محدود وسائل کا ادارہ ہے جس کے پاس نہ کوئی ملکیت ہے نہ سرمایہ محض اللہ کے بھروسے اور اس کی توفیق سے اسے علم و دین کی جو خدمت بن پڑ رہی ہے وہ کر رہا ہے

اب تک اس ادارہ سے چار اہم علمی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ "تذکرۂ طیب" بھی اسی ادارہ سے شائع ہو رہا ہے بعض اہم کتابیں طباعت کے منتظر ہیں اصحاب خیر سے گذارش ہے کہ اس ادارے کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ تاکہ یہ ادارہ دین و مذہب اور علم و ادب کی خدمت کرتا رہے۔

محمد ابوبکر غازیپوری

نوٹ:۔ پہلے ہم نے حکیم الاسلام نمبر کا اعلان کیا تھا اب بعض بزرگوں کے حکم سے اس کو "تذکرۂ طیب" کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمْ

ابتدائیہ

حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب مہتمم از ہرِ ایشیاء دار العلوم دیوبند کی ذات گرامی عالم اسلام کی ان عہد آفریں اور مایہ ناز شخصیتوں میں سے تھی جن کا وجود امت کے لئے باعث خیر و برکت ہوا کرتا ہے جو تنہا اپنی ذات سے ایک انجمن ہوا کرتی ہیں جن کا تنہا عمل جنکی جد وجہد جنکی سعی پیہم ایک پوری جماعت کی کوتاہی عمل کا کفارہ بنا کرتی ہے، جن کا وجود قوم کو مغتنم بنا تا ہے اور جن کی ذات وہ شمع ہدایت ہوتی ہے جس سے ملت اسلامیہ روشنی حاصل کر کے اپنی حیات کا کاروان آگے بڑھاتی ہے جو اپنی قوم و ملت کے مسیحا ہوتے ہیں اور جن کے پاس قوم و ملت کی بیماری کا نسخۂ کیمیا ہوتا ہے، جن کے وجود سے قوم و ملت کو ایک سہارا ملتا ہے اور جو حوادث روزگار میں ثابت قدم رہتے ہیں اور بڑی سی بڑی آفتیں اور مصیبتیں بھی ان کے پائے ثبات کو جادۂ مستقیم سے ہٹا نہیں پاتیں ان کے اندر پہاڑ جیسا عزم و صمود ہوتا ہے وہ قوم کے ایسے ناخدا ہوتے ہیں جو اس کی کشتی کو طوفانوں کے تھپیڑوں سے نکال کر ساحل پر پہونچاتے ہیں، جنکی زیر تربیت قوم کے افراد کی اصلاح ہوتی ہے اور ان کے دل کی دنیا بدلتی ہے اور اگر ان کے اندر فطرت سلیمہ موجود ہے تو وہ اپنی قوم کے رہنما و ناخدا بنتے ہیں اور دوسروں کے لئے اسوہ اور نمونہ قرار پاتے ہیں۔

حضرت قاری صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی ذات گرامی انہیں عہد آفریں تاریخ ساز دانائے قوم مسیحائے امت شخصیتوں میں سے ایک بلند و بالا اور ایک عظیم تر شخصیت تھی جن کی وفات سے ملت اسلامیہ ایک ناقابل تلافی نقصان سے دوچار ہوئی ہے اور اس سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پر ہونا بظاہر حالات دشوار معلوم ہوتا ہے۔

آپ کی وفات سے نہ صرف ایک بے مثل خطیب، ایک بے بدل عالم، ایک مربی، ایک شیخ، ایک عالم اسرار شریعت، فلسفۂ اسلامی کا شارح و ترجمان، علوم اسلامیہ کا فرہاد جوئے شیریں، فکر ولی اللّٰہی کا مبلغ، حکمت قاسمیہ کا ترجمان اور میکدہ سلوک و معرفت کا سرشار، و بادہ خوار اور سلسلۂ اکابر کا آخری فرد ملت اسلامیہ سے چلا گیا بلکہ ملت اسلامیہ اس ناخدا سے محروم ہو گئی جو حالات کے بگاڑ میں ملت کی کشتی کو اپنی خداداد دانائی و بصیرت سے ساحل پر لگاتا تھا جس کی ذات قدیم و جدید کا مجمع البحرین تھی اور جو اسلامی فکر و فلسفہ اور اسرار شریعت کو اپنے خواص انداز میں اس طرح پیش کرتا تھا جس سے متردد قوم میں اطمینان کی لہر دوڑ جاتی تھی اور شکوک و شبہات کے بادل چھٹتے تھے جو اپنی ذکاوت و ذہانت اور خداداد ربانی معرفت سے دین و ملت کے الجھے اور پیچیدہ مسائل کو سلجھایا کرتا تھا جس کے سامنے الحاد اور کفر و زندقہ منھ کی کھاتے تھے اسلام پر ہونے والے کسی بھی قسم کے حملہ کیلئے وہ ایک سد سکندری تھا اس نے نہ معلوم کتنے متردد بین متشککین ملحدین کو ان کے تردد شک اور الحاد سے نکال کر اسلام و ایمان کی ٹھنڈی

اور روح افزا چھاؤں میں کر دیا اس نے نہ صرف برِاعظم ایشیاء میں بلکہ یورپ اور امریکہ میں بھی اسلام کی اذان دی اور دعوتِ حق اور کلمۂ اسلام کا ڈنکا بجایا پون صدی کی طویل مدت تک اس نے اسلام کی تبلیغ و دعوت کا کام انجام دیا اور اس کے آوازۂ حق سے معمورۂ ارض کا بیشتر حصہ گونج اٹھا۔

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ گرامی ایسی محبوب و مقبول شخصیت تھی کہ ہر طبقہ میں ان کی پذیرائی تھی اور ہر جگہ ان کی شانِ محبوبیت نمایاں تھی مخالف ہو کہ موافق ان کی شرافتِ نفس کے سب قائل تھے فکر و رائے کا اختلاف تو ان سے ممکن تھا اور بہتوں کو ان سے رہا بھی ہے مگر ان کی شرافتِ نفس اور سلامت طبع اور بے ضرر طبیعت اور مرنجاں مرنج مزاج کا سکہ سب پر قائم تھا اور اس کا خورد و کلاں موافق و مخالف سب قائل تھا، اسلامی آداب و اخلاق کے ایسے نمونے انسانی گروہ میں کم نظر آتے ہیں جو گالیاں کھا کر دعائیں دیں جو قدرت و اقتدار کے باوجود عفو و درگذر سے کام لیں جو انسانیت کا بہت اونچا درجہ ہے وما یلقاھا الا ذو حظ عظیم۔ قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ انسانیت کے اسی اونچے مقام پر فائز تھے وہ حلم و حیا کے پیکر تھے وہ عفو و درگذر کا نمونہ تھے، وہ تواضع و انکسار کی مثال تھے، وہ شرافتِ انسانی کا درس تھے، وہ اسلامی آداب و اخلاق کی تصویر تھے، وہ علم و عمل کا ایسا سنگم تھے جس کی رعنائی و جمال سے قلوب متاثر ہوتے تھے اور انکی شانِ محبوبیت میں اضافہ ہوتا تھا۔ قاری صاحب علیہ الرحمہ کی ذات مجسم شفقت، مجسم رحمت، مجسم محبت تھی، میری نگاہوں نے ان کے جیسا شفیق و کریم نہیں دیکھا کم سے کم ہندوستان میں اس وقت محبوبیت و مقبولیت اور منصب و مقام کے لحاظ سے انکے مقابل کی کوئی دوسری دینی و علمی شخصیت نہیں تھی وہ برِاعظم ایشیاء کی سب سے بڑی عربی و دینی درسگاہ کے سب سے بڑے ذمہ دار تھے، وہ ہندوستان کی سب سے معزز و محبوب خاندان، خاندان قاسمی کے لعل شب چراغ و گل سرسبد تھے، وہ صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالمِ اسلام کے ممتاز خطیب تھے حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کے ممتاز خلفاء میں ان کا شمار تھا، وہ فضل و کمال کی انتہائی بلندی پر تھے مگر ان سب کے باوجود ان جیسا حلیم، ان جیسا متواضع، ان جیسا کریم النفس، ان جیسا شریف الطبع، انسان ان آنکھوں نے نہیں دیکھا رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ۔

قاری صاحب اپنے رب کے رحمت میں پہونچ چکے اور ہمیں یقین ہے کہ رب کریم نے اپنے اس بندہ کے ساتھ خیر کا معاملہ فرمایا ہوگا وہ جنت الماویٰ اور باغ عدن میں ہوں گے نعمتوں کے سایہ میں ہوں گے، دیدارِ خداوندی سے مشرف ہوں گے، ان کی روح اکابر سے گلے مل رہی ہوگی۔

انسان خطا و نسیان کا پتلا ہے، قاری صاحب بھی آدم ہی کی اولاد تھے ہو سکتا ہے کہ ان سے کچھ واقعی لغزشیں اور خطائیں (جن سے کوئی بھی فرد بشر انبیاء کے علاوہ معصومیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا ہے قاری صاحب نے بھی کبھی اس کا دعویٰ نہیں کیا تھا) سرزد ہوئی ہوں، ان سے فکر و نظر کا اختلاف بھی ہو سکتا ہے مگر محض کیا

اس کی وجہ سے ہم قاری صاحب کے مجموعۂ خیر کو پس پشت ڈال دیں، اس سے آنکھیں بند کرلیں اور ان کی واقعی خوبیوں کا اعتراف بھی نہ کریں اور اس احسان فراموشی سے خود اپنے لئے اور اپنی جماعت کے لئے سامانِ رسوائی فراہم کریں اور ملتِ اس پیشوا اور راہنما کو بھلا بیٹھیں جس نے پون صدی سے زیادہ عرصہ تک کشتی ملت کی ناخدائی کی ہے، جو اسلام کا علمبردار رہا ہے جو مسلک حق کا منادر رہا ہے، جو تحریک قاسمیت کی آبرو رہا ہے جو دیوبندیت کا اس زمانہ میں سب سے مقتدر فرد رہا ہے۔ جو اسلام کا مبلغ اور داعی رہا ہے جو فکر ولی اللہ اور فلسفۂ قاسمی کا شارح و ترجمان رہا ہے، جو دین وملت کا پاسبان رہا ہے، ہوسکتا ہے کہ کسی کو قاری صاحب کے ان اوصاف سے اختلاف ہو مگر امت کا بڑا طبقہ تو قاری صاحب کو انھیں اوصاف سے موصوف سمجھتا ہے تو پھر ہمیں کوئی بتلائے کے ہم آخر اس شمع ہدایت کو کیوں کر فراموش کرسکتے ہیں؟ فکر ورائے کا اختلاف کب نہیں رہا ہے آراء و افکار کا یہ تصادم اسلام کی پوری تاریخ کو محیط ہے فقہاء، محدثین، صوفیا، حکماء کی تاریخ پڑھئے آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کے اندر فکر ورائے کا اختلاف کتنا شدید رہا ہے تو محض اس وجہ سے ہم امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام ابن حنبلؒ، امام بخاریؒ، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن رشد، ابن عربی، غزالی، شیخ الاسلام بن عبدالسلام، ابن حجر، علامہ عینی، امام ذہبی، امام سبکی، شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، اسمٰعیل شہید، حضرت نانوتوی، حضرت گنگوہی، شیخ الہند، حضرت تھانوی، حضرت شیخ الاسلام، سید حسین احمد مدنی کی شان میں کلماتِ سپاس ذخیرہ پیش کرنے سے بھی اپنی زبان قلم کو روک دیں اور یہ نفوس قدسیہ جو امت کا قیمتی سرمایہ ہیں اس سرمایہ کو ہم اپنے ہاتھوں سے خود دفن کردیں؟ کیا یہ ملت اسلامیہ کا سب سے المناک حادثہ نہ ہوگا؟

حضرت قاری صاحب علیہ الرحمۃ کی ذاتِ بابرکت کو ہم بشری صفت سے خالی نہیں سمجھتے ہیں ہمیں معلوم ہے کہ قاری صاحب علیہ الرحمۃ کی فطری نرم خوئی حد سے زیادہ بردبار طبیعت اور عفو در گذر کی بے پایاں صفات سے کچھ لوگوں نے غلط فائدہ اٹھایا اور اس سے دارالعلوم دیوبند کو عظیم صدمات سے دوچار ہونا پڑا قاری صاحب نے دارالعلوم کے گذشتہ حادثہ میں ان ہی لوگوں پر اعتماد کیا اور اپنے خیر خواہوں اور ہمدردوں کی بات پر بہت کم توجہ کی جس کے نتیجہ میں خود قاری صاحب کی ذات مجروح اور مطعون ہوئی اور جماعت دارالعلوم بدنام اور رسوا ہوئی بلاشبہ قاری صاحب کا اس بارے میں رویہ غیر مناسب تھا اور ہمیں قاری صاحب سے تعلق ومحبت کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ قاری صاحب کا یہ اقدام غلط تھا لیکن قاری صاحب کی زندگی کے اس گوشہ سے اگر صرف نظر کرلیا جائے تو قاری صاحب کے فضل وکمالات کا اعتراف نہ کرنا یہ احسان فراموشی ہوگی قاری صاحب کی شخصیت کی عظمت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا اور یہی وجہ ہے کہ حضرت قاری صاحب کے انتقال کے بعد پوری ملت اسلامیہ نے ان کا ماتم کیا ہندوستان کے ہر طبقہ نے کلماتِ تعزیت پیش کئے ہر بڑے اور چھوٹے نے اس حادثہ کا احساس کیا۔ اخبارات، وجرائد نے بلا فرق مذہب وملت اداریئے لکھے عالم اسلام کے عربی جرائد ومجلات نے خراج عقیدت پیش کئے اور موافق ومخالف سب نے اس غم کو مشترک غم سمجھا۔

دار العلوم دیوبند تین روز تک مسلسل بند رہا اور اساتذہ اور طلبہ قرآن خوانی اور کلام خوانی میں لگے رہے، دار العلوم دیوبند کے جلسہ تعزیت میں قاری صاحب کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا گیا اور ان کی خدمات کا کھلے الفاظ میں اعتراف کیا گیا اور حضرت قاری صاحب کی وفات کو جماعت دار العلوم کے لئے زبردست حادثہ قرار دیا گیا۔ دار العلوم دیوبند کا ترجمان ماہنامہ "دار العلوم" میں قاری صاحب کی وفات پر طویل اداریہ شائع ہوا دار العلوم کے اساتذہ اور طلبہ اور اراکین شوریٰ کا یہ اظہار تعزیت محض رسمی نہیں تھا بلکہ ہمیں یقین ہے کہ یہ ان کے دل کی آواز تھی۔

پیش نظر "تذکرۂ طیب" فی الاصل اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اپنے پیشوا کو خراج عقیدت پیش کرنے کی ایک ناتمام کوشش ہے جس کو ملت اسلامیہ نے فخر الاماثل اور حکیم الاسلام کے معزز القاب سے یاد کیا اور جس کی زندگی کا بیشتر حصہ کلمۂ حق کی سربلندی اور دعوت و تبلیغ اور علوم اسلامیہ کی حفاظت و صیانت اور ان کی نشر و اشاعت میں گذرا جس نے ایشیا کی سب سے بڑی دینی یونیورسٹی کی سربراہی کرتے ہوئے اس کو بام عروج تک پہونچایا اور جس کے عہد اہتمام میں اس کی مادی و معنوی ترقی کے راستے کھلے اور عالمگیر پیمانہ پر اس کا تعارف ہوا جس کے سیکڑوں شاگرد اور ہزاروں عقیدت مند دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلے ہیں جس کی دینی و ملی خدمات کا دائرہ پورے عالم اسلام کو محیط ہے جس نے یورپ کے کلیسا میں جاکر اسلام کی اذان دی اور صنم خانوں میں اعلاء کلمۃ اللہ کا فریضہ انجام دیا، جس کی زبان و قلم نے ہزاروں گمراہوں کو جادۂ مستقیم اور راہ اعتدال پر لاکر کھڑا کر دیا جس کی تحریر و تقریر میں جادو کا اثر تھا جس کی زبان و قلم سے پون صدی کے طویل عرصہ تک اسلام کی شرح و ترجمانی کا کام انجام پاتا رہا جس کے قلم سے متنوع مشغولیات کے باوجود سو سے زیادہ کتابیں وجود میں آئیں۔

یہ "تذکرۂ طیب" اظہار عقیدت ہے اس پاک سیرت و پاک طینت کے لئے جس کی زبان و قلم دوسروں کی دل آزاری سے ہمیشہ پاک رہے جس کی مجلس علم و عرفان کی مجلس ہوا کرتی تھی جس میں دین و ملت کے پیچیدہ مسائل کی گتھیاں کھلا کرتی تھیں اس پاکیزہ مجلس میں جن کو حاضری کا شرف حاصل ہوا ہے وہ گواہی دے گا کہ یہ مجلس غیبت اور دوسروں کی برائی سے پاک رہا کرتی تھی اس مجلس میں سراسر خیر ہوتا تھا بیٹھنے والا محسوس کرتا تھا کہ دنیا کی گندگی کا اس مجلس میں گذر نہیں شکوہ اور شکایت کا نام نہیں خالص علمی اور دینی صاف ستھری مجلس۔

یہ "تذکرۂ طیب" اظہار محبت و تعلق ہے دین و ملت کے اس پاسبان کے لئے جس کی زندگی کا ہر نقش دوسروں کا

کیلئے اسوۂ نمونہ بن سکتا ہے۔

یہ "تذکرہ" ادائیگی فرض کی ایک ناکمل سعی ہے اس ذات بابرکت کے لئے جس کی عظمت وبزرگی کا سکہ ہر قلب پر ہے اور جس کی ذات کے احترام اور اس کے فضل وکمال کے اعتراف میں گردنیں جھکی ہوئی ہیں۔

یہ "تذکرہ" حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی ان دینی وملی علمی وادبی خدمات کے اعتراف کی ایک ادھوری کوشش ہے جن کا دائرہ پون صدی کی طویل مدت کو محیط ہے۔

یہ "تذکرہ" اظہار عقیدت ہے اس روح طیب وپاکیزہ کیلئے جو اکابر دار العلوم کے سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی تھی اور جس کی وفات سے ایک پورے عہد کا ورق الٹ گیا۔

ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ حکیم الاسلام علیہ الرحمۃ کی زندگی کا اجمالی نقشہ اس تذکرہ میں آ جائے اور ان کی شخصیت کا تعارف ہو۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ اس تذکرہ میں مکرر باتیں کم سے کم آئیں لیکن مکررات سے پورے طور پر بچنا اس طرح کی اشاعتوں میں ممکن نہیں ہوتا اس وجہ سے بعض باتیں مکرر بھی آئیں ہیں لیکن وہ اپنے ساتھ کچھ نئے فوائد بھی رکھتی ہیں اس لئے ان کا تکرار گراں نہیں گذرے گا۔

ہم نے اس تذکرہ میں شائع ہونے والی تحریرات کو بڑی احتیاط کے ساتھ پڑھا ہے (یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں شائع ہونے والی تحریرات سے ہر ایک کو سو فی صد اتفاق ہوگا (یا خود مرتب کو ہے) لیکن مجموعی اعتبار سے یہ ساری تحریرات قابل قدر ہیں اگر ہم اپنے ذہن کو ذرا وسیع کرلیں اور اس حقیقت کو تسلیم کرلیں کہ ہر شخص کے اندر خوبی کے ساتھ کچھ کمزوری اور کمزوری کے ساتھ کچھ خوبی بھی ہوتی ہے تو مسئلہ آسان ہو جاتا ہے خرابی یہاں سے پیدا ہوتی ہے کہ ہم اعتدال کی راہ چھوڑ کر افراط وتفریط میں پڑ جاتے ہیں کسی کی تعریف میں یا تو ہم اتنا مبالغہ کریں گے کہ وہ انسان نہیں ہے کسی اور جنس کی مخلوق ہے اور اگر تنقید کریں گے تو اس کی واقعی خوبی کا اعتراف کرنے سے بھی ہمیں گریز ہوگا، اللہ کا شکر کہ علماء دیوبند کا طرۂ امتیاز راہ اعتدال ہی رہا ہے اور وہ اندھی عقیدت اور بلاوجہ کی مخالفت کے جذبے سے پاک ہوتے ہیں اور آپ اسی اعتدال کو اس تذکرہ طیب میں دیکھیں گے۔

ہمارے موجودہ اکابر میں سے حضرت مولانا محمد منظور نعمانی ممبر مجلس شوریٰ کی ذات گرامی بڑی محترم اور معتمد رہی ہے وہ دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبر ہیں ہند وپاک کے دینی و علمی حلقہ میں ان کا ایک خاص مقام ہے لوگوں کے دلوں میں ان کی قدر وعزت ہے دار العلوم کے قضیہ نامرضیہ میں انہوں نے حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ان اقدامات کی شدید مخالفت کی جو ان کو دار العلوم کے مصالح کے خلاف نظر آئے لیکن اس سارے اختلاف کے باوجود انہوں نے بھی

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ کی وفات کے بعد اپنے جن تاثرات کا اظہار کیا ہے ان سے کھلکر کے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ ہمارے بزرگوں کا اختلاف قاری صاحب کی ذات سے نہیں تھا بلکہ قاری صاحب کے صرف ان اقدامات کو یہ حضرات ناپسند سمجھتے تھے جنکو یہ حضرات دارالعلوم کے لئے مضر جانتے تھے ان حضرات کے دلوں میں قاری صاحب کی عظمت ومحبت بھی تھی اور ان کے فضل وکمال کا ان کو اعتراف بھی تھا اور دارالعلوم کی قاری صاحب نے جو طویل مدت تک خدمات انجام دی ہیں اور ان کے دور اہتمام میں دارالعلوم کو جو چہار رخی ترقی ہوئی ہے اس کی ان کے دلوں میں قدر بھی تھی چنانچہ خود مولانا منظور نعمانی نے اپنے اس خط میں جس کو انھوں نے حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد مولانا یوسف لدھیانوی اڈیٹر ماہنامہ بینات کراچی کو لکھا ہے اس کا اعتراف کیا ہے ہم ذیل میں اس خط کو ابتدائی چند سطروں کو چھوڑ کر پورا نقل کرتے ہیں اس خط سے اس اختلاف کی نوعیت کا تعین ہوتا ہے اور ہمارے اکابر کے مزاج وطبیعت کا پتہ چلتا ہے اور ہمارے لئے یہ جواز فراہم ہوتا ہے کہ ہم بھی قاری صاحب کی ذاتی خوبیوں اور ان کے فضل وکمال کا اعتراف کریں مولینا منظور نعمانی کا خط پڑھیئے۔

ایڈیٹر ماہنامہ ”بینات“ کراچی کے نام

مولانا محمد منظور نعمانی کا

ایک مکتوب

دارالعلوم دیوبند کے المیہ کے سلسلہ میں حضرت قاری صاحب علیہ الرحمہ کی حیات میں اور ان کے حادثہ وفات کے بعد الفرقان میں جو کچھ لکھا گیا اس کے بارے میں گرامی نامہ سے جناب کی رائے اور تاثر معلوم کر کے بڑا اطمینان ہوا اور دل کی فکر وتشویش میں کمی ہوئی اور اس کی وجہ سے دل میں کچھ عرض کرنے کا داعیہ پیدا ہوا، در نہ ہائی بلڈ پریشر کا مریض ہونے کی وجہ سے اب خطوط بہت مختصر ہی لکھتا یا لکھاتا ہوں۔

مولانا! واقعہ یہ ہے کہ جو مقدر تھا وہ ہو چکا لیکن خاص کر ان کی وفات کے بعد سے دل بہت متاثر ہے۔ اور جب خیال آجاتا ہے تو رنج وافسوس ہوتا ہے اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ مغفرت ورحمت کا خاص معاملہ فرمائے، درجات بلند فرمائے اور اس سلسلہ میں جو غلطیاں ہم سے یا ان سے ہوئیں اپنی شان کرم سے ان کو معاف فرمادے۔ انہ عفو کریم۔

مولانا! ”بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ“ مجھے اپنے ظاہری وباطنی عیوب ومعاصی کا علم ہے

جو ایسے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ رحم کا معاملہ نہ فرمائے تو خیریت نہیں ہے۔

اور قاری صاحب مرحوم و مغفور کے تو میں ان ہی اقدامات کو غلط سمجھتا ہوں جو دارالعلوم کے بارے میں عمر کے بالکل آخری دور میں اُن کی طرف سے ہوئے بالخصوص دارالعلوم کے دستورِ اساسی اور اس کی مجلس شوریٰ کو کالعدم قرار دینے کا اقدام جو دارالعلوم کے حق میں یقیناً انتہائی درجہ کی خطرناک بات تھی، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ چیز ان کی فطرت اور ان کے عمر بھر کے طرزِ عمل کے خلاف تھی کچھ لوگوں نے ان کی فطری انتہائی نرم مزاجی اور کبر سنی کی پیدا کی ہوئی کیفیت سے فائدہ اٹھا کر اس غلط اور ناممکن بات کے لئے ان کو تیار کر لیا، وہ خود تو ایسی بات سوچ نہیں سکتے تھے ـــــ یہی چیز اس اختلاف اور خلفشار کی بنیاد بنی اور ہم سب اس آزمائش میں مبتلا ہوئے۔ نیا بنیاد بین اللہ دل اس پر مطمئن ہے کہ دارالعلوم کو برے انجام سے بچانے کے لئے ہم ارکانِ شوریٰ نے جو کیا وہ صحیح بلکہ ہمارا فرض تھا! تاہم ہم بشر ہیں رائے اور فکر کی غلطی سے ہم میں سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔

بہرحال میں تو ان کے صرف ان ہی اقدامات کو غلط سمجھتا ہوں جو رائے اور فکر کی غلطی بھی ہو سکتی ہے ـــــ لیکن اس کے مقابلہ میں ان کی جن حسنات اور جن کمالات سے واقف ہوں ان کا شمار بھی مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بچپن ہی میں ان کو حفظِ قرآن کی دولت عطا فرمائی وہ زندگی بھر ان کا وظیفہ رہا۔ پھر وہ علمِ دین کی نعمت عظمیٰ سے بھی نوازے گئے آپ نے ان کو دیکھا وہ شرافتِ نفس اور حسنِ اخلاق کا مجسمہ تھے ان کے مواعظِ حسنہ سے ہزاروں بندگانِ خدا کو ہدایت ملی ہوگی، نماز روزے کی اور ذکر و تلاوت اور دوسرے اعمالِ خیر کی توفیق ہوئی ہوگی۔ اس سب کے علاوہ خود اپنی قریباً اسّی سال کی مختلف النوع عبادات اور دینی خدمات و حسنات کا بھی ذخیرہ اپنے ساتھ لیکر اس دنیا سے گئے ہیں جنہیں دارالعلوم کے اہتمام کی قریباً ساٹھ سالہ خدمت بھی ہے ـــــ اور آخرت میں فیصلہ کسی ایک عمل پر نہیں، بندے کے مجموعۂ اعمال پر ہوگا "فمن ثقلت موازینہ فاولٰئک ھم المفلحون" اور "فاما من ثقلت موازینہ فھو فی عیشۃ راضیہ" ظاہر ہے کہ ان کی ان بے شمار حسنات خدمات کے مقابلہ میں دارالعلوم کے سلسلہ کی اس غلطی کی کیا حیثیت ہے پھر اللہ تعالیٰ کا منشور رحمت ہے "ان الحسنات یذھبن السیئات" ان سب کو سامنے رکھ کر قریب بیقین یہ امید ہوتی ہے کہ وہ انشاء اللہ "اولٰئک ھم المفلحون" اور "فھو فی عیشۃ راضیہ" والے زمرے میں ہوں گے۔

اور اس کے برعکس یہ عاجز اپنے کو رزائل اور معاصی کا مجسمہ ہی دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ کا یہ فضل و کرم ہے کہ اپنی اس حالت کا احساس اور اس کی فکر نصیب ہے اور اسی کی طرف سے توبہ و استغفار کی توفیق ملتی رہتی ہے۔ دعائے ماثور "اللھم ان مغفرتک اوسع من ذنوبی ورحمتک ارجیٰ عندی من عملی" کو خاص طور سے اپنے حسبِ حال پاتا ہوں اس لئے غرقِ معاصی ہونے کے باوجود ارحم الراحمین کی رحمت کا امیدوار ہوں اور جناب نے گرامی نامہ میں تحریر فرمایا ہے اس کی بھی امید رکھتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ رب کریم ہم کو ان بندوں میں شامل فرمادے جن کے بارے میں ارشاد ہوا "ونزعنا ما فی صدورھم من غل اخوانا علیٰ سرر متقابلین"....

......دعاؤں کا محتاج و طالب اور دعاگو ہوں۔

والسلام محمد منظور نعمانی

۱۶؍صفر سنہ ۳ھ

اس "تذکرہ طیب" کی یہ اشاعت بھی ہماری طرف سے اسی کا اظہار ہے کہ قاری صاحب علیہ الرحمۃ کی دینی، علمی و ملی خدمات کا اعتراف کرنا ناگزیر ہے، اور فکر و رائے کے اختلاف کی بنیاد پر ان کی خوبیوں اور ان کے کمالات کے اعتراف سے گریز کسی طرح مناسب نہیں۔

محمد ابوبکر غازیپوری

تاثُرات

مولینا منظور صاحب نعمانی

انا للہ و انا الیہ راجعون

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب الی رحمۃ اللہ

الفرقان کے بیرونی ممالک کے ناظرین میں بھی غالباً کوئی نہ ہوگا جس کو قاری صاحب کے حادثہ وفات کی اطلاع نہ ہو چکی ہو۔ اس میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے کہ "کل نفس ذائقۃ الموت" کے اٹل خداوندی قانون کے مطابق اپنے اپنے مقررہ وقت پر ہم سب اسی راستہ سے اسی منزل کی طرف جانے والے ہیں "انا للہ وانا الیہ راجعون" کا بھی مطلب ومدعا اور یہی پیغام ہے اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ کسی وقت بھی اس سے غفلت نہ ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "کفیٰ بالموت واعظاً" (نصیحت کیلئے بس موت (کا خیال ودھیان) بالکل کافی ہے۔

اس عاجز راقم سطور کو قاری صاحب کے حادثہ وفات پر بالخصوص اس احساس سے شدید رنج وصدمہ ہے کہ ایسے وقت ہوا جب کہ دارالعلوم سے متعلق ان معاملات کی وجہ سے جن کا ذکر الفرقان میں آتا رہا ہے ہمارے ذات البین (باہمی تعلقات) میں وہ خوشگواری نہیں رہی تھی جو ابتدائے تعلق وتعارف (تقریباً ۶۰ سال) سے اب تک چلی آ رہی تھی۔ دل میں شدت سے یہ حسرت ابھرتی ہے کہ کاش ہم ان واقعات سے پہلے ہی دنیا سے اٹھا لئے گئے ہوتے۔ یالیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیاً منسیا۔

لیکن ہماری موت وحیات کی طرح ہماری زندگی کے افعال واعمال اور واقعات واحوال بھی ازل سے مقدر ہو چکے ہیں جو ماضی کیلئے مقدر تھا وہ ہو چکا مستقبل کیلئے جو مقدر ہے وہ ہو کے رہے گا "ما قدر اللہ فسوف یکون" خاص دارالعلوم کے ان معاملات میں اپنی طبیعت ومزاج کے خلاف اس عاجز کے ابتلا کی توجیہ اس کے سوا نہیں کی جا سکتی کہ یوں ہی مقدر تھا ورنہ میں تو ان واقعات سے بہت پہلے تقریباً بیس سال پہلے ایک دفعہ مجلس شوریٰ کی رکنیت سے استعفا دے چکا تھا اس وقت میرے اساتذہ بھی حیات تھے انھوں نے بھی حکم فرمایا کہ میں استعفے پر اصرار نہ کروں اور رکنیت کا تعلق قائم رکھوں۔ مجھے ماننا پڑا پھر اس کے بعد بھی کئی بار استعفے کا ارادہ کیا اور اگر اپنی رائے اور دل کے داعیہ پر عمل کر لیتا تو دارالعلوم کے موجودہ نزاعی قضیہ کے سلسلہ میں میرا ذکر بھی نہ آتا مگر میرا ابتلا مقدر ہو چکا تھا، اس لئے ہو کے رہا۔ لا رادّ لما قضا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اذکروا محاسن موتکم وکفوا عن مساویھم اس کی تعمیل کرتے ہوئے یہ عاجز قاری صاحب کے بارے میں اپنے معلومات اور احساسات عرض کرتا ہے۔

اب سے ٹھیک ساٹھ سال پہلے ۱۳۲۳ھ ہی شوال کا مہینہ تھا کہ راقم سطور ایک طالب علم کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا۔ قاری صاحب کو بھی پہلی دفعہ تب سے دیکھا، ان کی عمر اس وقت ۲۷، ۲۸ سال کی تھی۔ ہماری نظروں میں وہ حدیث نبوی کی تعبیر کے مطابق "شاب صالح" (جوان صالح) تھے میں چونکہ تعلیم کے آخری مرحلے کے لئے دارالعلوم گیا تھا اس لئے درس و تعلیم کا تعلق صرف ان اکابر اساتذہ سے رہا جو آخری مرحلے کے اسباق پڑھاتے تھے قاری صاحب سے کوئی خاص تعلق نہیں رہا سوا اس کے کہ وہی اس زمانے میں دارالعلوم کی مسجد میں پانچوں وقت نماز پڑھاتے تھے اللہ تعالیٰ نے جو خوبروئی کے ساتھ خوش آوازی کی نعمت بھی بھرپور عطا فرمائی تھی۔ اور فن قرأت و تجوید میں ایسا کمال حاصل کیا تھا کہ قاری صاحب ان کے اسم گرامی کا جزبن گیا تھا۔ جہری نمازوں میں ان کی قرأت بڑی دلکش ہوتی تھی۔ دارالعلوم دیکھنے کے لئے باہر سے آنے والے جس طرح دارالعلوم کی اس وقت دوسری دل آویز خصوصیات سے متاثر ہوتے تھے اسی طرح قاری صاحب کی نمازوں کی قرأت سے بھی بڑا اچھا اثر لیتے تھے راقم سطور طالب علم کی حیثیت سے دو سال دارالعلوم میں رہا، ان کی اقتدا میں نمازیں پڑھنے کے علاوہ شاذ و نادر ہی خصوصی ملاقات کی نوبت آئی ہوگی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کم آمیزی جو میری فطرت میں ہے اور شاید مرض کی حد تک ہے، وہ دارالعلوم کی طالب علم کے اس دور میں حد سے بڑھی ہوئی تھی۔

اس طالب علمی کا دور ختم ہونے کے بعد اپنی جماعت کے انجمنوں، مدرسوں، کے جلسوں میں شرکت کی نوبت آئی تو اکثر قاری صاحب بھی تشریف فرما ہوتے۔ وہ ہماری جماعت کے علماء میں (جن کو اس عاجز نے دیکھا) حضرت مولینا شبیر احمد عثمانیؒ کو مستثنیٰ کر کے سب سے اچھے مقرر اور واعظ تھے۔ ان کی تقریر بڑی عالمانہ اور حکیمانہ ہوتی مد و جزر اور جوش و خروش بالکل نہ ہوتا سامعین کے لئے بڑی دلکش اور تسکین بخش ہوتی اللہ تعالیٰ نے مشکل مضامین کی تفہیم پر بڑی قدرت فرمائی تھی۔

ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

رجب ۱۳۶۲ھ میں (جس کو اب چالیس سال سے زیادہ ہو چکے) یہ عاجز دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کا رکن منتخب ہوا اس کے بعد شوریٰ اور عاملہ کے جلسوں میں قاری صاحب سے برابر واسطہ رہا تو یہ حقیقت سامنے

آئی کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح انکو ظاہری محاسن میں خوبروئی خوش آوازی اور خوش بیانی سے نوازا ہے اسی طرح باطنی محاسن میں خوش اخلاقی تحمل، رعایت و مروت اور نرم مزاجی بھی بھرپور عطا فرمائی ہیں —— راقم سطور اس موقع پر یہ عرض کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا کہ ان میں رعایت و مروت اور نرم مزاجی حد سے بڑھی ہوئی تھی جو دارالعلوم دیوبند جیسے کسی ادارہ کے منتظم کیلئے مناسب نہیں ہوتی۔ اور اسی وجہ سے ایسا ہوا کہ جب عمر کے اس آخری دور میں قدرتی نظام کے مطابق ان کے جسمانی، ظاہری اعضاء کی طرح معاملہ فہمی اور دقیقہ رسی کی صلاحیت بھی متاثر ہوگئی تھی تو بعض ان ناخداترس مفاد پرست لوگوں نے جنہوں نے ان کا تقرب و اعتماد حاصل کرلیا تھا دارالعلوم کے بارے میں ان کو کچھ ایسے اقدامات پر آمادہ کرلیا جو ان کے عمر بھر کے طرز عمل اور ان کی فطرت کے بھی خلاف تھے۔ راقم سطور ان افسوسناک اقدامات کے بارے میں اپنے ایک مستقل رسالہ میں جس کا عنوان ہے دارالعلوم دیوبند کا قضیہ عوام کی عدالت میں۔ تفصیل سے لکھ چکا ہے (اور یہ رسالہ دارالعلوم کے دفتر اہتمام سے شائع ہوچکا ہے) ان اقدامات نے دارالعلوم اور جماعت دارالعلوم کو شدید فتنہ اور عذاب میں مبتلا کردیا اور خود قاری صاحب کی شخصیت کو اتنا نقصان پہنچایا کہ ان کا کوئی بڑے سے بڑا دشمن بھی نہیں پہنچا سکتا تھا —— راقم سطور نے بارہا مختلف مجلسوں اور صحبتوں میں کہا ہے کہ اس فتنہ میں لوگوں میں سب سے زیادہ مظلوم قاری صاحب کی ذات ہے ان پر ظلم خود ان کے ناعاقبت اندیش دوستوں نے کیا ان سے ایسے اقدامات کرائے جن کی تاویل و توجیہ بھی نہیں کی جاسکتی اور مجلس شوریٰ کو اپنا فرض ادا کرنے اور دارالعلوم) کو برے انجام سے بچانے کے لئے بعض ایسے فیصلے کرنے پڑے جو اس کے ارکان کے لئے ناخوشگوار تھے۔

اب سنا ہے کہ سب سے آخر میں ان لوگوں نے قاری صاحب سے کوئی "وصیت نامہ" بھی لکھوایا ہے اس کا جو مضمون معلوم ہوا ہے اگر واقعی وہی ہے تو یہ ان پر لوگوں کا سب سے بڑا ظلم ہے اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ لوگ قاری صاحب کے نادان دوست ہیں یا دانا دشمن۔

—— اس سارے معاملہ میں ہم سب کیلئے بڑا سبق ہے۔ اللہ ہر طرح کے شر و رفتن سے خاص کر خود نام سو عم کے سنگین فتنہ سے ہماری حفاظت فرمائے۔ اس کی حفاظت کے بغیر ہم میں سے کوئی بھی محفوظ و مامون نہیں۔

بہرحال اب جب کہ قاری صاحب ہماری اس دنیا میں نہیں رہے اور ہم بھی یقیناً وہیں جانے والے ہیں جہاں وہ پہنچ چکے ہیں تو اب بس یہی عرض کرنا ہے۔ انتم لنا سلف ونحن علی اثرکم خلف، یغفر اللہ لنا ولکم وجمعنا وایاکم فی دار السلام

محمد منظور نعمانی

۱۲ر شوال ۱۴۰۳ھ

تعمیر حیات لکھنؤ

مولانا قاری محمد طیب صاحب کی وفات پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا تعزیتی بیان

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب ایک عرصہ سے علیل تھے، ان کی عمر ۸۰ سال سے متجاوز ہو چکی تھی، زندگی کے آخری صدمات نے ان کو اور بھی ضعیف و مضمحل اور چراغ سحری بنا دیا تھا، اس لئے اس حادثہ کا دھڑکا لگا ہوا تھا جو ۶ شوال کو ان کی وفات کی شکل میں پیش آیا۔ اگرچہ یہ حادثہ غیر متوقع اور خلاف قیاس نہ تھا۔ لیکن ان کی شخصیت، فضائل و کمالات اور طویل و وسیع دینی خدمات پھر قریبی تعلق و واقفیت کی بنا پر "قومی آواز" میں اچانک اس خبر کو پڑھ کر دل کو دھکا لگا اور ایسا معلوم ہوا کہ یہ واقعہ اچانک اور خلاف توقع پیش آیا، واقعہ یہ ہے کہ شاید کم سے کم ہندوستان میں کسی علمی و دینی شخصیت کو کم ایسی ہر دل عزیزی، عام شہرت و مقبولیت اور مختلف دینی اداروں اور جماعتوں کا اعتماد حاصل ہوا ہوگا (معدودے چند افراد کو مستثنیٰ کر کے) اور اس کو اتنے طویل عرصہ تک دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم و جلیل بین الاقوامی شہرت کے ادارہ کی خدمت و ترقی کا موقع ملا ہوگا جیسا قاری صاحب کو ملا، ان کی اس عام مقبولیت و جامعیت اور ان کی ذات کے اختلافات سے بہت حد تک بالاتر ہونے کا نتیجہ تھا کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کے روز اول سے جو ہندوستان کے مختلف الخیال گروہوں، دینی جماعتوں و اداروں کا نمائندہ ہے ان کی وفات کے دن تک ان سے زیادہ موزوں اور متفق علیہ صدر نظر نہیں آیا اور وہ اس عہدہ پر باتفاق آراء شروع سے آخر تک رہے، ان کو بانی دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے نسبت گرامی کا شرف حاصل تھا اور وہ نصف صدی تک مسلسل اس موقر اور عظیم ادارہ کے منصب اہتمام پر فائز رہے اور ان کے دور اہتمام میں اس ادارہ نے ایسی ترقی کی جو اس کے ابتدائی دور کے دیکھنے والوں کے خواب و خیال میں نہ تھی انہوں نے بڑے بحرانی موقعوں پر اس ادارہ کی حفاظت اور رہنمائی کی۔ انہیں کے عہد میں اور ان کے زیر اہتمام ۸۰ء میں ایک عظیم صد سالہ جشن منعقد ہوا جو اس کی شہرت و مقبولیت کا نقطۂ ارتقاء تھا انہوں نے اپنا نام اور زندگی اس ادارہ کے نام اور اس کی زندگی سے ایسی وابستہ کر دی تھی کہ ان میں سے ایک کا تصور دوسرے کے ساتھ آتا تھا کاش کہ وہ اس سے علاحدگی کا داغ اٹھائے بغیر اس دنیا سے رخصت ہوتے اور ان کے اور دارالعلوم کے درمیان کوئی حجاب حائل نہ ہوتا اس لئے بعض نیازمندوں نے پوری جد و جہد کی اور اس کی کوشش کی کہ وہ اسی اعزاز و اعتماد اور تعاون کے ساتھ زندگی کی بقیہ مہلت گزار دیں لیکن افسوس ہے کہ ان کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی اور ان کو اپنی زندگی کے آخری مرحلہ میں اس عظیم روحانی صدمہ اور جگر خراش احساس

سے دوچار ہونا پڑا اور زندگی کے آخری دن اس ادارہ کی ذمہ داری سے الگ ہو کر گذارنے پڑے جو ان کے دادا کے لگایا ہوا باغ اور ان کے اپنے خون پسینہ سے سینچا ہوا چمن ان کی عزت کا نشان اور ان کی تسکین قلب کا سامان تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجے بلند فرمائے ان کی دینی و علمی خدمات کا شایان شان صلہ عطا فرمائے اور دارالعلوم دیوبند اور خود ملت اسلامیہ ہندیہ کو ان فتنوں سے بچائے جو ایک مخلص اور معتمد علیہ ہستی، بزرگوں کے جانشین اور روشن ضمیر عالم کے اٹھ جانے سے پیدا ہوتے ہیں۔ قاری صاحب مدت دراز سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے بھی ایک معتمد رکن تھے اور اس کے کارکن اور ذمہ دار ان کا بزرگوں کی طرح احترام کرتے تھے۔ میں اپنی طرف سے بھی اور ندوۃ العلماء کی طرف سے نیز ہندوستان کی ملت اسلامیہ کی طرف سے ان کے خاندان اور ان کے معتقدین و منتسبین، فضلائے دارالعلوم دیوبند، اساتذہ و طلبہ و ارکان شوریٰ کی خدمت میں تعزیت پیش کرتا ہوں۔ غفر اللہ لہ و رفع درجاتہ۔

رائے بریلی
۷ر شوال المکرم ۱۴۰۳ھ / ۱۸ر جولائی ۱۹۸۳ء

(مولانا) ابوالحسن علی ندوی
(ناظم ندوۃ العلماء)

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی وفات پر
صاحبزادگانِ حکیم الاسلام کے نام
ایک بصیرت افروز مکتوبِ تعزیت

مولانا حکیم
عبدالرشید محمود گنگوہی نبیرۂ
حضرت اقدس گنگوہیؒ

مکرما سلیل الکرام ابررہ مولانا محمد سالم، اسلم، اعظم سلمہم اللہ!

مولانا طیب صاحبؒ رہ گذار آخرت ہو گئے۔ ہونا ہی تھا، کوئی نئی بات ہے نہ غیر متوقع حادثہ "وما جعلنا لبشر من قبلک الخلد"۔ مگر دلوں کی دنیا اور یادوں کی بستی سے ان کا نقش جمیل مٹ جانا ممکن نہیں، وہ باقیات صالحات سے بھی تھے اور جعلها كلمة باقية فی عقبه ان کی زندگی اور زبان بھی تھی۔ ان کی شیریں زبانی، شگفتہ بیانی، صورت نورانی، ہوشمندیِ فکر، ارجمندیِ ذہن اور دردمندیِ دل کو کون بھلا سکتا ہے۔ دوائر علیہ ان کی جامعیت، علوم و افکار کا تنوع و تبحر، ادبی ذوق، خوبیِ تعبیر، حسین و بلیغ ترجمانی، مجامع میں خطاب گویا فلک الٰہی سے "اذا تکلم یخیل الینا انہ یتلو" کا سا کیف، حکمت ربانیہ، ولی اللّٰہی بھی، ابن جوزی کی سی سحر انگیزی بھی۔ یہ کس صاحب ذوق و جوہر شناس کو رہ رہ کر یاد نہ آئیگی۔

اب وہ کوہ کن کی بات گئی کوہ کن کے ساتھ

"عجزت النساء ان یلدن مثل طیب"، کس کس نادرہ اور غلیو پر تعجب کریں زبان ایسی کہ سب سمجھیں، بیان ایسا کہ دل مانے، عقل کی پاسبانی بھی، لیکن "کہیں کہیں" اسے تنہا چھوڑ دیئے کے سے افکار و افکار بھی ___ دلائل عقلی بھی، نقلی بھی، جدلی عدلی بھی، انفسی آفاقی بھی، اور حقائق و معرفت آگیں بھی، میں نے مجلس سے اٹھتے ہوئے اکثر لوگوں سے سنا کہ عالم کیا ہے ایک دریا ہے، عجیب نابغہ آخر وہ وقت آگیا عشیة نبل طیب لیس منا ان ہی کا شعر ہے

خوگر عیش و طرب اب آہ اپنا دل نہیں
دور ہو اے شادمانی تو مرے قابل نہیں

یہ بھی ان کا فرمودہ ہے۔

جلوہ گر نور بقا میں صورت سیماب ہے
اے تماشا گاہِ عالم بس تجھے آداب ہے

بے شمار محاسن و مکارم اور مناقب و محامد کے ساتھ ان کی طبع لطیف، حلم و رفق سے معمور سیرت، معاملات و معاشرت میں ستھرا بے عیب موزوں و متوازن کیرکٹر، جدال و مراء سے متنفر، غیر متصادم مزاج،

دکھائی میں وڈنا نہیں چاہتا اڑنا میری افتاد نہیں) اہم امور و حوادث میں ان کی ایسی روداد اری کہ بعض اشخاص کو تدامن و تہاون کا شبہ ہو جائے مگر سچ پوچھئے تو وہ مسامحت نہ مداہنت یہ الطاف خداوندی اس جراحت پر شانی تھے۔ اب کون ہے جو اس کا دعویٰ کر سکے ہاں مگر بشری اتسام کا انفکاک بھی ممکن نہیں۔ ممکن کبھی اس سے مامون نہیں ہو سکتا۔

اخیر کے چند سال جس ضیق، غیر حق میں مشغولی، خلجان اور ذہنی انتشار کے گذرے بجز اس کے کیا کہا جائے کہ کان امر اللہ قدراً مقدوراً واللہ تعالیٰ ان کو کفارۂ سیئات بنا دے یہ ابتلاء عام ہے عوام اور علماء حسب حالات سب ہی ان میں مبتلا ہیں، بقول مولانا سید سلیمان ندوی مسلمانوں سے اجتماعی کام کی صلاحیت اٹھتی جا رہی ہے۔ اور تعاون مزاج برہم ہو رہا ہے کون تبریہ کر سکتا ہے۔ الانبیاء اشد بلاء ثم الامثل فالامثل مگر اس شخصیت کے خد و خال و جمال محبوبی میں ان کا محسوس ہونا ناگزیر تھا پھر ہوا جو کچھ ہوا اور کہا گیا جو نہ کہنا تھا۔ حق بھی ناحق بھی۔ حدود کے اندر بھی متجاوز بھی، اخلاص سے حق کہا گیا تو کہنے والا ماجور، ناحق اور حدود سے متجاوز کہا گیا تو اس کی شکایت ہی کیا ہے

مانجی اللہ والرسول معا
من لسان الوری فکیف انا

اب تعزیۃً آپ متعلقین پسماندگان سے وہی کہتا ہوں جو ایک بدوی نے حضرت عبداللہ ابن عباس کی وفات پر کہا تھا۔

خیر من العباس اجرک بعدہٗ
واللہ خیر منک للعباس

(آپ کو عباس سے بہتر ان کی وفات کا اجر مل گیا اور عباس کو آپ سے بہتر اللہ اور لقاء رب ہو گیا) زیادہ موجب تاسف و تالم یہ مضمون ہے: اذا مات العالم ثلمت ثلمۃ فی الاسلام لا یسدھا الا عالم ودنا ایسے تو

نزلنا ساعۃ ثم ارتحلنا
کذا الدنیا رحال فارتحلنا

قانون ہے ہی، اب عالم آخر کہاں، کب؟ اللہ جانے! البتہ اس دعا کی ضرورت ہے

قرب الرحال الی دیار الآخرۃ
فاجعل الٰہی خیر عمری آخرہ

اخیر میں ایک بات اور کہنے کو دل چاہتا ہے آپ حضرات اگر محسوس نہ کریں اور حق دیں بہر کیف مجھے نصیحت کی عزت حاصل ہے اس لئے کہ میں عالی سن ہوں، سن و سال کا تفاوت بالکل غیر معتبر ہی نہیں کہ اس حدیث کو سامنے رکھیں انا امنۃ لاصحابی فاذا ذھبت اتی اصحابی ما یوعدون واصحابی امنۃ لامتی فاذا ذھبت اصحابی اتی امتی ما یوعدون بڑوں کا اٹھنا حرمان تو ہے پیش آنے والے خطرات کا اعلام بھی ہے۔ اب تک جانے کتنے فتنے رکے ہوئے ہوں گے

طبیعت کا ایک ضروری حصہ تھا۔ ان کی وضعداری اور بزرگانہ شفقت کے کئی واقعات خود میرے ساتھ ایسے گذرے ہیں کہ ان کا تاثر ابھی تک قلب و دماغ پر قائم و باقی ہے۔ اس کی تفصیل میں جائے بغیر میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ میں اپنے کو حکیم الاسلام کی عقیدت مندی کے دائرہ میں شامل کرنا اپنے لئے باعث سعادت سمجھتا ہوں اس میں کوئی شک نہیں کہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارتحال صرف دار العلوم دیوبند اس کے منتسبین یا صرف ہندوستان ہی کے لئے حزینہ نہیں ہے بلکہ یہ پورے عالم اسلام کا نقصان ہے۔

سید احمد ہاشمی

۲۴ر جنوری ۱۹۸۴ء

مولانا قاضی سجاد حسین صاحب

مکرمی زید لطفہ،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

گرامی نامہ پہنچا۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ پر کچھ لکھنے کے لئے تو کافی وقت درکار ہے جس کا سردست موقعہ نکالنا مشکل ہے بہرحال معروض ہے حضرت موصوف سے مجھے بچپن سے نیاز حاصل تھا۔ میری عمر تقریباً دس، گیارہ برس کی ہوگی اور میں اپنے وطن کرت پور ضلع بجنور میں مدرسہ عربیہ میں زیرِ تعلیم تھا۔ اس وقت میرے والد مرحوم قاضی شمشاد حسین مرحوم ہی اس مدرسہ کے مہتمم تھے۔ ان کے سالانہ جلسہ میں حضرت مولانا انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں حضرت مولانا موصوف کی آمد کرت پور ہوئی تھی۔ مولانا کا عنفوانِ شباب تھا اور موصوف کو فارغ التحصیل ہوئے کچھ ہی عرصہ گذرا تھا۔ موصوف کے وعظ شہرت کی ابتدا تھی جلسہ میں تقریروں کے بارے میں منتظمین نے یہ طے کیا تھا کہ ابتداءً موصوف کا وعظ ہو تاکہ مجمع جم جائے پھر آخر میں حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ کچھ فرمادیں۔ لیکن جلسہ کی ابتدائی کارروائی کے بعد جیسے ہی وعظوں کی نوبت آئی حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا پہلے میں کچھ کہہ لوں۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی عالمانہ تقریر تھی جو عوام کے پلے زیادہ نہ پڑی۔ اس کے بعد حضرت موصوف کا وعظ شروع ہوا جو ایک دو گھنٹے جاری رہا اور مجمع نہایت سکون اور خاموشی سے وعظ میں محو رہا۔ یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ موصوف کے حسنِ صورت، شائستگی، لباس اور حسنِ وعظ سے میں بھی متاثر ہوا۔ اس دن سے موصوف سے ایک قلبی تعلق پیدا ہو جو بحمد اللہ آج تک باقی ہے۔ اس کے بعد مجھے مدرسہ دارالعلوم دیوبند میں داخلہ کی سعادت میسر ہوئی اور میں موصوف کے قریب تر ہوگیا یہ وہ وقت تھا کہ موصوف نائب مہتمم بنائے جاچکے تھے۔ مولانا حبیب الرحمن عثمانی مہتمم اور موصوف کے والدؒ حافظ محمد احمد صاحب صدر مہتمم تھے۔ موصوف نے کچھ درس دینا بھی شروع کردیا تھا اور ملک میں ان کے وعظ کی شہرت ہوجانے کی وجہ سے اکثر جلسوں میں بھی بلائے جانے لگے تھے۔ ایک وہ وقت آیا کہ میں نے دارالعلوم دیوبند کے نصابِ تعلیم کرنے کے ساتھ ساتھ مولوی، عالم الہ آبادکی تیاری شروع کی تو مجھے اس کی ضرورت یہ محسوس ہوئی کہ خارج وقت میں کسی استاد سے بیضاوی شریف کا درس حاصل کروں۔ میں نے تعلق اور قرب کی بنیاد پر موصوف سے عرض کیا اور موصوف نے خنداں پیشانی کے ساتھ میری درخواست قبول فرمالی۔ اس طریقہ پر مجھے موصوف کی شاگردی کا بھی شرف حاصل ہوا۔ میں نے موصوف کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ موصوف کو اللہ تعالیٰ نے اتنی خوبیوں سے نوازا تھا کہ بمشکل کسی ایک عالم میں اتنی خوبیاں جمع ہوتی ہیں۔ فنِ قرات اور خوش الحانی میں موصوف بے نظیر تھے۔ جس وقت مجمع میں تلاوتِ کلام پاک فرمادیتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ نور اور رحمتوں کی بارش ہو رہی ہے۔ جب دارالعلوم کی مسجد میں کسی جہری نماز کی امامت فرمادیتے تھے تو مقتدی محو ہو جاتے۔ وعظ اور تقریر میں اللہ تعالیٰ نے موصوف کو وہ کمال عطا فرمایا تھا کہ

عملی کمال یہ تھا کہ کارکردگی کی صلاحیت غیر معمولی تھی۔ جس کام کو کرتے تھے پوری توجہ اور یکسوئی سے کرتے تھے ہم نے بارہا دیکھا ہے ایک مجمع میں بیٹھے ہیں لوگ بات چیت میں مصروف ہیں اور آپ ایک گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے اور کاتبوں کی طرح بیٹھے کوئی مضمون مسلسل لکھے جا رہے ہیں۔ خالی بیٹھنا تو جانتے ہی نہ تھے ہر وقت کام سے کام تھا اخلاقی اعتبار سے وہ اس شعر کے مصداق تھے

هینون لینون ایسار ذو وکرم سواس مکرمۃ ابناء ایسار

خندہ جبین و شگفتہ، نرم دم گفتگو اور نرم خو، حلیم و بردبار، متواضع و منکسر المزاج، پھر ظاہری حسن و وجاہت بھی ایسی کہ ہزاروں میں ایک نظر آتے تھے۔ حسن قراءت کا یہ عالم تھا کہ وجد آفریں و کیف آور، غرض کہ یہ کمالات گوناگوں تھے جنہوں نے مولینا کی شخصیت کو برصغیر کے علماء میں بہت نمایاں اور ممتاز کر دیا تھا اور آپ بیچ مچ سر خیل طائفہ بن گئے تھے۔ اللہ کے فضل و کرم سے عمر کافی طویل پائی اس لیے جس طرح آپ کے اہتمام کی مدت دار العلوم کے سابق مہتموں کی مدت اہتمام سے زیادہ ہے، اسی طرح مدرسہ میں توسیع و ترقی آپ کے عہد میں ہوئی کسی کے عہد میں نہیں ہوئی۔ آپ کی فیض رسانی کا دائرہ برصغیر تک محدود نہیں رہا بلکہ ایشیا اور افریقہ کے دور دراز خطوں کے علاوہ امریکہ اور یورپ پر محیط ہو گیا۔ اسلئے آپ کا حادثہ وفات عالم اسلام کا وہ عظیم دوسرا المیہ ہے جو حضرت شیخ الحدیث مولینا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد پیش آیا ہے۔ آپ کے سانحۂ ارتحال سے دار العلوم دیوبند کا ایک دور اور ایک عہد ختم ہو گیا۔

مولینا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی اور حضرت قاری صاحب دونوں ہم جماعت اور ہم درس ہونے کے علاوہ وہ بھی صاحبزادہ اور یہ بھی صاحبزادہ، اسلئے ہم مرتبہ ہم مقام بھی تھے۔ اسلئے دونوں میں بڑی دوستی اور بڑی بے تکلفی تھی، لیکن میں ایک جونیر طالب علم تھا۔ اسلئے حضرت مرحوم سے کوئی سابقہ نہ تھا۔ البتہ انکے برادر خورد مولوی محمد طاہر مرحوم بڑے بامذاق، خوش مزاج و یار باش انسان تھے ان سے بڑی دوستی اور بے تکلفی تھی میں انکے گھر جاتا اور وہ میرے کمرہ میں آتے اور ہم دونوں گھنٹوں گپ کرتے رہتے تھے۔ البتہ ۱۹۶۲ء میں مجلس شوریٰ کا ممبر منتخب ہوا تو اب حضرت مرحوم سے بھی ذاتی تعلقات پیدا ہو گئے جو محض رسمی اور واجبی نہ تھے بلکہ حقیقی اور قلبی و روحانی تھے اب ان سے صرف ادب و احترام کا تعلق نہ تھا بلکہ محبت اور تعلق خاطر بھی تھا۔ محبت کبھی یک طرفہ نہیں ہوتی بلکہ منعکس ہوتی ہے چنانچہ ادھر بھی ایسا ہی تھا اسکا پلیۓ ثبوت یہ ہے کہ حضرت کا ذوق شعر و ادب بھی بڑا پاکیزہ تھا اور خود بھی قادر الکلام شاعر تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے ایک قصیدہ کے ایسے چند اشعار خود اپنے قلم سے لکھ کر مجھ کو عنایت فرمائے جنمیں ازراہ شفقت بزرگانہ اس ہیچمیرز کی نسبت ایسے خیالات کا اظہار کیا گیا تھا جنکو پڑھ کر میں پسینے پسینے پانی پانی ہو گیا۔ میں نے یہ تحریر تبرک سمجھکر حفاظت سے رکھ لی، ایک مرتبہ خیال ہوا کہ تحدیث نعمت کے طور پر ان اشعار کو برہان میں چھاپ دوں لیکن خودستائی کے ڈر سے جہاں میں برہان کی ڈاک کے اس قسم کے روزانہ دو تین خط نہیں چھاپتا۔ ان اشعار کو بھی صرف اپنے تک محدود رکھا۔ آج یہ شفقت و محبت اور التفات خاص و مراعات یاد آتے ہیں تو دل بے چین ہو جاتا ہے اور تڑپ اٹھتا ہے اور یہ حادثہ ملی و قومی ہی نہیں بلکہ ذاتی اور شخصی بھی ہو جاتا ہے۔ مگر بہر حال بقول غالب

صبر کرتے ہی بنے گی غالب واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

مولانا سید احمد ہاشمی (ایم پی) کا مکتوب گرامی

عزیز گرامی مولینا ابو بکر صاحب زیدت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

حکیم الاسلامؒ نمبر کی تیاری کے سلسلہ میں آپ کا مکتوب گرامی موصول ہوا۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے اور اسے تکمیل کے مرحلہ تک پہونچائے۔ حکیم الاسلامؒ سے میں کبھی اتنا قریب نہیں رہا کہ ان کی زندگی کے شب و روز یا ان کی عظمت بزرگی، کمال علم و حکمت، حکیمانہ بصیرت اور خوش کلامی و خوش اسلوبی پر میرا تاثر دقیع ہوا۔

دارالعلوم دیوبند میں میری طالبعلمی کا زمانہ غالباً ۱۹۵۵ء کا ہے۔ میں نے مدرسہ عالیہ کلکتہ سے ممتاز المحدثین کی سند حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند کا صرف اس لئے عزم کیا تھا کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ سے تلمذ کا شرف و انتساب حاصل کرسکوں۔ چنانچہ میرا زمانہ قیام صرف ایک سال کا بہت ہی مختصر سا عرصہ رہا۔ اس دور میں حکیم الاسلامؒ حضرت مولینا قاری محمد طیب صاحبؒ بعد نماز فجر حجۃ اللہ البالغہ کا مسجد میں ذہین و شوقین طلبہ کو درس دیا کرتے تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس اہم اور نادر تصنیف سے حکیم الاسلامؒ کو خاص مناسبت تھی۔ اسی لئے باوجود اس کے کہ درسیات کی دوسری کتابیں حکیم الاسلامؒ سے متعلق نہیں تھیں (اور کار اہتمام کے رہتے ہوئے یہ ممکن بھی نہیں تھا) لیکن حجۃ اللہ البالغۃ کیلئے فجر بعد کا وقت اہتمام سے اس کے درس کے لئے فارغ کرلیا تھا۔ اور بہت ہی دلچسپی اور ذوق کے ساتھ پابندی سے اسے پڑھاتے تھے شریک درس طلباء سے حکیم الاسلامؒ کی حکیمانہ بصیرت کے تذکرہ سے اکثر شوق ہوا کہ میں بھی حجۃ اللہ البالغہ کے درس میں شریک ہوسکوں، مگر دورہ حدیث کے طالب علم کیلئے خصوصاً شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے درس بخاری شریف کے نظام الاوقات کی بنا پر یہ ممکن نہیں ہوسکتا تھا۔ کیوں کہ بخاری شریف کا درس حضرت شیخ الاسلام بعد فجر ہی سے شروع فرماتے تھے۔

لیکن دارالعلوم دیوبند سے واپسی کے بعد مختلف مجالس میں گفتگو اور بعض ملی مسائل پر تبادلۂ خیال کی ضرور سعادت حاصل ہوئی ہے۔ اور بہت سی دینی مجالس، مدارس اور جمعیۃ علماء کے اجلاسوں میں حضرت موصوف کے بلیغ خطاب سے مستفیض ہونے کا موقعہ بھی ملا ہے۔

حضرت قاری صاحب کے مزاج کی نفاست میں نرم گفتاری، سبک گوئی اور ان کی شیوہ بیانی ہی تنہا انکی شخصیت کا حسن امتیاز نہیں تھی۔ اپنے چھوٹوں کو نوازنا اور اپنے سے اختلاف رائے رکھتے ہوئے اختلاف کرنے والوں سے شریفانہ شفقت و مودت، اور تعلق خاطر کا اظہار کرنا بھی ان کی سرشت اور سادگی پسند

باسمہ تعالیٰ

مولانا سعید احمد اکبرآبادی

وا دریغا وہ دومان قاسمی کا لعل شب چراغ گم ہوگیا۔ چمن زار دارالعلوم دیوبند کا گل سرسبد مرگ کی بادِ صرصر سے نذرِ خزاں ہوگیا۔ بزم علم و عرفان کی شمع فروزاں بجھ گئی، حسن بیان و خطابت کے ایوان میں زلزلہ آگیا، مسند وعظ و مصطبۂ ارشاد و ہدایت بے رونق ہو گئے یعنی ۱۷ر جولائی ۸۳ء کو حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کم و بیش ۸۸ برس کی عمر میں عالم آب و گل کو خیرآباد کہہ کر عالم آخرت کی طرف منتقل ہو گئے "اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن" شب میں عشاء کی نماز کے بعد ہزاروں ماتم گساروں کے مجمع میں نماز جنازہ دارالعلوم کے احاطہ مولسری میں ادا کی گئی۔ اور پھر تدفین جد امجد نوراللہ مرقدہٗ کے پہلو میں ہوئی۔ اس طرح گویا۔

پہنچی وہیں پہ خاک کہ جس کا خمیر تھی۔ کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ وَّیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ۔

حضرت مرحوم جب پیدا ہوئے یہ دارالعلوم دیوبند کے اوج شباب کا زمانہ تھا۔ اساتذۂ کرام اپنے اپنے فن میں یگانۂ روزگار تھے جن کے علم و فضل اور مہارت فن کا آوازہ ممالک غیر میں بھی دور دور تک پہنچا ہوا تھا۔ پھر اس دور کی ایک بڑی اور اہم خصوصیت یہ تھی کہ اصحاب درس و تدریس خود بھی روحانی اور باطنی کمالات کے حامل اور جامع ہوتے تھے۔ اور ان کے علاوہ تھانہ بھون سہارنپور اور دیوبند میں مستقل طور پر طریقت و معرفت کی درسگاہیں قائم تھیں۔ اور دارالعلوم جس کا نام تھا وہ درحقیقت انہیں دونوں قسم کے علوم و فنون کی تعلیم و تربیت گاہ تھا۔ غرض کہ ایک طرف یہ سرچشمہائے فیض تھے جو پوری آب و تاب کے ساتھ رواں دواں تھے اور دوسری جانب حضرت مرحوم خانوادۂ قاسمی کے چشم و چراغ ہونے کے باعث ہر ایک کے نورِ نظر اور لخت جگر تھے۔ اور خود بھی ذاتی طور پر نہایت ذہین اور طباع، روشن ضمیر و نکتہ رس تھے اور طالب علم کا جوہر فطری رکھتے تھے۔ پھر کس بات کی کمی۔ جوان ہوئے تو حافظ قرآن اور قاری خوش الحان ہونے کے ساتھ ایک پختہ استعداد کے بالغ النظر عالم ہو گئے۔

اس زمانہ میں دارالعلوم کے مہتمم اگرچہ حضرت مرحوم کے والد ماجد حافظ محمد احمد صاحب مرحوم تھے۔ لیکن اہتمام کا سارا کام نائب مہتمم مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کرتے تھے جو عربی زبان کے ادیب اور بلند پایہ شاعر ہونے کے علاوہ حد درجہ ذہین، معاملہ فہم اور اعلیٰ درجہ کے مدبر اور منتظم تھے۔ سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ بلا کے مردم شناس اور مردم آفریں تھے۔ وہ مدرسہ کے ہونہار طلباء پر کڑی نگاہ رکھتے تھے چنانچہ

اس قسم کے طلباء میں سے جب کوئی فارغ التحصیل ہوتا اس کو روک لیتے اور اس کے ذوق اور استعداد کے مطابق مدرسہ کی کوئی خدمت اس کے سپرد کر دیتے تھے۔ اسی قسم کے فارغ التحصیل طلباء کے لئے انھوں نے مدرسہ میں معین المدرسین کا ایک شعبہ قائم کر رکھا تھا۔ حق یہ ہے کہ اپنے اس جوہر مردم شناسی و مردم آفرینی کے زیر سایہ مولینا حبیب الرحمٰن عثمانی نے نامور اساتذہ علم و فن، مقرر اور خطیب، مناظر اور واعظ، مفتی مصنف، صحافی، شاعر اور ادیب اس کثرت سے پیدا کئے کہ انہوں نے ملک میں پھیل کر ہر شعبۂ زندگی میں اپنا اثر و نفوذ قائم کیا۔

ظاہر ہے۔ مولینا کی نگہ دور اس سے معدن قاسمی کا یہ گوہر تاباں کیوں کر مخفی رہ سکتا تھا۔ آپ نے موصوف کو اپنی تربیت خاص کی آغوش میں لیکر اس طرح تربیت کی کہ موصوف کی فطرت و طبیعت کا ایک ایک جوہر قابل نشو و نما پانے اور پروان چڑھنے لگا۔ چنانچہ آپ درس تو دیتے ہی تھے حسن بیان و خطابت کی خلقی استعداد اور صلاحیت کے باعث جلسوں میں تقریر کی غرض سے ادھر ادھر بھی بھیجے جانے لگے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ گلبن دار العلوم کے اس نہال نو کا آئندہ کیریر ( ) کیا ہو؟ موصوف میں اہتمام و انتظام کی صلاحیت بہت اچھی تھی علاوہ ازیں ان اوصاف و کمالات سے بھی متصف تھے جو مدرسہ کی ترقی و توسیع میں ممد و معاون ہو سکتی تھیں۔ ان امور کے پیش نظر مولینا حبیب الرحمٰن عثمانی نے فیصلہ کیا کہ انہیں آئندہ مدرسہ کا مہتمم ہونا ہے چنانچہ آپ نے ان کو اپنا معین و مددگار یعنی نائب مہتمم مقرر کر لیا۔

یہ ذکر اس زمانہ کا ہے جبکہ راقم الحروف دار العلوم دیوبند کا طالب علم تھا۔ اس کے بعد مولینا حبیب الرحمٰن عثمانی کا انتقال ہو گیا تو مولینا قاری محمد طیب صاحب مہتمم بنا دیئے گئے۔ اگرچہ آپ کی شہرت اور ملک میں مقبولیت کا آغاز نیابت اہتمام ہی کے زمانہ میں ہو گیا تھا۔ لیکن مہتمم ہونے کے بعد وقت آیا کہ آپ کے اوصاف و کمالات پورے طور پر ابھریں اور جلا پائیں یہ کمالات تین قسم کے تھے علمی، عملی اور اخلاقی، اول الذکر کمال تو یہ تھا کہ علوم و فنون میں پختہ استعداد کے ساتھ ایک طرف حضرت مولینا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات و تالیفات پر گہری نظر رکھتے تھے اور حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کا تعلق رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ان دونوں نابغۂ روزگار بزرگوں کے علوم و فنون پر حاوی ہو اس کو شریعت و طریقت کا رمز شناس و نکتہ داں بننے کیلئے اور کیا درکار ہے پھر اس پر حسن تقریر و خطابت کا ملکہ خداداد سونے پر سہاگہ! گھنٹوں بولتے تھے، زبان بڑی شگفتہ اور شائستہ، کہیں کہیں ظرافت اور مزاج کے چھینٹے، آواز از اول تا آخر یکساں، نہ زیر و بم نہ تار چڑھاؤ، مگر ساتھ ہی منطقی استدلال اور فلسفیانہ تشقیق، اس لئے تقریر عوام و خواص دونوں کے کام کی، بات سے بات اور نکتہ در نکتہ، پھر معلومات کی کثرت اور طبیعت کی روانی کا یہ عالم کہ کیا مجال، ایک تقریر کا مضمون دوسری تقریر میں مکرر آجائے، میرے نزدیک یہ سب کچھ فیضان حضرت نانوتویؒ اور حضرت تھانویؒ کا تھا۔

انابت اور استعاذہ کی ضرورت ہے۔

یہ خط ختم ہو چکا تھا کہ لکھنؤ کے کچھ حضرات اور ایک قاری اسلم نامی تشریف لے آئے دفعۃً نصف صدی سے کچھ زیادہ قبل کا واقعہ ذہنی اسکرین پر ابھر آیا میرے حضرت والد صاحب[1] رحمۃ اللہ علیہ علیل ہو کر شفایاب ہوئے تھے۔ دیوبند سے ایک بڑا مجمع حضرت مولانا حافظ احمد صاحبؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ، مولانا اعزاز علی رحمۃ اللہ علیہ، علامہ ابراہیمؒ، حضرت میاں صاحبؒ وغیرہ مزاج پرسی کو تشریف لائے، مولانا طیبؒ صاحب نوجوان قریباً پچیس سال بھی ساتھ تھے۔ بعد مغرب کا وقت تھا حضرت والد صاحب نے فرمایا طیب ایک رکوع سناؤ یاد ہے ولقد خلقنا الانسان ونعلم ما توسوس بہ نفسہ الخ سنایا سماں بندھ گیا۔ آنکھیں پرنم ہو گئیں، میرے کانوں نے یہ خوش لحنی عمر میں پہلی مرتبہ سنی تھی، ساز بھی، سوز بھی، دل گداز بھی، نغمہائے دلکش سحاب اندر سحاب بھی ——— یہ پہلا نقش تھا جو آج بھی تازہ ہے اس کے بعد دیوبند پہونچکر تو بارہا سنی۔ جہری نمازوں میں بھی اکثر جب وہ ہوتے تو امامت وہی کرتے ایسے بھی وقتاً فوقتاً ——— پھر یہ کیفیت ہو گئی کہ جس کا لحن طیبی سے کچھ مشابہ ہوتا، میں تاثر لیتا اب برسوں سے اس کی نوبت نہیں آئی تھی کہ کچھ سنتا، مولانا کہولت سے گذر کر شیخوخت کی منزل میں آگئے تھے، لحنیت اور گلے کے گھنگرا اپنا زیر و بم ختم کر چکے تھے۔

پرسوں یہ لکھنوی حضرات اور قاری اسلم صاحب ندوی آئے میں نے ان سے کچھ سنانے کی فرمائش کی۔ برائے نام کچھ تشابہ تھا۔ یا ذہن نے محسوس کیا قریب تھا کہ دل اور آنکھیں بے قابو ہو جائیں۔ بند ضبط ٹوٹ جائے قرأت طیب یاد آگئی۔ اوپر سے یہ حادثہ سن ہی چکا تھا۔ "عشیۃ قبل طیب لیس بینا" آج وہ نہیں ہیں وہ عصر ختم ہو گیا، دیوبند کا زمانہ، اپنا قیام، اکابر کا مجمع، مولانا طیب کا حسن سراپا، ان کی لحنیت، طیب سب کی آنکھ کا تارہ تھے ان کی نسبت حضرت مہتمم سلالہ، قاسم الخیرات کے بیٹے پوتا، ذاتی جمال و کمال مکارم، خوش کلامی، خوش خطابی، خوش تعبیری، مضامین، خوش نورانی لحن، لباس و تلبس تک میں گونہ تزین، جمالی امتزاج و رنگ علمی مذاکرہ میں نوالی انداز، جمال بھی، کمال بھی، نوال بھی، مگر جلال نہیں، (یہ مفہوم عرفی) ورنہ زندگی کے سب پہلو جلالت کے شاہد، عدل اور فخامت کے غماز، جو بعد میں ایسے نمایاں ہوئے کہ نو اماثل کہے گئے۔ یہ ہرگز نہ اطراء یا مادح تھا نہ مبالغہ، اللہ ان کی قبر کو انوار سے معمور فرمائے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کے مداح و معتقدین سے زیادہ مجھے ان کے اوصاف ذکیہ پر اطلاع ہے۔ مجھے بہت سے زمان و مقام ظروف اور اوقات و احوال میں ان سے اور ان کا قرب رہا ہے۔ سفر میں حضر میں حج میں۔

ہاں مگر میں ان کی کمزوریوں کو بھی جانتا ہوں۔ ان کے قامت بلند کے پیش نظر سیئات المقربین۔ مگر بڑے سے بڑا آدمی سینہ پر ہاتھ رکھکر بتلائے کہ وہ اس سے بری اور خالی ہے؟ یہ تو ناگزیر ہیں "اللّٰھم استر عیوبنا وامح ذنوبنا" دعا بتلائی گئی عیوب وہی کمزوریاں جو زائل نہیں ہو سکتی مغلوب و مستور ہو سکتی ہیں۔

---

[1] بانی حضرت گنگوہی قدس سرہ کے صاحبزادے حضرت حکیم مسعود صاحبؒ۔ (الفرقان)

اسی لئے ان کے صرف ستر اور ذنوب کی محو کی دعا ارشاد ہوئی۔ ایک ہفتہ ہونے کو آیا ان کا نقش جمیل ذہن پر کسی نوع دجہت سے ابھر کر نہیں آیا، ان کی جوانی بڑھاپا کہولت، ان کے اقوال وافکار، رفتار، مجالس وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ اب اللہ ان کو احبار امۃ کی انجمن میں جگہ دے۔ اور یہ ان کی صحبت کبھی منتہی نہ ہو دل یہی چاہتا ہے کہ بس یہی ذکر کرتا رہوں کوئی ذکر کرتا ہے تو میں گویا اس کے منہ سے نوالہ چھین لیتا ہوں۔ اور خود بات کرنے لگتا ہوں۔ بار بار خیال ہوتا ہے کس حال میں ہوں گے

ناقاصدے نہ سفرے نامرغ نامہ برے

کن احبار د آبار صالحین سے ملاقات ہو رہی ہو گی، کوئی بے قاعدگی ہوئی ہو گی تو وہ یعفو عن کثیر ہے اور اس کا کثیر تو کل ہی ہے۔ سب محو کر دے گا کتنی شہادت انام اکے لئے ہوں گی، جنازہ پر آنے والے بھی شہداء ہی ہیں کتنوں نے عقیدت سے زندگی میں مصافحہ کیا ہو گا انتم شہداء اللّٰہ فی الارض کتنوں نے ان کے محققانہ ذاکرانہ خطاب سے شہادت حق سنی ہو گی اور خود ان کے لئے شہادت دی ہو گی۔ خطہائے ارض میں کون مقام ہے جہاں انھوں نے اللہ رسول کی بات نہ کہی ہو گی، ایشیا، یورپ، مغرب، اقصٰے، مشرق وسطٰی سب ان کے اعمال نامہ میں مکتوب و محفوظ ہیں۔ فاللّٰہ أداہ مقام المتقین دبوأہ فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر اللہ آپ سب کو صبر دے، اجر دے، حادثہ کی اہمیت نا قابل انکار، ایسی شخصیت کا فقدان نا قابل تلافی، ولان القلوب تونق باجتماع نان لاتفطرت المرائی بفراق المحبوبین موجب تسلیہ ہے ۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون ۔

والسلام

۳،۴ گھنٹے مسلسل وعظ فرمانا اور سامعین کا ہمہ تن گوش بنجانا موصوف کی خصوصیت تھی بہت کم علماء ہیں جن کو قدرت نے قوت تقریر اور خوبی تحریر کی دونوں نعمتوں سے نوازا ہو۔ موصوف میں جہاں قوت تقریر تھی خوبی تحریر بھی ایسی تھی کہ آپ ہندوستان کے مصنفین علماء کے زمرہ میں طرۂ امتیاز رکھتے تھے۔ دیگر رسائل ومضامین وکتب کے علاوہ "التشبہ فی الاسلام" آپ کی اس خوبی کا شاہد عدل ہے۔ دور والے شاید نہ جانتے ہوں لیکن موصوف سے قریب رہنے والے جانتے ہیں کہ جس طرح موصوف کو اردو نثر پر قدرت حاصل تھی اسی طرح اردو نظم پر بھی عبور حاصل تھا۔ خدا کرے کسی وقت موصوف کا شعری مجموعہ بھی شائع ہو اور موصوف کے اس کمال سے لوگ آشنا ہو سکیں۔

علماء میں ایسے صاحب علم کم ہیں جن کو دین کے اسرار اور حکم پر اس قدر عبور ہو جس قدر موصوف کو تھا۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے دینی اسرار پر آپ کی گہری نظر تھی پھر اپنے جد امجد حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کی تصانیف کے گہرے مطالعہ نے اس پر اور چار چاند لگائے تھے۔ یہ بھی آپ ہی کی خصوصیت تھی کہ قوت تقریر وتحریر کے کمال کے ساتھ آپ ایک کامیاب مدرس واستاد بھی تھے۔ سفروں سے فرصت ملتی تھی تو درسگاہ میں بیٹھ کر آپ کے جوہر کھلتے تھے انکساری، حلم وبردباری آپ کا طرۂ امتیاز تھے مخالف سے مخالف کے ساتھ بھی آپ کبھی ترش نہ ہوتے تھے انتظامی صلاحیت وقابلیت کے لئے مدرسہ دار العلوم کا آپ کے دور کا عروج ایک واضح ثبوت ہے۔ یقیناً آپ علماء دیوبند ہی کی جماعت میں نہیں بلکہ علماء ہند کے زمرہ میں ایک گل سر سبد تھے۔ موصوف کی وفات حسرت آیات سے جو خلاء پیدا ہوا ہے غالباً ایک عرصہ دراز تک وہ پر نہ ہو سکے گا۔ بایں ہمہ آخری عمر میں موصوف نے صدمات کو صبر وتحمل سے برداشت کیا اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ ان صدمات کے ذمہ دار جس طرح موصوف کے مخالفین ہیں میری نظر میں ان کے حاشیہ نشین اور موافقین بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ دعاء ہے کہ حضرت حق تعالیٰ اپنی بے کنار رحمتیں ان پر نازل فرمائے اور اپنی آغوش رحمت میں لیکر ان کے صدمات کا ان کو صلہ عطا فرمائے۔

حضرت مولانا محمد سعید صاحب بزرگ

مہتمم جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کا تاثر

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ رحمۃ اللہ علیہ سابق مہتمم دار العلوم دیوبند کا حادثہ وفات پوری ملت اسلامیہ کے لئے ایک زبردست دینی و ملی حادثہ ہے، ان کی وفات سے ہمارے علمی سلسلہ کا ایک عہد ختم ہوگیا، ان کی دینی علمی اور ملی خدمات کا اعتراف نہ کرنا بڑی ناسپاسی ہوگی، اللہ نے حضرت قاری صاحبؒ کو جن اوصاف و کمالات سے نوازا تھا ان کی مثال اب نظر نہیں آتی ہے۔ اور ان کی وفات سے علمی و دینی حلقوں میں جو خلا پیدا ہوگیا ہے اس کا پر ہونا اس دور انحطاط میں مشکل نظر آتا ہے۔

حضرت قاری صاحب کی خدمات کا دائرہ بڑا وسیع تھا، وہ زبردست خطیب تھے، وہ بہترین مصنف تھے وہ اصلاح و سلوک کے میدان کے ایک ممتاز فرد تھے۔ انھوں نے پچاس سال سے زیادہ عرصہ تک دار العلوم دیوبند جیسی عظیم یونیورسٹی کی سربراہی کی، انہوں نے ہندوستان پاکستان کے علاوہ یورپ، امریکہ، اور عربی ممالک میں کلمۂ حق کی دعوت و تبلیغ کی، ہزاروں نے ان کے ہاتھ پر توبہ کی اور ان کی حکیمانہ باتوں سے استفادہ کیا اور اپنی زندگی سنواری، اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر جامعیت کی شان پیدا کی تھی اور وہ بڑے خوبصورت انداز میں قدیم و جدید دونوں طبقوں میں کھپ جایا کرتے تھے، اور قدیم ذہن کے لوگوں کے ساتھ ساتھ جدید طبقہ بھی ان کی بصیرت افروز اور روح پرور باتوں سے متاثر ہوتا تھا۔

وہ اپنے چھوٹوں کے ساتھ بھی بہت اکرام و تعظیم کا معاملہ کرتے تھے، ان کا اس قسم کا معاملہ احقر کے ساتھ بھی تھا ان کی ذات مہر و محبت، شفقت و مروت کی جیتی جاگتی تصویر تھی طبیعت میں بڑی شرافت تھی، جمال سیرت کے ساتھ ساتھ جمال صورت سے بھی پوری طرح مزین تھے۔

جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل سے ان کا گہرا ربط تھا، اور وہ یہاں کی حاضری میں بڑی مسرت محسوس کرتے تھے، متعدد دفعہ خود احقر کے زمانہ اہتمام میں جامعہ تشریف لائے اور جامعہ کی تعلیمی و تعمیری ترقی پر مسرت کا اظہار کیا۔

اس کا افسوس ہے کہ ان کے حیات کے آخری ایام بڑی کربناکی و دردناکی کے گذرے اور ان کی زندگی کا یہ بڑا المیہ رہا کہ جس دار العلوم دیوبند کی انہوں نے اپنے خون و پسینہ سے آبیاری کی تھی آخر عمر میں ان کو اس سے سبکدوش ہونا پڑا، قاری صاحب کی اس سبکدوشی سے دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبران (جن میں کا ایک فرد یہ احقر بھی ہے) کو بڑی تکلیف ہوئی، اور ہم سب کی ہزار کوشش کے باوجود بھی ان افراد کی وجہ سے جو قاری صاحب کے گرد و پیش ان سے پٹے رہے، حضرت قاری صاحبؒ اس جنجال سے نہ نکل سکے جس میں ان کو ان کے

قریب پاس کے لوگوں نے پھنسا دیا تھا اور جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دارالعلوم انتشار کا شکار ہوا اور حضرت قاری صاحبؒ کو دارالعلوم کے عہدۂ اہتمام سے استعفا دینا پڑا اور دارالعلوم دیوبند سے متعلق لوگوں میں کرب و بے چینی کے آثار پیدا ہوئے۔

لیکن قاری صاحب علیہ الرحمۃ کی اس اخیر زندگی کے اس پہلو سے قطعِ نظر قاری صاحب کو اللہ نے محبوبیت و مقبولیت کی جو شان عطا کی تھی اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور علم و ادب اور دین و ملت کی راہ میں ان کی خدمات اور ان کی قربانیوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی خطاؤں اور لغزشوں کو معاف فرمائے اور قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی رحمتوں کے سایے میں جگہ دے۔

یہ سنکر مسرت ہوئی کہ مکتبہ اثریہ غازیپور کے نگرانِ اعلیٰ مولانا محمد ابوبکر صاحب غازیپوری کی نگرانی میں مکتبہ اثریہ کی طرف سے حضرت قاری صاحب علیہ الرحمۃ کے حالات و خدمات کے سلسلے میں ایک خصوصی اشاعت تذکرۂ طیب کے نام سے پیش کئے جانے کی تیاری کی جا رہی ہے۔ مولانا موصوف کی فرمائش پر یہ چند تاثراتی سطور پیش کرنا میں نے بھی اپنی سعادت سمجھا اور اپنی مسلسل علالت کی وجہ سے میں اس لائق نہیں تھا کہ حضرت قاری صاحب پر مفصل کوئی مضمون لکھوں۔

محمد سعید عفی عنہ

مولانا ابو العرفان ندوی

مُعتمدِ تعلیمات دار العلوم ندوۃ العُلماء

مکرمی ومحترمی جناب مولانا ابو بکر صاحب غازی پوری

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

آپ کے حکم کے مطابق یہ چند سطری تاثرات حاضرِ خدمت ہیں.

آج سے ۵۰ سال پہلے میں اپنے برادرِ معظم مولانا جمیل احمد صاحب قاسمی مرحوم کے ساتھ دیوبند گیا اور عربی کی سب سے پہلی کتاب میزان منشعب باقاعدہ داخلہ لیکر میں نے پڑھنی شروع کی اس وقت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ دار العلوم دیوبند کے مہتمم اور حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ صدر المدرسین اور شیخ الحدیث تھے. دار العلوم کے ان دو بڑے منصبوں پر ان دونوں کی موجودگی قران السعدین تھی اور میں اگرچہ اس وقت دس برس کی عمر کا تھا لیکن آج جب میں اس عہد کو سوچتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ دار العلوم دیوبند کی تاریخ میں وہ خیر القرون کا عہد تھا. دار العلوم دیوبند میں میری مدتِ قیام تقریباً تین برس رہی اور میں نے میزان سے لیکر قطبی تصدیقات واصول الشاشی تک کی تعلیم دار العلوم دیوبند میں حاصل کی ہے. اس تین سالہ مدت میں قاری صاحبؒ کو مختلف حیثیتوں سے دیکھنے کا موقع ملا. پابندی سے پنجوقتہ نماز باجماعت کے لئے مکان سے دار العلوم کی مسجد میں تشریف لانا، اور وقتاً فوقتاً امامت فرمانا اور جہری نماز میں انتہائی معیار کی قرأت کے ساتھ نماز پڑھانا آج بھی اس کا احساس وتاثر اور حلاوتِ حافظہ میں موجود ہے. ان کی شیریں بیانی اور شیریں زبانی دار العلوم کے احاطہ میں ضرب المثل تھی ماشاء اللہ اللہ تعالیٰ نے حسنِ سیرت کے ساتھ حسنِ صورت سے بھی نوازا تھا اور اس کی وجہ سے وہ ہر جگہ محبوب اور لوگوں کی توجہ کا مرکز رہے. ان کی قبولیت اور ایک عالم دین کی حیثیت سے ان کی شہرت اور صاحب صلاح وتقویٰ ہونے کا اعتراف ہند وبیرون ہند کے علماء واہل بصیرت نے برملا کیا ہے. اللہ تعالیٰ نے ایک بلند معیار کے عالم دین ہونے کی حیثیت سے ان کو جو وجاہت اور قبولیت عطا فرمائی تھی وہ ہندوستان میں کم علماء کو نصیب تھی. میرے دیوبند کے زمانۂ قیام میں عام طور پر طلبا صرف دو ہی شخصیتوں سے متاثر تھے اور مجلسوں میں ان دونوں کے تذکرے ہوا کرتے تھے. میری مراد حضرت مدنیؒ اور حضرت قاری صاحبؒ سے ہے. میں اپنی کم عمری کی وجہ سے براہِ راست قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ

کی مجلسوں سے استفادہ کر سکا لیکن ان کی مجلسوں میں بیٹھنے والے اور مستفید ہونے والے جب اپنے کمروں میں آکر والہانہ انداز سے ان کے حسنِ بیان اور ان کے علمی تفوق کا تذکرہ کرتے تھے تو میں بھی اپنی عمر اور استعدادِ علمی کے مطابق لطف اندوز ہوتا تھا۔

بعض گھریلو اسباب کی وجہ سے دیوبند سے تعلیمی سلسلہ منقطع کرنا پڑا اور دو چار سال مختلف اساتذہ اور مدارس میں پڑھ کر میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم کے لئے آیا اور یہیں میری فراغت ہوئی اور یہیں سے مجھے خدمت کا موقع ملا جو آج تک بدستور قائم ہے۔ اس طویل ملاقات میں قاری صاحبؒ کو مختلف مجلسوں اور مختلف موقعوں میں قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ ان کا اخلاق، ان کی گفتگو، ان کا علم، ان کا تقویٰ و تورع میں سے ہر ایک متاثر کرتا تھا اور یہ بات برملا زبان پر آتی تھی کہ وہ اسلاف کا نمونہ تھے اور قاسم العلوم والخیرات کے جانشین ہیں اور بجا طور پر دار العلوم دیوبند جیسی مرکزی دینی درسگاہ کے صدر نشین ہیں۔ آخری مرتبہ جامعہ رحمانیہ مونگیر کے جلسۂ عام میں چار سال پہلے مجھے ان کو دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی اور ان کے مواعظِ حسنہ سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ دو ڈھائی گھنٹے تک وہ مسلسل اس طرح بیان فرماتے رہے کہ ان من البیان لسحرا کا مشاہدہ ہو رہا تھا۔ ان کی دینی اور علمی خدمات اور دار العلوم دیوبند کی نصف صدی سے زائد خدمتِ اہتمام اور جس عہد کو دار العلوم دیوبند کا زریں عہد کہا جا سکتا ہے بھلا نہیں جا سکتی ہیں اور ہندوستان کی مسلمانوں کی علمی و دینی خدمات کی تاریخ کا روشن باب ہیں۔

سوانح وحالاتِ زندگی

تذکرۂ طیبؒ

سوانح، نقوش، تاثرات

از مرتب

خاندان

حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ صاحب کا خاندان صدیقی خاندان ہے جس کا سلسلہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر منتہی ہوتا ہے۔ آپ کے اجداد میں دسویں پشت میں مولوی محمد ہاشم صدیقی عہدِ شاہجہانی میں نانوتہ آکر آباد ہوئے۔ بادشاہ کی طرف سے جاگیر ملی۔ نانوتہ کے صدیقی خاندان کا سلسلہ عموماً انھیں مولوی ہاشم پر ختم ہے۔

نسب نامہ

مولوی محمد ہاشم صاحب تک قاری صاحبؒ کا نسبی سلسلہ یہ ہے۔

محمد طیب ابن حافظ محمد احمد ابن محمد قاسم ابن اسد علی، بن غلام شاہ ابن محمد بخش، بن علاء الدین بن فتح محمد ابن محمد نقی ابن عبدالسمیع بن مولوی محمد ہاشم۔

قاری صاحبؒ کے والد ماجد کا نام حافظ محمد احمد تھا جو مولانا نانوتویؒ کی تنہا مذکر اولاد تھے۔ قاری صاحب کا آبائی وطن نانوتہ ہے۔ حضرت نانوتویؒ بحیثیت ذمہ دار دارالعلوم جب دیوبند میں آکر سکونت پذیر ہوئے تو اب یہی قصبہ حضرت کا وطن اصلی قرار پایا۔ حضرت نانوتوی اور قاری صاحبؒ کے والد کی شادیاں دیوبند ہی میں ہوئیں حضرت قاری صاحبؒ کا ننہال محلہ دیوان میں ہے اور اس وقت آپ جس مکان میں رہتے تھے یہ محلہ دیوان ہی میں واقع ہے اور ننہال ہی کا ہے۔

خاندانی امتیاز

حضرت قاری صاحبؒ کا خاندان دنیاوی اعتبار سے ایک متوسط خاندان رہا ہے لیکن حضرت نانوتویؒ سے قبل اس خاندان میں اوپر کی چند پشتوں میں جن کے نام و نشان کا ہمیں پتہ چلتا ہے کوئی بڑا دینی عالم نظر نہیں آتا۔ حضرت نانوتویؒ کے زمانے سے یہ خاندان مشہور و معروف ہوا اور اس کی شہرت کے آوازے سے ہندوستان کا چپہ چپہ گونج اٹھا بلکہ ہندوستان سے باہر بھی اس کی شہرت کا ڈنکا بجا۔

حضرت نانوتوی علیہ الرحمۃ کی ذاتِ گرامی سے کون ناواقف ہے۔ آج ہندوستان میں مدارسِ عربیہ کا جو سلسلہ قائم ہے اور شہر شہر دیہات دیہات جن کا جال بچھا ہوا ہے یہ سب فیض ہے حضرت نانوتوی علیہ الرحمۃ کا۔ ان مدارس عربیہ کی خشتِ اول انھیں کے ہاتھ کی رکھی ہوئی ہے اور آزاد دینی درسگاہ کا تصور انھیں کی فکر کا نتیجہ ہے۔

سن اٹھارہ سو ستاون (۱۸۵۷ء) کی جنگ میں حضرت نانوتویؒ کا جو حصہ رہا ہے اور شاملی کے میدان میں انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں اس سے ہر وہ شخص واقف ہے جس نے ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ کا

مطالعہ کیا ہے۔ بستادون کی جنگ میں مسلمانوں کی ناکامیابی کے بعد جب عیسائیت نے ہندوستان میں اسلام پر بھرپور وار کرنے کا پروگرام بنایا تو حضرت نانوتوی کی پوری توجہ اسلام کے دفاع میں لگ گئی۔ آپ نے ایک طرف عیسائیوں اور غیر مسلموں سے مناظرہ کر کے اسلام پر کئے جانے والے حملوں کا رد کیا اور معترضین کے اعتراضات کے جواب میں کتابیں لکھیں ان سے مناظرے کئے۔ دوسری طرف آپ نے اس عربی و دینی مدرسے کی سرپرستی فرمائی جس کی بنیاد دیوبند میں حضرت حاجی عابد حسین صاحبؒ کے ہاتھوں ڈالی جا چکی تھی اور اس مدرسہ کو آپ نے عربی کی ایک عظیم دینی درسگاہ میں تبدیل کرنے کا اپنے ذہن میں خاکہ بنایا اور اس کے لئے اپنی زندگی ہی میں ابتدائی مراحل طے فرما دیئے۔

اس مدرسے کے علاوہ متعدد آزاد دینی درسگاہوں کی آپ نے بنیاد ڈالی۔ امروہہ، مرادآباد، خورجہ، سہارنپور میرٹھ کے اس زمانہ کے متعدد مدارس کی بنیاد آپ ہی کے ہاتھوں رکھی گئی۔ اور اسی فکر پر ان کی تعمیر ہوئی جو حضرت نانوتویؒ نے پیش کیا تھا یعنی ان مدارس کا تعلق حکومت یا کسی ریاست سے قطعاً نہ ہو۔ غرباء کے چندوں سے ان مدارس کو چلایا جائے۔ عام مسلمانوں کا ان میں مالی تعاون ہو اور توکل علی اللہ ان مدارس کی اساس ہو۔

چنانچہ آج اس کی برکات کا ظہور نگاہوں کے سامنے ہے اب یہی مدارسِ عربیہ اسلام کی چھاؤنی ہیں اسلامی ثقافت اور تہذیب اور اسلامی علوم کے زبردست محافظتی قلعے اسلام کے خلاف اندرونی و بیرونی سازشوں کو ان مدارس نے ناکام بنا دیا اور آج ہندوستان آزادی کی فضا میں سانس لے رہا ہے ہندوستان کی آزادی میں ان مدارس کا جو کردار رہا ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ انھیں مدارس سے وہ مجاہدینِ وطن پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے اپنی بے مثال قربانیوں سے ہندوستان کو فرنگی زبردست چنگلوں سے آزاد کرایا۔ ہندوستان کی آزادی میں مدارسِ عربیہ کا کردار ایک مستقل تاریخ کا عنوان ہے

حضرت نانوتوی علیہ الرحمۃ کے بعد حضرت حافظ احمد صاحبؒ کے عہدِ اہتمام میں اس مدرسہ نے دارالعلوم کی شکل اختیار کر لی اور اس کی شہرت کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ اور پھر حضرت قاری صاحب کے دورِ اہتمام میں یہ ازہرِ مصر کے بعد سب سے بڑی دینی درسگاہ شمار کی گئی۔

حضرت نانوتوی کا علم و فضل میں جو مقام تھا وہ تو تھا ہی حضرت قاری صاحبؒ کے والد حضرت حافظ احمد صاحبؒ بھی بڑی شخصیت کے مالک تھے۔ علم و دین کے اعتبار سے بھی ان کی شخصیت بڑی عظیم المرتبت تھی اور دنیاوی اعتبار سے انکو بھی جو امتیاز حاصل تھا وہ اس زمانہ کے دوسرے علماء کو حاصل نہ تھا۔ حیدرآباد کی ریاست میں وہ صدر الصدور کے عہدہ پر تھے جو اس ریاست کا سب سے بڑا دینی عہدہ تھا۔ نیز وہ دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم بھی تھے۔ حکومت کی نگاہ میں بھی بڑی قدر و منزلت تھی۔ حکومت کی طرف سے ان کو شمس العلماء کا خطاب بھی ملا تھا مگر انھوں نے اکابر کے مشورے سے اس خطاب کو واپس کر دیا۔

حضرت قاری صاحب اس عظیم باپ کے عظیم فرزند اور اس عظیم تر دادا کے عظیم تر پوتے تھے اور اس خاندان کی آخری علمی و دینی یادگار۔

ولادت

آپ کا سنِ ولادت قمری حساب سے ۱۳۱۵ھ ہے اور شمسی حساب سے جون ۱۸۹۷ء ہے۔ مظفر الدین اور خورشید قاسم آپ کے تاریخی نام ہیں۔ حضرت حافظ محمد احمد صاحب علیہ الرحمہ کے گھر میں عرصہ کے بعد اس بچہ کی پیدائش ہوئی تھی اس وجہ سے صرف اہلِ خاندان ہی کو نہیں بلکہ پورے حلقہ، دار العلوم اور وابستگانِ خاندانِ قاسمی کیلئے باعثِ مسرت ہوئی۔ اساتذۂ دار العلوم و اکابرِ دار العلوم نے حضرت حافظ احمد صاحب کو پیغامِ تہنیت و مبارکباد بھیجا۔

حضرت قاری صاحب فرماتے تھے کہ میری پیدائش کے ساتھ ایک بزرگ کی کرامت وابستہ ہے فرماتے تھے کہ حضرت حافظ احمد صاحب کو پہلے تین اولاد ہوئی اور ان تینوں کا بچپن میں انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد ایک مدت تک حضرت حافظ کے گھر کوئی پیدائش نہ ہوئی اس سے وہ متفکر تھے۔ حضرت شیخ الہند علیہ الرحمۃ کو اس کی فکر زیادہ تھی۔ انکی خواہش تھی کہ خاندانِ قاسمی کا سلسلہ آگے بڑھے۔ حضرت شیخ الہند نے مولانا عبد الاحد صاحب علیہ الرحمۃ کے والد مولانا عبد السمیع صاحب کو فتح پور ہنسوا کے ایک صاحبِ کرامات بزرگ کی خدمت میں بھیجا جو اولاد کے سلسلے میں مستجاب الدعوات تھے کہ ان سے حضرت حافظ احمد صاحب کے لئے دعا کرائیں۔ ان بزرگ نے حضرت شیخ الہند کا پیغام سنکر تھوڑی دیر مراقبہ کیا اور پھر سر اٹھا کر ان الفاظ میں بچے کے پیدا ہونے کی خوشخبری سنائی، "لڑکا ہوگا، حافظ ہوگا، قاری ہوگا، مقتدیٰ ہوگا، عالم ہوگا، حاجی ہوگا۔ قاری صاحب فرماتے تھے کہ ان بزرگ کے یہ کلمات کسی حد تک تو صادق آہی گئے۔

علمی نشو ونما اور تربیت

حضرت قاری صاحب علیہ الرحمہ جب اس عمر کو پہونچے جس عمر میں عموماً بچوں کو بسم اللہ کرائی جاتی ہے تو ان اکابر کے مجمع میں آپ کی بسم اللہ حضرت مولینا ذوالفقار صاحب علیہ الرحمۃ والد ماجد حضرت شیخ الہند کے ہاتھ پر ہوئی جو اسوقت صرف دیوبند ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں علم و فضل، دین و تقویٰ کے اعتبار سے ممتاز تھے۔ بسم اللہ کی اس مجلس میں حضرت مولینا ذوالفقار صاحب کے علاوہ حضرت شیخ الہند، حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب حافظ احمد صاحب اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب جیسے پایہ کے بزرگ و عالم تھے۔ بسم اللہ کی یہ رسم ۱۳۲۲ھ کو ہوئی اس وقت آپ کی عمر چھ یا سات سال کی تھی۔ بسم اللہ کے بعد سارے اکابر نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی بزرگوں کے اٹھے ہوئے اس ہاتھ کی اللہ نے لاج رکھی اور حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ علم و فضل اور کمال شہرت کے اس مقام پر پہونچے کہ ہندوستان کی بہت کم علمی دینی شخصیتوں کو یہ مقام نصیب ہوا۔

حفظ قرآن

حضرت قاری صاحب کو ابتداً حفظ قرآن کیلئے بٹھایا گیا اور اس کے لئے حضرت تھانوی کے مشورہ سے قاری عبد الوحید صاحب الہ آبادی کو جو فن قرأۃ کے زبردست عالم تھے بطور خصوصی الہ آباد سے بلایا گیا تاکہ حفظ فن تجوید کی رعایت سے مکمل ہو۔ قاری عبد الوحید صاحب کا قیام حضرت حافظ احمد صاحب کے گھر

ہی رہا ان کا کھانا پینا مشاہرہ سب کچھ حافظ احمد ہی صاحب کے ذمہ تھا۔

دار العلوم میں شعبہ تجوید کا اجرار!

قاری صاحب کو تو صرف حضرت قاری صاحب کی تعلیم کیلئے بلایا گیا تھا لیکن دیوبند آجانے کے بعد اکابر دار العلوم اور خاص طور پر حضرت شیخ الہند علیہ الرحمۃ نے حضرت حافظ احمد صاحب سے گذارش کی کہ جب قاری صاحب تشریف لا چکے ہیں تو کیوں نہ دار العلوم میں انکو مدرس رکھ لیا جائے تاکہ دوسرے طلبہ بھی ان سے استفادہ کر سکیں حضرت حافظ صاحب اس پر راضی ہو گئے، اور دار العلوم میں باقاعدہ شعبہ تجوید کا اجرا عمل میں لاکر کے قاری عبد الوحید صاحب کو مدرس رکھ لیا گیا جہاں قاری طیب صاحب کے ساتھ دوسرے طلبہ دار العلوم بھی ان سے مستفید ہونے لگے۔

اس طرح حضرت قاری صاحب علیہ الرحمۃ کی برکت کا پہلا ظہور ہوا۔

حضرت قاری صاحب فرمایا کرتے تھے دار العلوم میں شعبہ تجوید قائم ہونے کا سبب میں ہوں اور میں ہی اس شعبہ کا پہلا شاگرد ہوں۔

حفظ قرآن کی تکمیل

۱۳۲۶ھ میں جب حضرت قاری صاحب علیہ الرحمۃ کی عمر گیارہ بارہ سال کی تھی آپ نے حفظ قرآن تجوید کے ساتھ مکمل کر لیا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت قاری صاحب کو جہاں جمال صورت و سیرت سے نوازا تھا، ہیں آپ کو حسن صورت سے بھی بہرہ وافر عنایت کیا تھا، آپ کی آواز بلند بھی تھی اور اس میں لحن داؤدی بھی تھا جس مجلس میں آپ قرآن کی تلاوت فرما دیتے ایک سماں بندھ جاتا، اکابر آپ سے قرآن پڑھوا کر سنتے، حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کی خدمت میں جب تھانہ بھون خانقاہ میں حاضر ہوتے تو حضرت جہری نماز کیلئے آپ ہی کو آگے بڑھاتے یہ صرف قاری صاحب کی خصوصیت تھی ورنہ تھانہ بھون کی خانقاہ کی مسجد میں حضرت تھانوی کی موجودگی میں دوسرا امام نہ ہوتا آواز کی اس دلکشی سے ہمارے کان تو نا آشنا رہے اس لئے کہ حضرت قاری صاحب کی آواز عمر کے تقاضہ سے بہت پست ہوگئی تھی اور پیری کا اثر آواز پر بھی صاف ظاہر تھا مگر جوانی کی عمر میں جن لوگوں نے قاری صاحب کا پڑھنا سنا ہے ان کا بیان ہے کہ جس مجلس میں آپ تلاوت فرماتے ایسا معلوم ہوتا کہ نور و رحمت کی بارش ہو رہی ہے۔

فارسی تعلیم

حفظ مکمل کر لینے کے بعد آپ کو فارسی تعلیم کیلئے بیٹھایا گیا، فارسی کے استاذ حضرت مولینا محمد شفیع صاحب علیہ الرحمۃ مفتی اعظم پاکستان کے والد ماجد حضرت مولینا محمد لیسین صاحب علیہ الرحمۃ تھے یہ دار العلوم میں فارسی اور عربی ابتائی کتابوں کے استاذ تھے، فارسی میں آپ کو کمال کا درجہ حاصل تھا پڑھانے کا انداز بھی ایسا تھا کہ آپ سے پڑھنے والے کو فارسی بولنے لکھنے اور فارسی ادب کی مشکل سے مشکل کتابوں کو بخوبی طور پر پڑھنے پڑھانے پر اسے قدرت حاصل ہو جاتی، فارسی کیساتھ تجوید کی بعض کتابیں نیز حساب ریاضی وغیرہ بھی آپ پڑھتے رہے، ریاضی اور حساب میں آپ کے استاذ منشی منظور احمد صاحب تھے یہ حضرت مولینا محمد لیسین صاحب کے برادر خورد تھے اور ریاضی اور حساب دانی میں بے نظیر تھے۔

یہاں اس بات کا جاننا بھی دلچسپی کا باعث ہے کہ مولانا مفتی شفیع صاحب کا بھی سن پیدائش وہی ہے جو حضرت قاری

صاحب کا ہے اور ان دونوں اکابر کی تعلیم ساتھ ساتھ ہوتی رہی اور دونوں ہی اپنے وقت کے نامور عالم ہوئے اور دونوں ہی نے حضرت تھانوی سے تعلق قائم کیا اور دونوں ہی کو حضرت تھانوی کی طرف سے خلافت اور اجازت بیعت ملی دونوں کا بچپنا ساتھ ساتھ گذرا تعلیم بھی ساتھ ہی پوری ہوئی۔

کچھ تو فطری ذہانت اور کچھ پڑھانیوالے کا ذوق تدریس اور طریق تعلیم تھا کہ آپ کی فارسی کی استعداد اسی وقت بہت پختہ ہوگئی اور آپ بلاتکلف نظم ونثر پر اسی زمانہ میں قادر ہوگئے تھے بچپن کے زمانہ میں جب کے ابھی عمر کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا آپ نے فارسی میں اشعار نظم کرنے شروع کر دیے تھے۔

حضرت قاری صاحبؒ کو فارسی لکھنے اور بولنے پر بڑی قدرت تھی چنانچہ افغانستان کا جب آپ کا تاریخی سفر ہوا جس میں شاہ افغانستان نے آپ کو اپنا مہمان بنایا اور آپ کے ساتھ اعزاز واکرام کا وہی معاملہ کیا جو سربراہوں کے ساتھ کیا جاتا ہے بلکہ بادشاہ نے آپ کا انتہائی اعزاز یہ کیا کہ جب وہ آپ کو لیکر قصر شاہی میں کھانے کیلئے چلا تو اس نے آپ کو آگے کیا اور وہ خود آپ کے پیچھے چل رہا اس سفر میں آپ کی فارسی پر قدرت کے جوہر کھلے آپ نے تقریریں فارسی میں کیں، گفتگو فارسی میں کرتے ہر طرح کے علمی وغیر علمی سوالات کا جواب فارسی ہی میں دیتے، اور اس گفتگو میں نہ کوئی تکلف ہوتا اور نہ احساس [illegible] ہی آپ کی [illegible] فارسی دانی پر خود افغانستان کے علماء وادبار متاثر تھے۔

عربی تعلیم کی ابتداء اور آپ کے اساتذہ

فارسی کی تعلیم [illegible] ابتداء آپ کا عربی میں داخلہ ہوا عربی میں ۱۳۲۰ھ میں داخل ہوئے

آپ نے عربی کی کتابیں جن اساتذہ سے پڑھی ہیں پورے ہندوستان میں ان کی مثالیں اس زمانہ میں ناپید نہیں اور اللہ کا آپ پر یہ فضل واحسان تھا کہ آپ کی چھوٹی اور ابتدائی کتابیں بھی ان اساتذہ کے پاس ہوئیں جو علوم اسلامیہ میں امامت کا درجہ رکھتے تھے، مثلاً خود آپ کا بیان ہے کہ آپ نے صغریٰ، کبریٰ، اکمل اور مرقات کا ابتدائی حصہ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی سے پڑھا۔ مرقات، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی، سلم العلوم اور ملا حسن یہ کتابیں علامہ بلیاوی سے پڑھیں جو منطق وفلسفہ کے امام وقت تھے، حمد اللہ اور قاضی مبارک مولانا رسول احمد خانصاحب سے پڑھا، جو دارالعلوم کے جید الاستعداد اور کبار اساتذہ میں سے تھے۔

کافیہ حضرت شیخ الہند نے شروع کرائی اور اس کا کچھ حصہ بھی پڑھایا، شرح جامی مولانا نبیہ حسن صاحب علیہ الرحمہ کے یہاں ہوئی آپ کو نحو میں کمال حاصل تھا، شرح وقایہ حضرت مولانا گل محمد خاں کے پاس ہوئی، ہدایہ اولین شرح میبذی اور بعض دوسری کتابیں حضرت مولانا غلام رسول صاحب کے پاس ہوئیں، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی کے یہاں ہدایہ اخیرین ہوئی، مشکوٰۃ اور مسلم شریف اپنے والد سے پڑھی، حضرت مولانا احمد صاحب اس وقت بہت کمزور ہوچکے تھے لیکن اپنی پیری کے باوجود محض حضرت قاری صاحب علیہ الرحمۃ کی خاطر یہ دو اہم کتابیں آپ نے اپنے پاس رکھیں، یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ حضرت مولانا احمد صاحب کا شہرہ دارالعلوم کے صدر مہتمم

اور حضرت نانوتوی کی اولاد ہونیکی وجہ سے زیادہ ہوا لیکن جو لوگ ان سے واقف ہیں انہیں معلوم ہے کہ علوم میں بھی حضرت حافظ صاحب کا مقام بہت بلند تھا، حدیث میں نگاہ بڑی دقیق تھی مسائل کو سمجھانے اور ان کی تہ تک پہونچنے میں بڑی قدرت تھی حضرت نانوتوی کے علوم پر بڑی گہری نگاہ تھی اپنے زمانہ میں حضرت نانوتوی کے علوم کو سمجھنے اور سمجھانے میں ان سے بڑھ کر کوئی دوسرا نہیں تھا، میں نے خود حضرت قاری صاحب سے سنا ہے کہ حضرت نانوتوی کے علوم پر میرے والد کو بڑا کمال حاصل تھا۔ انکے بعد مولانا عبید اللہ سندھی تھے پھر حضرت مولینا شبیر احمد صاحب عثمانی کو گہری مناسبت تھی اس کے بعد حضرت علامہ بلیاوی کا درجہ تھا۔

غرض حافظ احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ علوم دینیہ کے بھی بڑے زبردست فاضل تھے مسائل کے اسرار و حکم کو حضرت نانوتوی کے انداز میں پیش کرنے تھے اور آپ کی درسی تقریر میں بھی حضرت نانوتوی کی جامعیت ہوا کرتی تھی میں نے قاری صاحب سے سنا ہے کہ انھوں نے اپنے والد کی مسلم کی درسی تقریر کو ضبط بھی کیا تھا۔

سنن ابوداؤد قاری صاحب نے مولانا محمد میاں اصغر حسین صاحب سے پڑھی جو زبردست عالم اور ولی کامل تھے نسائی شریف حضرت علامہ بلیاوی سے پڑھی ابن ماجہ حضرت مولانا رسول خانصاحب سے پڑھی اور بخاری شریف اور ترمذی شریف محدث عصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری سے پڑھی حضرت شاہ صاحب کو اللہ نے جن خوبیوں اور کمالات سے نوازا تھا اس سے اہل علم خوب واقف ہیں بقول علامہ زاہد الکوثری (جو مصر کے زبردست فاضل اور بڑے محقق عالم ہیں) ابن ہمام کے بعد پانچسو سال کے عرصہ میں علوم اسلامیہ کی اتنی جامع اور محقق شخصیت کوئی اور نہیں گذری علم حدیث میں بلاشبہ انکا درجہ حافظ ابن حجر کا تھا حافظہ ایسا تھا کہ جو چیز دیکھی یا پڑھی سالوں کیلئے ذہن میں جم گئی، آپ کی ذات ایک چلتا پھرتا کتب خانہ تھی علم حدیث میں تخصص کے ساتھ دوسرے بھی فنون میں ان کو کمال حاصل تھا دار العلوم کی مسند تخت پر ان جیسا وسیع النظر اور محقق عالم نظر نہیں آتا حضرت شاہ صاحب درس کیا ہوتا علوم کا ایک دریا بہتا، شاہ صاحب سے جنہوں نے پڑھا ہے ان کی یہ شہادت ہے کہ شاہ کے درس میں یوں معلوم ہوتا کہ علم حدیث و فقہ کی ساری کتابیں ان کے ذہن میں محفوظ ہیں اور ہر علم و فن کے مسائل اور ان کی جزئیات ذہن کے خزانہ میں ہیں۔

حضرت قاری صاحب نے حضرت شاہ صاحب سے بھرپور استفادہ کیا اور ان کے زمرۂ تلامذہ میں آپ کا شمار ممتاز لوگوں میں ہوا۔

فراغت

قاری صاحب ۱۳۲۷ھ کو درجہ فارسی میں داخل ہوئے اور علوم و فنون کی وادی کو طے کرتے ہوئے ۱۳۳۷ھ کو دار العلوم سے دس سال کی مدت میں فارغ ہو گئے۔

جن اساتذہ سے آپ نے تعلیم حاصل کی وہ اپنے زمانہ کے مشہور اور محقق علماء تھے جنکی شہرت سے ہندوستان کی علمی فضا گونج رہی تھی حضرت قاری صاحب کو قدرت نے طبع سلیم، ذوق مستقیم اور ذکاوت و ذہانت کی نعمتوں سے نوازا تھا نیز دار العلوم کی یہ فضا ہی ایسی تھی کہ بے محنت بھی محنت کرنیوالا بن جائے آپ کا شمار

نوان طلبہ میں تھا جو شروع ہی سے اپنی محنت مطالعہ شوق و ذوق میں مشہور تھے۔ اللہ نے آپکو کمالات سے نوازا اور علوم و فنون سے گہری مناسبت پیدا ہو گئی۔

زمانہ طالب علمی کی دلچسپیاں

حضرت قاری صاحب علیہ الرحمۃ حضرت نانوتوی کے گھرانے کے چشم و چراغ تھے بڑے دادا کے بڑے پوتے اور اور بڑے باپ کے بڑے بیٹے تھے مگر بچپن ہی سے آپ کی طبیعت میں بڑا انکسار، بڑا تحمل بڑی شرافت تھی حلم و بردباری کی شان شروع ہی سے تھی آپ کا ذوق بڑا سلیم تھا یہی وجہ ہیکہ آپ کا طالبعلمی کا زمانہ جو عموماً کھیل کود کا زمانہ ہوتا ہے بڑا پاکیزہ گذرا پاکیزہ ماحول میں آپ کی تربیت ہوئی نہ بلاوجہ کا کھیل کود نہ لڑائی جھگڑا نہ غلط صحبت نہ ہنگاموں سے دلچسپی۔

آپ کا زیادہ تر وقت کتابوں کے مطالعہ میں گذرتا یہی کتابیں آپ کی دلچسپی کا اصل مرکز تھیں۔ اس زمانہ میں طلبہ میں ادبی ذوق پیدا کرنے کیلئے اصلاح اللسان کے نام سے ایک انجمن تھی جس میں اساتذہ اور طلبہ سب شریک ہوتے عربی فارسی اور اردو کے اشعار لوگ کہتے اور اس مجلس میں پیش کرتے حضرت شاہ صاحب اس مجلس کے صدر رہے حضرت مولانا اعزاز علی صاحب کو اس مجلس سے گہری دلچسپی تھی اس وجہ سے آپ کی شرکت اس میں ضروری تھی اساتذہ کے ساتھ طلبہ بھی انہیں اساتذہ کے سامنے اپنا کلام سناتے اساتذہ اصلاح دیتے اس طرح ان طلبہ کے علمی و ادبی ذوق کو جلا ملا کرتی اور ان کا یہ ذوق ترقی کرتا۔ حضرت قاری صاحب بھی اس مجلس میں شریک ہوتے اور اپنا اردو فارسی اور عربی کا کلام سناتے جن کی اساتذہ داد دیتے اور پسند فرماتے اس زمانے کے بعض کلام اس نمبر میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔

یہیں سے حضرت قاری صاحب کا شعری ذوق بیدار ہوا اور اس میں آپ کو یہ کمال حاصل ہوا کہ عربی فارسی اردو ان تینوں زبانوں میں آپ بلا تکلف شعر کہتے اور ایک ہی ردیف و قافیہ کی رعایت کے ساتھ سیکڑوں شعر کہتے بسا اوقات اشعار کی آمد اس کثرت سے ہوتی کہ ایک ہی مجلس میں پوری پوری نظم تیار ہو جاتی۔

تقریر و تحریر میں آپ کو جو ملکہ حاصل ہوا وہ اسی زمانہ کی مشق و تمرین کا ثمرہ تھا زمانہ طالب علمی ہی میں آپ کی تقریریں نہایت شستہ اور پر اثر مربوط ہوا کرتی تھیں آپ تقریر کی مشق میں بڑی محنت کرتے کتابوں کا مطالعہ کرتے جس موضوع پر تقریر کرنی ہوتی ان کتابوں سے اس پر مواد حاصل کرتے پھر ان کی تحریری طور پر نوٹ کرتے اور اس کو ترتیب دیکر پھر آپ اس کی مشق کرتے اور یہ عادت آپ کو عرصہ تک تھی کہ تقریر کی پوری تیاری کے بعد آپ تقریر کرتے اس ابتدائی مشق و تمرین اور محنت کا نتیجہ تھا کہ آپ کو خطابت و تقریر میں وہ کمال حاصل ہوا جو بہت کم لوگوں کے حصہ میں آیا خصوصاً اس زمانہ میں ہندو پاک میں دوسرا کوئی اس میدان میں آپ کا شریک و سہیم نہیں تھا۔

امیر شاہ خانصاحب اور فن سپہ گری

بچپن ہی میں آپ نے فن سپہ گری بھی سیکھی تھی اس سے بھی آپ کو گہری دلچسپی تھی اس فن میں آپ کے استاذ حضرت ۔ امیر شاہ خانصاحب تھے یہ امیر شاہ صاحب حضرت نانوتوی کے مخصوص متوسلین میں سے تھے خورجہ کے رہنے والے تھے۔ حافظہ غضب کا تھا اکابر کے واقعات خوب یاد تھے اور ان واقعات کو احادیث کی طرح سند بیان کرتے زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے مگر اکابر کی صحبت میں رہے تھے اس وجہ سے علوم و مسائل پر نگاہ رکھتے تھے اور اچھے خاصے مولوی بھی ان کے سامنے گفتگو کرتے ہوئے حجاب محسوس کرتے حضرت نانوتوی سے غایت درجہ عشق تھا ان کی صحبت میں رہے ہوئے تھے حضرت کے علوم پر بھی ان کو قدرت تھی جنکو وہ نہایت شستہ اور سنجیدہ انداز میں بیان کر دیتے تھے دارالعلوم سے وابستہ لوگ ان کا بہت احترام کرتے ان کی مجلس بڑی پر بہار ہوتی دیوبند اکثر حاضری ہوتی جب تشریف لاتے لوگ ان کے پاس حاضر ہوتے اور انکی دلچسپ گفتگو سے سب لطف اٹھاتے۔

مولانا محمد ایوب صاحب اعظمی شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے میں نے سنا کہ مولینا عبدالماجد صاحب جو حدیث میں حضرت گنگوہی علیہ الرحمۃ کے شاگرد تھے بڈھو میں پڑھاتے تھے غالباً ابوداؤد کا درس دے رہے تھے۔ امیر خانصاحب کھڑکی سے لگے ہوئے باہر سے سن رہے تھے مولانا نے کسی حدیث کا مطلب بیان کیا امیر شاہ خانصاحب نے اس کو سنکر فرمایا کہ مولانا ہمارے حضرت نانوتوی اس حدیث کا یہ مطلب بیان کرتے تھے۔ اور پھر حضرت نانوتوی کی پوری تقریر دہرادی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر خانصاحب کو علم سے باوجود مولوی نہ ہونے کے کتنی گہری مناسبت تھی حضرت نانوتوی کی تقریر کا سمجھنا اور اس کو محفوظ رکھنا اور پھر ایک عرصہ کے بعد اس کو تعین کے ساتھ انہیں الفاظ میں دہرادینا یہ اچھے خاصے مولوی کی بس کی بات نہیں تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اکابر کی صحبت کس درجہ موثر ہوا کرتی تھی کہ معمولی پڑھے لکھے لوگ بھی ان کی صحبت سے استفادہ کر کے حدیث جیسے مشکل فن پر بھی اس درجہ قابو پالیتے تھے کہ ایک شیخ وقت کے سامنے بلاتکلف گفتگو کرتے میں بھی ان کو ذرا تکلف محسوس نہ ہوتا۔

تجلید و خوشخطی

حضرت قاری صاحب نے دوران تعلیم ہی میں تجلید کا بھی فن دارالعلوم ہی میں سیکھا تھا اس فن میں آپ کے استاذ دفتری محمد علی مرحوم تھے جو کتبخانہ امدادیہ کے بانی ہیں قاری صاحب علیہ الرحمۃ کے کتبخانہ میں خود ان کے ہاتھ سے بندھی ہوئی کتابوں کی ایک خاصی تعداد ہے۔

خوشنویسی کا شعبہ دارالعلوم میں بھی قدیم سے قائم ہے آپ نے اس کی بھی مشق کی تھی اسکو آپنے منشی محبوب علی میرٹھی سے سیکھا تھا منشی محبوب علی یہ وہی ہیں جو محبوب رقم کے نام سے مشہور ہیں اور جو اپنے فن میں مشہور تھے۔ مولانا اشتیاق احمد صاحب جو دارالعلوم میں شعبہ کتابت کے صدر تھے انھوں نے بھی

خطاطی کا فن منشی محمد علی ہی سے سیکھا تھا خود مولانا اشتیاق احمد صاحب کو بھی اس فن میں کمال حاصل تھا اور آج ان کے ہزاروں شاگرد ہند و پاک میں پھیلے ہوئے ہیں۔

دیگر شیوخ حدیث سے اجازت

اکابر کا دستور رہا ہے کہ وہ اپنے علمی سلسلہ کو مختلف الجہات بنانے کیلئے اور بجہت فیوض برکات حاصل کرنے کیلئے نیز اپنی سند کو عالی کرنے کیلئے شیوخ احادیث کی خدمت میں حاضری دیتے اور ان سے اجازت حدیث حاصل کرتے آج انحطاط علمی کے جس دور سے ہم گذر رہے ہیں اس میں اب اس کی اہمیت بھی باقی نہیں رہی ہے ورنہ آج سے تھوڑی مدت پہلے تک مختلف شیوخ سے اجازت حدیث کا ذوق عام تھا اور اس کیلئے لوگ سفر کرتے محدثین میں اس کا بڑا اہتمام تھا، حضرت قاری صاحب علیہ الرحمۃ کی پوری تعلیم دیوبند میں ہوئی آپکا سلسلہ علمی یہ تھا محمد طیب عن العلامہ انور شاہ الکشمیری، عن شیخ الہند محمود الحسن عن مولانا محمد قاسم النانوتوی عن الشاہ عبد الغنی عن الشاہ محمد اسحاق عن الشاہ عبد العزیز الدھلوی عن ابیہ الشاہ شیخ ولی اللہ۔

یہی سلسلہ عام طور پر متعلقین دیوبند کا ہے، دیوبند سے فراغت کے بعد آپ نے دوسرے شیوخ حدیث کے بھی حدیث کی اجازت حاصل کی جن میں مولینا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ اور مولینا عبد اللہ انبیٹھوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، حضرت سہارنپوری نے اپنے دست خاص سے سند حدیث بھی لکھکر مرحمت فرمائی۔

مشائخ اور اکابر میں آپ کی محبوبیت و مقبولیت

حضرت قاری صاحب علیہ الرحمۃ کو ان کے خاندانی شرف نیز خود آپ کی طبعی سنجیدگی ذہانت و فطانت علم کے کمال شوق اور گوناگوں صلاحیتوں کی وجہ سے اکابر آپ کے ساتھ بڑی محبت کرتے، آپ سب کے پیارے تھے آپکے ساتھ سب کا معاملہ خصوصیت کا تھا لوگ آپکو دیکھتے اور محبت کی نگاہ ڈالتے، آپ کے لئے دعا کرتے آپ کی علمی ترقی سے انھیں خوشی ہوتی اور وہ حوصلہ افزا کلمات سے آپ کی ہمت افزائی کرتے، اس طرح آپ کی مخفی صلاحیتیں ابھرتیں اور آپ میں مزید ہمت جوش و جذبہ پیدا ہوتا۔

تدریسی مشغلہ

فراغت کے بعد اکابر و شیوخ کے مشورہ سے آپ نے دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے مشغلہ کو حسبۃً للہ اختیار کیا ابتداءً آپ کے ذمہ نیچی کتابیں تھیں آپ کے اساتذہ و شیوخ موجود تھے پہلے مرحلہ میں اونچی کتابیں یوں بھی تعلیم و تدریس کے مزاج کے خلاف ہے۔ دوسرے ان شیوخ کی سرپرستی میں آپ کی خود خواہش تھی کہ ابتدائی کتابوں سے ترقی کرکے آگے کیطرف بڑھیں چنانچہ ابتدا میں آپ کے ذمہ ہدایۃ النحو قدوری وغیرہ کتابیں تھیں لیکن بعد میں آپ نے اس میدان میں کافی ترقی کی اور درجہ علیا کی کتابیں آپ کے پاس آگئیں جنکو آپ محنت سے پڑھاتے طلباء آپ کے درس سے مطمئن رہتے مشکوۃ شریف عرصہ تک پڑھائی اس کے علاوہ احادیث کی دوسری کتابیں بھی گاہے بگاہے

آپ کے ذمہ رہی تدریس کا یہ سلسلہ ۱۳۴۷ھ سے ۱۴۰۳ھ تک رہا حضرت مولانا فخر الدین صاحب علیہ الرحمۃ کے انتقال کے بعد کچھ دنوں تک آپ نے بخاری شریف کا درس دیا مگر ضعف پیری نیز کثرت اشغال اور کثرت اسفار کی وجہ سے مستقل اس کا درس دینا آپ کے لئے دشوار تھا اس وجہ سے آپنے بخاری کی تدریس سے سبکدوشی حاصل کرلی۔

تدریسی خصوصیات

حضرت قاری صاحب علیہ الرحمۃ میں قوت گویائی قدرت کا عطیہ تھا انہار و تفہیم پر بڑی قدرت تھی مشکل مسائل کو ہلکے پھلکے عام فہم انداز میں پیش کر دینا یہ حضرت قاری صاحب علیہ الرحمۃ کا کمال تھا۔ اس کے ساتھ محنت اور مطالعہ کے بعد درس دیتے اس لئے طلبہ آپ کے درس سے مطمئن رہتے مطالعہ کا انہماک تو میں نے خود دیکھا ہے ایسا معلوم ہوتا کہ کتاب میں کھو گئے ہیں سبق میں کبھی اکابر کی تحقیقات کے ساتھ اپنی بھی تحقیق پیش کرتے مگر اس کے ساتھ ساتھ طلبہ کے سامنے بلا تکلف عرض کرتے کہ اصل تحقیق تو وہی ہے جو اکابر کی ہے جو لوگ حضرت قاری صاحب علیہ الرحمۃ کے درس میں شریک ہوئے ہیں ان کا بیان ہے کہ قاری صاحب کے درس سے انشراح حاصل ہوتا تھا ہر مسئلہ کی پوری تفصیل فرماتے تھے۔ اکابر کا نام بڑے اہتمام سے لیتے تھے اور ائمہ اور محدثین کا تذکرہ بڑی عقیدت سے کرتے تھے کسی بھی محدث یا امام کی شان میں کوئی ایسی بات نہ کہتے جس سے ان کی تنقیص ہو چونکہ طبیعت میں فطرتاً ظرافت تھی اس وجہ سے اسباق میں بھی کبھی کبھی یہ ظرافت ظاہر ہوتی البتہ طلبہ کو بے تکلف نہ بناتے۔ ایک خاص بات حضرت قاری صاحب میں یہ تھی کہ اگر کوئی مسئلہ ایسا ہوتا جس میں آپکو محسوس ہوتا کہ طلبہ منشرح نہیں ہوئے ہیں تو ان سے بلا تکلف کہدیتے کہ تم دوسرے اساتذہ سے بھی اپنا اطمینان کرلو یہ بات بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے یہ حقیقت میں وہی شان تواضع ہے جسکا مرقع حضرت قاری صاحب کی ذات تھی۔

حجۃ اللہ البالغہ سے خصوصی شغف

حضرت قاری صاحب کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ سے شروع ہی سے خصوصی شغف تھا۔ اس کتاب کو آپ نے بہت پڑھایا آخیر عمر میں بھی اس کا درس دیتے رہے مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ میں نے بھی یہ کتاب حضرت قاری صاحب سے پڑھی ہے۔ اور میں بلا تکلف کہہ سکتا ہوں کہ اس زمانہ میں بہت کم ایسے لوگ ہیں جو اس کتاب کو اس عمدہ طریقہ سے پڑھا سکیں جیسا کہ حضرت قاری صاحب پڑھاتے تھے حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ کی یہ کتاب احکام شریعت کے اسرار و حکم میں نہایت جامع اور بے نظیر کتاب ہے اردو عربی میں اتنی جامع کتاب اس فن میں دوسری نہیں ہے حضرت قاری صاحب کو خود بھی اس فن سے طبعی مناسبت تھی اس وجہ سے اس کتاب کو آپ بڑی دلچسپی سے پڑھاتے تھے اور حق یہ ہے کہ آپ اس کتاب کا پورا حق ادا کرتے اس درس میں بیٹھکر بڑا لطف آتا شریعت کے اسرار و حکم کا بیان حجۃ اللہ البالغہ جیسی کتاب اور قاری صاحب کی زبان ایسا معلوم ہوتا کہ ہم علم کی کسی اور وادی میں ہیں۔ مجھے حجۃ اللہ البالغہ سے تھوڑی بہت دلچسپی اس زمانہ میں پیدا ہوئی شاہ صاحب کی اصطلاحات سمجھے بغیر انکی کسی بھی کتاب کا سمجھنا دشوار ہے حضرت قاری صاحب اپنے درس میں ان اصطلاحات کی طرف کافی توجہ فرماتے اور ان کی پوری دلنشین تشریح فرماتے۔

اس کتاب کے درس میں خصوصیت کے ساتھ آپ اپنے جدامجد حضرت نانوتوی کے علوم کو بھی ذکر کرتے

حکمت قاسمیہ اور حضرت نانوتوی کے علوم سے مناسبت

حضرت قاری صاحب کو حضرت نانوتوی کے علوم پر کافی نگاہ تھی حکمت قاسمیہ اور علوم قاسمیہ کی ان سے بڑھ کر تشریح و تفسیر کرنے والا اس زمانہ میں ان کے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا حضرت نانوتوی کی کتابوں کا آپ نے بڑی محنت سے مطالعہ کیا تھا ان کی بعض کتابیں درساً اپنے والد اور حضرت شیخ الہند سے پڑھی تھیں۔ آپ کی گفت و شنید میں قاسمی علوم سے مناسبت ظاہر ہوتی تھی حضرت نانوتوی کی مشکل باتوں اور خالص فنی اصطلاحات کو آپ بہت خوبصورتی سے پیش فرماتے حضرت قاری صاحب کی کتابیں اس کی شاہد عدل ہیں کہ آپ کو ان علوم قاسمیہ سے کتنی مناسبت تھی آپ کی خواہش تھی کہ حضرت نانوتوی کی کتابوں کی اپنے قلم سے خود تشریح و تفسیر کریں کچھ اس کا سلسلہ شروع بھی کیا تھا۔ مگر مشغولیات کے ہجوم میں یہ کام پورا نہ ہو سکا اس کے لئے آپ نے بعض دوسرے لوگوں سے کام لینا چاہا کچھ لوگوں نے کام کیا بھی مگر یہ کام اس انداز پر نہ ہو سکا جس طرح آپ چاہتے تھے۔

حضرت قاری صاحب کی وفات سے ہم جن بڑے حادثات سے دوچار ہوئے ہیں ان میں سے ایک بڑا حادثہ یہ بھی ہے کہ اب قاسمی علوم اور حکمت قاسمیہ کی ترجمانی کرنے والا ہند و پاک میں کوئی نظر نہیں آتا۔

ان علوم قاسمیہ سے قوی مناسبت کا نتیجہ تھا کہ آپ کی تقریر و تحریر میں منطقی ربط ہوتا۔ ایک طرف اپنی بات نقلی دلائل سے مدلل کرتے تو دوسری طرف عقلی دلائل بھی اتنے ذکر کر دیتے کہ خالص عقلیت پسند بھی اس کا انکار نہیں کر سکتا تھا۔

قوت استنباط و استخراج

حضرت قاری صاحب علیہ الرحمۃ کا ذہن بڑا خداداد تھا بڑی طبیعت بڑی رسا تھی۔ حضرت نانوتوی کے علوم سے مناسبت کا نتیجہ تھا کہ آپ کے اندر کتاب وسنت سے استخراج و استنباط کا زبردست مادہ تھا۔ کبھی ایک آیت اور ایک حدیث سے ایسے ایسے مسائل کا استنباط کرتے اور اتنی کثرت سے کرتے کہ دوسروں کا ذہن وہاں تک پہونچ بھی نہیں سکتا تھا اور علوم کا ایک دریا بہا دیتے اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ یہ خاص صفت اس زمانہ میں حضرت قاری صاحب علیہ الرحمۃ کا حصہ تھی اسلام کا اخلاقی نظام اسلام اور سائنس، قرآنی دعوت کے ستر اصول معجزہ کیا ہے وغیرہ آپ کی کتابیں اسکا بہترین نمونہ ہیں بلکہ آپ کی ہر کتاب اس کی شاہد ہے کہ آپ کے اندر قوت استخراج بے پناہ تھی اور غالباً یہی وجہ ہے کہ آپ کی کتابوں میں خارجی کتابوں سے استعانت بہت کم ہوتی ہے قرآن و حدیث ہی سے آپ اپنا موضوع مکمل کر لیتے تھے۔ آپ کی تحریرات کے پڑھنے سے یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ آپ کا ذہن مسلسل غور و فکر میں لگا رہتا آیات و احادیث کے ایک ایک نقطہ سے آپ روشنی حاصل کرتے آپ کی کتابوں کے پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کی ہر آیت اور رسول اللہ کی ہر حدیث اپنے

اندر علوم و معانی کا ایک پورا دریا رکھتے ہیں جن تک رسائی خاص خاص اصحاب توفیق اور صاحبان فضل وکمال کو ہوتی ہے۔

فن حدیث سے مناسبت

حضرت قاری صاحب علیہ الرحمۃ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کے مخصوص ترین تلامذہ میں سے ہیں حضرت قاری صاحب پر حضرت کشمیری کی خاص توجہ اور عنایت بھی تھی۔ پھر قدرت نے آپ کی طبیعت میں فہم سلیم ودیعت فرمایا تھا حافظہ بھی آپکا غضب کا تھا۔ نیز خود علمی شوق بھی شباب پر تھا اس وجہ سے حضرت قاری صاحب کو شاہ انور کشمیری سے بھرپور استفادہ کا موقعہ ملا۔ اور آپ کو علوم عقلیہ کے ساتھ ساتھ علم حدیث سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی اور اللہ نے اس فن میں بھی آپ کو کمال کا درجہ عنایت فرمایا حضرت قاری صاحب کو حدیث سے گہری مناسبت کا اندازہ ان کو ہوگا جنھوں نے آپ کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے یا آپ کی تقریریں سنی ہے آپ بلا تکلف اپنی تحریروں میں احادیث پیش کرتے چلے جاتے ہیں یہی حال تقریر کا تھا کہ دوران تقریر حدیث پر حدیث پڑھتے چلے جاتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حدیث کا پورا ذخیرہ آپ کے ذہن میں ہے۔ اور ہر موضوع سے متعلق احادیث گویا آپ کے حافظے نے محفوظ کر رکھا ہے۔

اگر حضرت قاری صاحب کو فرصت ملتی اور آپ کا تدریس مشغلہ جاری رہتا تو آپ اپنے زمانہ کے بے نظیر محدث ہوتے میں نے دارالعلوم مئو میں ایک دفعہ اس مجلس میں شریک ہوا ہوں جو آخری سال میں ختم بخاری کی تقریب سے منعقد ہوئی ہے ختم بخاری حضرت قاری صاحب نے کرایا تھا۔ قاری صاحب علیہ الرحمۃ نے بخاری کی پہلی حدیث اور پہلے باب سے اپنی تقریر کی ابتدا کی اور پھر جلد اول اور جلد ثانی کے ابواب اور کتابوں میں سے ہر کتاب اور ہر باب کا نام لیکر ایک دوسری کی مناسبت اس طرح مسلسل ذکر فرماتے رہے کہ زبان پر بلا اختیار سبحان اللہ جاری تھا پورا مجمع ہمہ تن گوش تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پوری بخاری ان کے سامنے کھلی ہے ان کے حافظہ اور ان کے ذہن کے استحضار پر ہر شخص متحیر تھا زبان بھی نہایت پیاری استعمال کر رہے تھے ہر باب سے دوسری باب کی اور ہر کتاب کی دوسری کتاب سے مناسبت بھی اس طرح ذکر کر رہے تھے کہ طبیعت قبول کرتی چلی جارہی تھی۔ صحیح بخاری کی ترتیب میں توازن واعتدال اور رموز وحکمت کا کچھ صحیح اندازہ اسی مجلس میں اور حضرت قاری صاحب علیہ الرحمۃ کے ایسی تقریر سے ہوا میں نے اپنی زندگی کے مختصر لمحات میں تقریبات صحیح بخاری کی بہت سی مجلسوں میں شرکت کی ہے۔ جلیل القدر محدثین کی بھی تقریریں سنی ہیں مگر حضرت قاری صاحب والی بات خدا شاہد ہے مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔

شاید یہ بات ان لوگوں کو مبالغہ آمیز نظر آئے جنہوں نے قاری صاحب سے اس زمانہ میں بخاری کا کچھ حصہ پڑھا ہے جب حضرت رحمۃ اللہ پر ضعف اور پیری کا غلبہ تھا ظاہر بات ہے کہ اس آخری عمر میں حضرت قاری صاحب درس وتدریس کی ذمہ داری پورے طور پر پوری نہیں کر سکتے تھے حضرت قاری صاحب علیہ الرحمۃ ہی کی کیا بات ہے اس عمر میں یہ وہ بھی نہیں کر سکتے جنکے دن رات کا مشغلہ ہی درس وتدریس ہے میں آج سے بیس بائیس سال پہلے کی بات کر رہا ہوں۔

بعض اساتذہ کے خصوصی اثرات

طالب علم کی زندگی پر استاذ کی گہری چھاپ ہوتی ہے جتنا اساتذہ سے تعلق ہوگا یہ چھاپ اتنی ہی قوی ہوتی ہے طالبعلم کی زندگی اساتذہ کے اثرات سے متاثر ہونا یہ فطری بات ہے۔ یہ چھاپ ایک تو عمومی ہوتی ہے اور ایک خصوصی ہر طالب علم اپنے ہر استاذ سے متاثر ہوتا ہے اور اس کی زندگی کا رنگ قبول کرتا ہے لیکن بعض اساتذہ اپنے طلبہ پر دوسروں سے زیادہ اثر ڈالتے ہیں۔ حضرت قاری صاحب علیہ الرحمۃ جس دور میں طالب علم تھے اس وقت دیوبند میں ہر استاد اپنی اپنی جگہ اور اپنے اپنے فن میں آفتاب و ماہتاب تھا لیکن ان میں حضرت شاہ انور کاشمیری کا مقام بہت ممتاز تھا آپ کی شخصیت اور آپ کے علم سے پورا دارالعلوم بلکہ پورا ہندوستان متاثر تھا دارالعلوم کی مسند شخصیت پر اتنا زبردست محدث ابتک نہیں آیا آپ کے بے پناہ علم اور بے پناہ حافظہ اور بے پناہ مطالعہ کی وجہ سے آپکے اساتذہ بھی آپ کا احترام کرتے تھے اور آپ سے علمی کاموں میں تعاون حاصل کرتے تھے آپ کا ہر شاگرد آپ کا معتقد و جاں نثار تھا یہ زمانہ دارالعلوم کا دورِ شباب تھا کہ اب اس کا واپس ہونا محال معلوم ہوتا ہے۔

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت شاہ صاحب سے گہری مناسبت تھی اور ذوق مطالعہ کی ترقی اور ازدیاد میں حضرت شاہ صاحب کی زندگی کا آپ پر گہرا اثر تھا نیز حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی اور حضرت حافظ احمد صاحب جو آپکے والد ماجد تھے ان سے بھی آپ بہت متاثر تھے خود آپ کا بیان ہے۔

"مجھے علم حدیث سے لگاؤ اور مناسبت حضرت والد محترم کے درس سے حاصل ہوئی ان کا بیان بہت دلنشین اور مؤثر ہوتا تھا اور حدیث کی تشریحات و معانی پر دسترس حضرت شاہ صاحب قدس اللہ سرہ کے ذریعہ حصہ میں آئی اور مسائل کی تعبیر و تفہیم کا انداز حضرت مولانا شبیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سیکھا حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علم حدیث پر نظر بہت گہری اور وسیع تھی۔ اس کے معانی پر پورا عبور رکھتے تھے اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے بڑی فصیح و بلیغ زبان عطا کی تھی اور اپنی بات دوسروں کے ذہن نشین کر دینے پر پوری قدرت حاصل تھی"۔

اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کا عربی ذوق و ادب یہ ثمرہ تھا حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اور آپکے اندر انتظامی صلاحیت یہ ثمرہ تھا حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نیز آپ کی علمی تربیت میں بھی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا زبردست حصہ ہے آپ ہی نے ان کو ابتداء دارالعلوم میں معین مدرسین کے عہدہ پر اپنی نگرانی میں رکھا۔

سلوک و معرفت کی راہ میں

دارالعلوم دیوبند کا عہد اول نرا زرین تھا اور ہر اعتبار سے بڑا مبارک تھا ایک طرف علم کا عظیم تر مرکز تھا جہاں سے علوم نبویہ و دینیہ کی نہریں بہہ رہی تھیں اور ہند و بیرون ہند سے قافلے کے قافلے طلب و شوق کے توسن پر سوار دیوبند کا رخ کر رہے تھے اور اپنی علمی پیاس بجھا رہے تھے۔ دوسری طرف یہ دیوبند کا دارالعلوم باطنی تربیت گاہ تھی علم کے ساتھ عمل کا

کا جذبہ پیدا کرنا اور روح شریعت سے اپنی زندگی کو سرشار و آباد کرنا اس درسگاہ کا اہم مقصود تھا اس لئے تعلیم کے ساتھ ساتھ عملی زندگی میں نکھار پیدا کرنے کیلئے اور باطن کے تزکیہ و تطہیر کیلئے بھی یہ درسگاہ ایک عظیم خانقاہ تھی اساتذہ کی غالب تعداد ان لوگوں کی تھی جنکو نسبت باطنی سے بڑا حصہ ملا تھا ذمہ داران مدرسہ سب کے سب صاحب باطن تھے اور یہی مذاق عموماً طلبا میں بھی پیدا ہوتا تھا۔

حضرت شیخ الہند سے بیعت

تعلیم سے فراغت کے بعد کسی بزرگ سے تعلق قائم کرنا اور ان کی تربیت میں رہ کر اپنے باطن کی اصلاح کرنا اس زمانہ کے طلبہ کا عام مزاج تھا۔ چنانچہ فراغت کے بعد قاری صاحب علیہ الرحمۃ نے بھی اس راہ میں قدم رکھا۔ اور پہلے حضرت شیخ الہند علیہ الرحمۃ سے بیعت ہوئے، حضرت شیخ الہند علیہ الرحمۃ کی ذات دارالعلوم دیوبند ہی میں نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں عقیدت و محبت کا مرکز تھی اللہ نے آپ کو ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف کھڑا کیا تھا آپکے شاگردوں نے اور خود آپ نے حکومت برطانیہ کے پیچھے چھڑا دیئے اور بالآخر ہندوستان کی زمین سے سمندر اس پار اس مکار قوم کو جانا ہی پڑا جس نے سو سال سے ہندوستان کو اپنی غلامی کی زنجیر میں جکڑ رکھا تھا۔

حضرت شیخ الہند علیہ الرحمۃ ایک طرف قومی لیڈر تھے دوسری طرف زبردست عالم و محدث بھی نیز ایک عارف باللہ اور شیخ وقت بھی حضرت گنگوہی کے اجل خلفاء میں سے تھے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اجازت بیعت تھی۔

حضرت شیخ الہند مالٹا سے جب واپس ہوئے تو حضرت قاری صاحب اس وقت اور آپ برادر خورد مولینا محمد طاہر صاحب نے آپ سے بیعت کی حضرت قاری صاحب نے جب آپ سے بیعت کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا "

"اس وقت اپنی جماعت میں دو ہی صاحبزادے ہیں جن کا پوری جماعت احترام کرتی ہے ایک مولینا حافظ احمد صاحب ابن حضرت نانوتوی قدس سرہٗ اور ایک مولانا حافظ مسعود صاحب (ابن حضرت گنگوہی) لوگوں کا مجھ پر الزام ہے کہ اس نے دونوں صاحبزادوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اگر میں تم دونوں کی بیعت کر لوں تو لوگ کہیں گے کہ اب قبضہ موروثی ہوگیا ہے" تھوڑی دیر اور کچھ مزاحی باتیں فرمائیں پھر اسی دن ان دونوں بھائیوں کو بلا کر بعد مغرب بیعت کی بیعت کے بعد مختلف نصیحتیں کیں جن کا خلاصہ تھا۔

حضرت شیخ الہند کی نصیحت

بیعت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس سے کوئی دنیاوی عزت یا دولت ملجائے گی بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ نفس اور باطن کی اصلاح ہو جائے اور وہ پاکیزہ اور مہذب ہو کیونکہ انسان کے نفس کے ساتھ ہزاروں روگ لگے ہوئے ہیں جیسے تکبر، حرص، حسد، کینہ، بغض، عداوت اور عناد وغیرہ دنیاوی فسادات بھی انہیں سے پیدا ہوتے ہیں اور انسان کی آخرت بھی انھیں سے برباد ہوتی ہے۔ بیعت کا منشا یہ ہے کہ اخلاق ذمیمہ مغلوب ہو جائیں۔ اور اخلاق فاضلہ غالب ہو جائیں جیسے انابت الی اللہ اور توکل وغیرہ اور یہ چیزیں کثرت ذکر سے پیدا ہوتی ہیں جس قدر ذکر کیا جائے گا۔

اخلاق فاضلہ اسی انداز سے قوی ہوں گے اور طاعت کی رغبت پیدا ہوگی اور اسی کے ساتھ معصیت سے نفرت بڑھتی جائے گی۔"

اس تقریر کے بعد حضرت نے صاحبزادوں کو اذکار کی تلقین فرمائی۔

حضرت علامہ کشمیری کی طرف رجوع

حضرت شیخ الہند علیہ الرحمۃ مالٹا سے واپسی کے بعد صرف چھ ماہ زندہ رہے اس کے بعد آپ کا انتقال ہوگیا حضرت قاری صاحب ابھی راہ سلوک کی ابتدائی منزل میں تھے۔ دیوبند میں حضرت علامہ کشمیری کی ذات سے آپ کو غایت عقیدت تھی حضرت کشمیری کا مقام تصوف واحسان کی راہ میں بہت بھی بہت بلند تھا حضرت گنگوہی سے آپ کو اجازت بیعت حاصل تھی۔

حضرت شیخ الہند علیہ الرحمۃ کی وفات کے بعد حضرت قاری صاحب نے حضرت کشمیری کی طرف رجوع کیا اصلاح اور تعلیم کا تعلق حضرت کشمیری سے رہا لیکن یہ سلسلہ اس وقت ختم ہوگیا جب حضرت علامہ کشمیری دیوبند چھوڑ کر ڈابھیل تشریف لے گئے۔

حضرت تھانوی سے تعلق

جماعت دیوبند میں حضرت تھانوی کا علم و فضل اور سلوک ومعرفت میں ان کا جو مقام ہے نیز آپ کی جو اصلاحی خدمات ہیں ان سے بچہ بچہ واقف ہے اللہ نے ان کو اپنے زمانہ کا اصلاح معاشرہ کے اعتبار سے ابن تیمیہ بنایا تھا۔ تصوف میں وہ ابن عربی تھے کثرت تصانیف میں وہ ابن جوزی اور سیوطی تھے تفسیر میں ان کا مقام قدمائے مفسرین کے درجہ کا تھا۔ وعظ میں وہ اپنے زمانہ کے شیخ جیلانی تھے اللہ نے ان کو جو مقبولیت عامہ مرحمت فرمائی تھی بہت کم لوگ اس سے بہرہ ور ہوئے ہیں اللہ نے آپ سے اصلاح معاشرہ کا بھی زبردست کام لیا۔ آپ کی تصانیف چہار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی ہیں اور ایک ایک کتاب کے کئی کئی اڈیشن نکلے ہیں اور نکلتے چلے جارہے ہیں اسلام کی تاریخ میں ایسے مقبول مصنف بہت کم گذرے ہیں آپ کی ہر کتاب سنت وبدعت اور حق وباطل میں خط امتیاز پیدا کرتی ہے۔ تصوف کے رموز واشارات اور اس کے حقائق ودقائق اس کی غرض وغایت کا بیان جتنی تفصیل اور جس عمدگی سے آپ کے یہاں ملتا ہے اس کا نشان متقدمین صوفیا میں بھی کم نظر آتا ہے۔

تھانہ بھون کی خانقاہ اپنے زمانہ میں ہندوستان کی سب سے مشہور خانقاہ تھی جس کی طرف عوام سے زیادہ خواص کا رجوع تھا اور جو جہلاء سے زیادہ علماء کی تربیت گاہ تھی بڑے بڑے جلیل القدر مشاہیر علماء اس خانقاہ سے متعلق تھے اور یہاں سے سب کی اصلاح ہوتی تھی تربیت واصلاح کا کام جتنا اس خانقاہ سے ہوا بہت کم خانقاہیں ہوں گی جس میں اتنا کام ہوا ہو۔

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ کو ضرورت محسوس ہورہی تھی کہ آپ ابھی کسی شیخ کامل کی تربیت میں رہیں۔ خانقاہ تھانہ بھون اور حضرت تھانوی کی ذات نگاہ کا مرکز بنی ہوئی تھی چنانچہ آپ نے تھانہ بھون جاکر اپنا تعلق

حضرت تھانوی سے قائم کرلیا اور حضرت کی تربیت میں رہ کر سلوک و معرفت کے مقامات طے کرنے شروع کئے۔

حضرت تھانوی کی توجہ اور شفقت

حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کیلئے قاری صاحب بمنزلہ اولاد کے تھے خاندانی تعلق کے ساتھ آپ کا حضرت نانوتوی کی اولاد میں سے ہونا ہی اسی کے لئے کافی تھا کہ حضرت تھانوی آپکو اپنے دامن محبت و شفقت میں لے لیں۔ چنانچہ تھانہ بھون کے زمانہ قیام میں آپ حضرت تھانوی ہی کے مہمان ہوئے اور آپ کے لئے خانقاہ کے اصول و ضوابط کی پابندی نہیں تھی۔ پہلی حاضری کے موقع پر حضرت تھانوی کے ایماء وارشاد پر آپ نے تراویح میں دس دن میں خانقاہ کی مسجد میں پورا قرآن بھی سنایا آپ کی تلاوت کلام پاک کا اثر نیز تجوید و قرأت کے قواعد کی رعایت کرتے ہوا الفاظ قرآنیہ کی ادائیگی پھر حسن وصوت اور آپ کی گراں قدر شخصیت حضرت تھانوی کا آپ کے ساتھ خصوصی معاملہ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ نماز تراویح خانقاہ کی مسجد کیلئے ایک تاریخی تراویح بن گئی اور آپ کا قرآن سننے کیلئے اتنا ہجوم ہوا کہ خانقاہ کی مسجد ناکافی ہوگئی۔

اس پہلی حاضری ہی میں حضرت نے آپ کو بیعت کرلیا اور اذکار کی تلقین فرمائی۔

شرف خلافت

حضرت تھانوی کی تربیت میں آپ منازل سلوک طے کرتے رہے اور آپ کی روحانی زندگی میں جلا پیدا ہوتا رہا خود طبیعت بھی بڑی نیک پائی تھی اخلاق حسنہ سے ابتداء بچپن ہی سے متصف تھے۔ اس وجہ سے آپ تصوف و احسان کی راہ میں بڑی تیزی سے آگے بڑھتے چلے گئے۔ لوگ بڑی ریاضت و مجاہدہ کے بعد جو چیز پاتے ہیں آپ کے اندر وہ بہت جلد پیدا ہوگئی اور آپ حضرت تھانوی کی نگاہ میں اس لائق ہوگئے کہ آپ کو خرقہ خلافت پہنا دیا جائے۔ چنانچہ حضرت تھانوی نے آپ کو مندرجہ ذیل تحریر کا خط لکھا اور آپ کو خلافت کے شرف سے نوازا تحریر یہ ہے۔

بے ساختہ میرے دل پر وارد ہوا ہے کہ میں تجھے خلافت دوں اس لئے میں تمکو خلافت دیتا ہوں جو کوئی بہ نیت اصلاح و تربیت آئے اسے توبہ کرادیا کرو اور مشائخ کے معمولات تلقین کردیا کرو اصلاحی باتیں پوچھے بتادیا کرو اور جو کوئی بیعت ہونا چاہے اسے بیعت کرلیا کرو یہ تمہارے لئے بھی نافع ہوگا اور مستفیدین کیلئے بھی"۔

حضرت قاری صاحب نے اس کے بعد لوگوں کو بیعت کرنا شروع کیا۔

حلقہ بیعت وارشاد

اللہ نے قاری صاحب کو اس راہ میں بھی اپنی رحمت و فضل سے نوازا تھا اور آپ کے ذریعہ بے شمار لوگوں کی اصلاح ہوئی اور ان کی ایمانی و روحانی و احسانی زندگی میں انقلاب پیدا ہوا۔ اور ہزاروں کی بگڑی زندگی سنور گئی کتنے لوگ آپ کے دست حق پرست پر حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ آپ کا حلقہ بیعت وارشاد ہندوستان سے نکلکر دوسرے بلاد و ممالک تک پہونچا اور بہت سے لوگوں کو آپ نے اجازت بھی دی۔

تصوف ہے کیا؟

اخیر میں اس سلسلہ کو ختم کرتے ہوئے ایک بات اور عرض کروں کہ کچھ لوگوں کو تصوف کے نام سے چڑھ ہے یہ لوگ اسے جاہلیت قدیمہ کی ایک شاخ سمجھتے ہیں اور اہل تصوف پر ان کی تنقید بڑی شدید ہوتی ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کچھ لوگوں نے تصوف کے نام پر دین اسلام کو بدنام کیا ہے۔ اور انہوں نے اس کو معاش اور دنیا کمانے کا ذریعہ بنا رکھا ہے ان کے نزدیک تصوف صرف چند اعمال مخصوصہ کا نام ہے۔ لیکن محض اس وجہ سے تصوف سے چڑھنا، صوفیاء سے بغض رکھنا اور اہل حق کی شان میں بدزبانی کرنا یہ انصاف پسند انسان کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ مسلمان کی بگڑی ہوئی حالت کو دیکھ کر کوئی اسلام ہی سے نفرت کرے یہ کہاں کا انصاف ہے علماء سوء کی زندگی کو دیکھ کر کسی کو علم دین ہی سے نفرت ہو یہ کون سی عقل کی بات ہے اسی طرح بعض دنیا پرست صوفیوں کو دیکھ کر تصوف ہی سے انکار کر دیا جائے اور صوفیاء حق کی خدمت میں اپنی زبان و قلم کا استعمال کیا جائے یہ انصاف کا تقاضا نہیں ہے۔

تصوف کی حقیقت بس اتنی ہے کہ انسان میں اصلاح نیت کے ساتھ احسانی کیفیت پیدا ہو اور اخلاق ذمیمہ سے وہ پاک ہو اور اخلاق کریمانہ اس کی زندگی میں جلوہ گر ہوں اور شریعت کے احکام پر عمل کرنا اس کے لئے آسان ہو یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ انسان کو کسی شیخ کامل کی صحبت ملے اور وہ ان کی تربیت میں رہ کر عملی زندگی کی مشق بہم پہونچائے۔ اصلاح ظاہر کے ساتھ ساتھ اصلاح باطن رسولوں کی زندگی کا مشن رہا ہے خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد بھی تعلیم کتاب اور تزکیہ باطن تھا۔ قرآن کا ارشاد ہے۔

هو الذی بعث فی الامیین رسولاً منهم یتلوا علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة

اللہ نے امیوں میں انہیں میں کا ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیات کی تلاوت کرتا ہے ان کے باطن کی اصلاح کرتا اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

آنحضورؐ کا ارشاد تھا بعثت لاتمم مکارم الاخلاق یعنی میری بعثت اخلاق شریفانہ کو کمال کے درجہ تک پہونچانے کے لئے ہے۔

احسانی کیفیت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی میں ایسا روحانی انقلاب پیدا ہو جائے کہ اللہ کی ذات کا استحضار ہر وقت اس کے قلب میں رہے ہر کام میں اللہ کو یاد رکھے اور سمجھے کہ اس کا ہر ہر عمل اللہ کے علم میں آرہا ہے اسی بات کو آنحضور نے اپنے اس ارشاد میں ظاہر فرمایا ہے کہ احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی اس طرح عبادت کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو اور اگر یہ کیفیت نہ پیدا ہو تو کم از کم تم کو اس کا خیال ہونا چاہیئے کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔

تصوف کی غایت و انتہا بس اسی احسانی کیفیت کو پیدا کرنا ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ کسی بھی کیفیت کا پیدا کرنا اور اس کو پھر ملکہ بنانا یعنی اس کیفیت کو کیفیت راسخہ میں تبدیل کر دینا یہ کچھ آسان کام نہیں ہے اس کیلئے کسی صاحب نسبت شیخ کامل کی ضرورت ہوگی جس کی تربیت میں رہ کر اس کی عملی زندگی کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کیفیت پیدا کی جائے اس کے لئے کچھ ذکر و اذکار ہیں کچھ اعمال ہیں جن کا ماخذ قرآن و حدیث ہی ہیں اس موقع

پر ایک دفعہ پھر شیخ الہند علیہ الرحمۃ کی ان گراں قدر نصیحتوں کو پڑھ لیا جائے جو کو حضرت قاری صاحب اور ان کے برادر خورد حضرت مولانا محمد طاہر صاحب سے آپ نے فرمائی تھیں ۔

منصب اہتمام پر"

دار العلوم کا منصب اہتمام ہمیشہ بڑا باوقار رہا ہے اس منصب پر جو حضرات رہے ہیں وہ اپنے وقت کی یادگار و نابغہ روزگار شخصیتوں میں سے تھے دار العلوم کے مہتمین کی فہرست میں حضرت حاجی عابد حسین صاحب حضرت مولانا رفیع الدین صاحب حضرت مولانا حافظ احمد صاحب اور حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہم اللہ جیسے لوگ ہیں ان میں کا ہر فرد علم و فضل اور تقویٰ و امانت میں آفتاب و ماہتاب تھا ان کی زندگی ہر اعتبار سے اسوۂ نمونہ تھی ۔

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد حضرت حافظ احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ دار العلوم کے مہتمم رہے اور نائب مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانیؒ تھے ۔

۱۳۴۲ھ میں حضرت قاری صاحب کو آپ کے والد صاحب کا قائم مقام کر دیا گیا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ضعف اور کمزوری کی وجہ سے اہتمام کا کام پورے طور پر نہیں کر پا رہے تھے نیز اسی زمانہ میں دار العلوم میں ایک شورش بھی اٹھی تھی اس کا بھی تقاضا تھا کہ کوئی معتدل اور لطیف اور نرم مزاج کا آدمی ہو جس سے یہ شورش زیادہ بڑھنے نہ پائے اس لئے اکابر کی نظر انتخاب آپ پر پڑی ۔

حضرت حافظ احمد صاحب کے انتقال کے بعد حضرت عثمانی مہتمم ہو گئے اور آپ نیابت اہتمام پر رہے حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی کے انتقال کے بعد آپ نے اہتمام کے منصب کو سنبھالا اور مسلسل ۱۴۰۱ھ تک اس عہدہ کو زینت بخشی ۔

اس طرح حضرت قاری صاحب علیہ الرحمۃ نے نصف صدی سے زیادہ تک دار العلوم کی کشتی کی ناخدائی کی دار العلوم کی پوری تاریخ میں آپ کے دور اہتمام کی سب سے طویل مدت ہے ۔

حضرت قاری صاحب کے دور اہتمام میں دار العلوم کی ترقی

جیسا کہ عرض کیا گیا قاری صاحب نے نصف صدی سے زائد تک منصب اہتمام کو زینت بخشا ۔ آپ کے دور میں دار العلوم میں ہر اعتبار سے ترقی ہوئی ۔ عمارات کا طویل سلسلہ قائم ہوا ۔ طبیہ کالج کا قیام عمل میں آیا ۔ طلبہ کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہوتا رہا ۔ مدرسین کا اضافہ ہوا اسٹاف کی تعداد تقریباً ڈھائی سو افراد پر مشتمل رہی ۔ دار العلوم کا سالانہ میزانیہ ۴۵ لاکھ روپیہ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دار العلوم کا عالمی تعارف ہوا ۔ غیر ممالک سے طلبہ کی آمد ہوئی اور دار العلوم کے طلبہ پوری دنیا میں پھیل گئے ۔ ہند اور بیرون ہند کی عالمی شخصیتیں دار العلوم میں آئیں غرض مادی و معنوی ہر اعتبار سے دار العلوم بام عروج کو پہنچا ۔ ہزاروں کی تعداد میں دار العلوم سے فضلا نکلے مصنفین، واعظین اور مبلغین کی کھیپ

کی کھیپ تیار ہوئی۔

قاری صاحب کی انتظامی صلاحیت

اہتمام کی اس پوری مدت میں دارالعلوم میں جو گوناگوں ترقیاں ہوئی ہیں ان سے قاری صاحب کی انتظامی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔ دارالعلوم ہندوستان کا غالباً واحد مدرسہ ہے جس کو مالیات کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور جب کبھی اس قسم کی بات پیدا بھی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے غیب سے اس کا سامان بھی کر دیا۔ قاری صاحب کا خاص وصف یہ تھا کہ آپ نے دارالعلوم کی پوری مشین کو اس طرح متحرک رکھا کہ اس کے کسی پرزہ کو آپ سے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ قاری صاحب کو اللہ نے یہ صلاحیت دی تھی کہ دارالعلوم کے اتنے بڑے اسٹاف کو اپنے ساتھ لیکر بڑے سکون سے چلتے رہے آخر کا زمانہ ذرا شورش کا زمانہ تھا ورنہ تقریباً نصف صدی تک دارالعلوم کی کشتی کو قاری صاحب نے بڑی کامیابی سے آگے بڑھایا۔ مختلف مزاج لوگوں کو ساتھ لیکر چلنا کوئی آسان کام نہیں ہے اس کام کو قاری صاحب نے اپنی خداداد صلاحیت سے بہت خوبی سے انجام دیا۔ ہر ایک کی رعایت، سب کا خیال عفو و درگذر اور امانت و دیانت آپ کے یہ اوصاف تھے جن کی وجہ سے آپ کا دورِ اہتمام بڑا کامیاب گذرا اور دارالعلوم شاہراہِ ترقی کی طرف گامزن رہا۔

آپ اپنے اسٹاف پر کامل اعتماد فرماتے تھے۔ یہی اعتماد تھا جس نے دارالعلوم کو ترقی کی راہ پر لگایا۔ البتہ اس کا افسوس ہے کہ بعض لوگوں نے اس اعتماد سے بہت غلط فائدہ اٹھایا اور اس غلط کاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت قاری صاحب کی شخصیت بھی مجروح ہوئی اور دارالعلوم کا وقار بھی مجروح ہوا۔ یہ وہ زخم ہے جس کا اندمال تا عمر نہ ہو سکے گا۔

قاری صاحب کا معاملہ طلبہ و مدرسین کے ساتھ

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرسین اور طلبہ سب کے ساتھ اکرام اور احترام کا معاملہ فرماتے۔ طلبہ اور مدرسین کی شکایت کو حتی الامکان رفع کرتے اور ان کی واقعی ضرورتوں کو پورا کرنے میں کبھی لیت و لعل سے کام نہ لیتے۔ کسی کو گرانا اور کسی کو اٹھانا یہ تو آپ جانتے ہی نہ تھے مدرسین کے ساتھ آپ کا معاملہ بزرگانہ ہوتا حاکمانہ نہیں۔ آپ فرماتے کام رابطہ سے ہوا کرتا ہے ضابطہ سے نہیں۔ ضابطہ کی کارروائی سے کام کرنے والا صرف خانہ پُری کرتا ہے۔ دل کے لگاؤ سے کام تو رابطہ ہی سے ہوتا ہے اس لئے ملازمین اور مدرسین کے ساتھ آپکا سلوک ہوتا نہ کہ حاکمانہ اور آمرانہ، دارالعلوم عظیم یونیورسٹی کا مہتمم مگر ذرا بھی آپ میں شانِ آمریت نہ تھی۔

طلبہ کیساتھ آپکا معاملہ شفقت و محبت کا ہوتا ایسی شفقت و محبت جسکی مثال اور کہیں نہیں ملتی، آپ زجر و توبیخ کے قائل نہیں تھے بلکہ طلبہ کی اصلاح اپنے مشفقانہ وعظ و نصیحت سے کرتے انکے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے کہ انکے اندر خود اطاعت اور امتثالِ امر کا جذبہ پیدا ہو جاتا۔

طلبہ کے ساتھ آپ کا معاملہ جس شفقت و محبت کا تھا اس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعہ سے ہوگا۔

میرا دور طالب علمی تھا۔ دارالعلوم کے عربی سبعہ میں زیر تعلیم تھا اس سبعہ کو عربی انجمن کا سالانہ اجلاس تھا میں اس کا صدر استقبالیہ تھا۔ دستور کے مطابق اجلاس کے بعد شعبہ عربی سے متعلق طلبہ کی دعوت کا نظم تھا۔ اسی کے لئے چالیس کلو شکر کی ضرورت تھی۔ ہم اپنی درخواست لیکر نائب مہتمم صاحب کے پاس گئے۔ انہوں نے انکار کر دیا کہ دارالعلوم کے اسٹاک سے اتنی شکر نہیں مل سکتی ہمارے ساتھی مایوس تھے میں نے ان سے کہا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے شکر ملے گی اور میں اپنے ساتھیوں کو لیکر دفتر اہتمام حضرت قاری صاحب کی خدمت میں پہونچ گیا۔ قاری صاحب کچھ لکھ رہے تھے جب ہماری طرف متوجہ ہوئے ہم نے درخواست بڑھادی حضرت قاری صاحب نے اسکو پڑھا اور فرمایا کہ آپ کو ضرور شکر ملے گی اور آپ نے بلاتکلف فوراً آڈر کر دیا اور ہمیں شکر مل گئی۔

حضرت قاری صاحب کی شفقت کا ایک اور واقعہ یاد آیا۔

النادی کا جلسہ تھا میرے ایک بجنور کے ساتھی مولوی اسرار بشر کوٹی تھے ذرا منچلے قسم کے تھے شرارت کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا حضرت مولٰنا وحیدالزماں صاحب صدر شعبہ عربی ان سے کبیدہ خاطر تھے مولوی اسرار نے مجھ سے کہا کہ میں اس جلسہ میں تقریر کرنا چاہتا ہوں مگر حضرت مولانا کیرانوی صاحب اجازت نہیں دے رہے ہیں میں نے کہا کہ اس لئے اجازت نہیں دے رہے ہیں کہ نہ معلوم تم کیا تقریر کرو انہوں نے کہا کہ میں ایک اصلاحی تقریر کروں گا میں نے ان سے کہا کہ تم تقریر مجھے دکھلاؤ انہوں نے مجھے تقریر دکھلائی اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہ تھی، حضرت مولانا وحیدالزماں صاحب سے سفارش کی گئی اور انہوں نے انکو تقریر کرنے کی اجازت دے دی النادی کا یہ سالانہ جلسہ تھا اساتذہ اور نائب مہتمم اور دوسرے ذمہ داران بھی تھے۔ جب مولانا اسرار نے تقریر شروع کی تو یہ بالکل دوسری تقریر تھی جو انہوں نے مجھے دکھلائی تھی اس تقریر میں اہتمام اور اساتذہ کے اوپر تنقید تھی اور اس بات کا اظہار تھا کہ اساتذہ اور اہتمام اپنی ذمہ داریوں کو پوری نہیں کرتے اور ان میں فلاں فلاں کمزوریاں ہیں۔

مولانا وحیدالزماں صاحب ذمہ دار جلسہ ہونے کی وجہ سے پریشان ہملوگ بھی نادم اور مولانا اسرار تقریر کرنے چلے جارہے ہیں جلسہ ختم ہوا صبح تک بات اہتمام تک پہونچی کہ النادی کے جلسہ میں اہتمام اور مدرسین پر تنقید کی گئی ہے حضرت مولانا وحیدالزماں صاحب کو بلایا گیا مولانا نے حضرت قاری صاحب سے فرمایا کہ ٹیپ موجود ہے آپ سن لیں کہ وہ تقریر کیا ہے حضرت قاری صاحب نے ٹیپ منگوایا اور تقریر سنی، تقریر سن رہے تھے اور مسکرا رہے تھے زبان صاف وشستہ تقریر رواں دواں بے تکلف عربی قاری صاحب اس تقریر میں محو ہو گئے جب تقریر ختم ہوئی تو قاری صاحب نے حضرت مولانا معراج احمد صاحب سے فرمایا کہ مولٰنا اس طالب علم نے ہمارے فرائض ہم کو یاد دلائے ہیں ہماری کوتاہیاں ہمیں بتلائی ہیں ہمکو چاہیے کہ ہم اپنے فرائض انجام دیں اپنی کوتاہیوں کی تلافی کریں اور معاملہ ختم ہو گیا۔

قاری صاحب کی پوری زندگی اسی طرح کی شفقت اور عفو و درگذر کا نمونہ تھی اور اسی چیز نے آپ کو سب کا

محبوب بنا دیا تھا اور آپ کا دورِ اہتمام نہایت شاندار گذرا۔

قاری صاحب کے بعض امتیازی اوصاف

حضرت قاری صاحب کی پوری زندگی اوصاف حسنہ اور اخلاق عالیہ اور کمالات علمیہ کی نمونہ تھی۔ لیکن بعض اوصاف آپ میں بہت نمایاں تھے مثلاً خلقی اوصاف میں سے آپ میں تواضع وعلم کا وصف بہت غالب تھا آپ حد درجہ متواضع غایت درجہ متین اور منکسر المزاج تھے۔ آپ میں تعلی اور تجبر نام کی کوئی چیز نہیں تھی آپ کا معاملہ چھوٹوں اور بڑوں سب کے ساتھ تواضع اور انکساری کا تھا آپ کو خاندانی عظمت بھی حاصل تھی دارالعلوم کے عہدہ اہتمام پر بھی آپ تھے آپ صف علماء میں ایک ممتاز شخصیت کے حامل تھے مگر ان سب کے باوجود آپ مجسم تواضع اور سراپا انکسار تھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تواضع وانکساری کی خاک سے آپ کا خمیر تیار ہوا تھا تواضع کی یہ شان نشست وبرخاست بات چیت کھانے پینے ہر چیز میں نمایاں تھی۔

عفو وحلم

اسی طرح آپ حد درجہ حلیم وبردبار تھے کوئی بات کتنی بھی خلاف مزاج کیوں نہ ہو آپ کو کبھی مشتعل ہوتے نہیں دیکھا میں نے دارالعلوم میں تین سال گذارے ہیں فراغت کے بعد بھی متعدد مجلسوں میں قاری صاحب کو دیکھا ہے۔ مگر مجھے یاد نہیں آتا کہ آپکو کبھی غصہ ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہو۔

قاری صاحب کے حلم وشفقت کی ایک مثال عرض کرتا ہوں میں دارالعلوم کا طالب علم تھا میری طبیعت میں تیزی ہے تیز چلنا، تیز کھانا، تیز کام کرنا یہ عادت ہے۔ میں دارالعلوم میں دفتر کمرہ نمبر ۳ میں رہتا تھا میرے کمرہ کا راستہ وہی تھا جس سے گذر کر قاری صاحب سیڑھیوں کو طے کرتے ہوئے دفتر اہتمام تشریف لے جاتے تھے ایک دفعہ میں بڑی تیزی کے ساتھ اوپر سے نیچے آرہا تھا۔ اتفاق سے قاری صاحب دفتر اہتمام تشریف لے جارہے تھے میں چونکہ بڑی تیزی میں تھا اس لئے اپنے کو قابو نہ رکھ سکا اور قاری صاحب سے ٹکرا گیا۔ حضرت قاری صاحب اس ٹکر سے دو سیڑھی نیچے آگئے اور گرتے گرتے سنبھل گئے میں اپنا ہوش وحواس گم کئے ہوئے کھڑا رہا کہ نہ معلوم اب کیا ہو۔ لیکن دیکھتا کیا ہوں حضرت قاری صاحب فرما رہے ہیں کہ مولینا آپ کو چوٹ تو نہیں آئی؟ اور پھر آپ بلا کچھ کہے ہوئے دفتر اہتمام تشریف لیگئے۔

میں تو قاری صاحب علیہ الرحمۃ کی اس ادا پر مرشانہ ڈانٹ نہ ڈپٹ کچھ بھی نہیں بلکہ مجھسے خود پوچھا جارہا ہے کہ چوٹ تو نہیں آئی ہائے اب ہم کہاں ڈھونڈیں ایسے پیکر حلم وتواضع کو جس کی زندگی کا ہر نقش جاودانی ہے اور شان عبودیت ورحمت کی جلوہ گری سے بھرپور۔

چھوٹوں کے ساتھ مشفقانہ برتاؤ

حضرت قاری صاحب علیہ الرحمۃ اپنے خوردوں کی ہمیشہ علمی ودینی سلسلہ میں مشفقانہ انداز میں حوصلہ افزائی فرماتے رہتے اگر ان سے مشورہ لیا جاتا تو ان کو خیر خواہانہ مشورہ دیتے اور ان کے علمی وادبی کام سے مسرور ہوتے انکی پریشانیوں پر رنج وافسوس کرتے اور ان کے بس میں جو ہوتا وہ ان کیلئے کر گذرتے اس کا اندازہ ان کو ہوگا جن کو

اس طرح کا کوئی سابقہ پیش آیا ہے۔ مجھے ایک دفعہ خیال ہوا کہ اپنے اکابر کا تذکرہ عربی زبان میں مقالات کی شکل میں جمع کر دیا جائے یہ خیال مجھے مصر کے احمد امین کی کتاب رجال الاصلاح فی العصر الحدیث پڑھ کر پیدا ہوا تھا۔ میں نے حضرت قاری صاحب علیہ الرحمۃ کو مشورہ اور راہنمائی کیلئے خط میں لکھا قاری صاحب نے میرے اس خیال کی تائید کی اور مفصل انداز میں طریقہ کار کا ابتدائی خاکہ بھی خط میں لکھ بھیجا اور لکھا۔

آپ کے اس عزم سے بڑی مسرت ہوئی یہ امر آپ کے قلب میں اللہ کی طرف سے الہام کیا گیا ہے۔

حضرت قاری صاحب علیہ الرحمۃ کا یہ خط پڑھ کر میرے اندر عمل کی طاقت پیدا ہو گئی اور میں نے بہت کم مدت میں حضرت گنگوہی، حضرت نانوتوی، حضرت تھانوی اور حضرت مدنی پر چار مقالے تیار کر لئے لیکن حضرت نانوتوی پر جو مقالہ تیار ہوا وہ اس قدر طویل ہو گیا کہ اس کو الگ ایک مستقل کتاب بنا دیا گیا اور پھر اسی کی تہذیب و ترتیب میں اتنا وقت لگ گیا کہ بقیہ چھ مزید اکابر جن پر کام کرنا تھا ان پر اب تک کچھ نہ لکھ سکا اگرچہ اب بھی اس کا خیال دل سے گیا نہیں ہے۔

حضرت گنگوہی پر جو مقالہ تیار ہوا اس کا مسودہ حضرت قاری صاحب کو بھیجا تو آپ نے پسندیدگی ظاہر کرتے ہوئے کچھ مفید مشورے دئے۔ اپنے خط میں لکھتے ہیں۔

پسند آیا ترتیب مناسب ہے۔ عنوانات کی کثرت سے مضمون پھیلانے میں سہولت ہو گی۔ عربیت کے بارے میں میری رائے کیا ہو سکتی ہے البتہ اگر واقعات کے حوالے بھی لکھ دیا جائے تو بہتر ہوتا۔ آج کل اس کی بڑی قیمت ہے۔"

یہ خط طویل ہے اور حسب عادت قاری صاحب نے مفید مشوروں سے نوازا ہے۔

مولانا ظفیر الدین صاحب مرتب فتاوے دار العلوم فتاوی کی ترتیب میں جب لگے ہوئے تھے اور اس کی پہلی جلد جب مکمل ہو گئی تو یہ مسئلہ سامنے آیا کہ ٹائیٹل پر مرتب فتاوے کا نام آنا چاہیئے کہ نہیں بعض لوگ اس کے خلاف تھے۔ اس خلاف کی وجہ جو بھی رہی تھی بہرحال یہ نامناسب بات حضرت قاری صاحب کو اس کی اطلاع دی گئی قاری صاحب نے پاکستان سے مولانا ظفیر صاحب کو خط لکھا۔

"فتاوے دار العلوم کے سلسلہ میں ٹائیٹل پر بحیثیت مرتب فتاوی آپ کا اسم گرامی آنا میرے خیال میں قابل اعتراض نہ ہونا چاہیے بلکہ حق پسندی کا تقاضا یہی ہے کہ یہ نام آنا آپ کا حق ہے جبکہ اول سے آخر تک محنت آپ کی ہے احقر کی رائے آپ کے گرامی نامہ کے بعد یہی ہے کہ نام کی تصریح ضروری ہی چاہیے۔"

پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹی نے جب سوانح قاسمی انوار قاسمی کے نام سے دو جلدوں میں مرتب کی اور قاری صاحب کو اس کی اطلاع ہوئی تو انتہائی مسرت کے عالم میں ان کو لکھتے ہیں۔

انوار قاسمی کی دو جلدوں کی خوشخبری سے غیر معمولی انبساط و سرور دل میں موجزن ہے۔ پہلی جلد کے بہت

سے پروف جناب ارسال فرما چکے ہیں جن سے میں مستفید ہو چکا ہوں لیکن اب بے چینی کے ساتھ انتظار مکمل جلد کا ہے باقی ماندہ پروف کا نہیں۔

حوصلہ افزائی، قدر افزائی اور اصاغر کے کاموں پر اظہار مسرت حضرت قاری صاحب علیہ الرحمۃ کی طبیعت تھی جس سے کام کرنے والے کی طبیعت بڑھتی اور کھلتی تھی اور حضرت علیہ الرحمۃ کے چند کلمات ہمت افزا، میدان عمل میں جوش و خروش کے ساتھ لگ جانے کے لئے مہمیز کا کام دیتے تھے، بڑوں کے انہیں ہمت افزا کلمات سے چھوٹے کام میں لگتے ہیں۔ ہمارے اکابر دیوبند علیہم الرحمۃ کی یہی شان تھی جو افسوس اب بہت کم نظر آتی ہے۔

رواداری

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں رواداری کا معاملہ بھی بہت تھا۔ تعلقات کو نباہنا آپ خوب جانتے تھے اور حتی الامکان اس کو باقی رکھتے۔ دارالعلوم کے ملازمین و مدرسین کے ساتھ آپ کا معاملہ اسی رواداری کا تھا اور یہی وجہ ہے کہ آپ ملازمین کی کمزوریوں سے اغماض بھی کرجاتے اور ان کی اصلاح دوسرے طریقہ سے کرتے مگر دوسرے لوگ قاری صاحب کی اس رواداری سے غلط فائدہ بھی اٹھاتے اور مسلسل اٹھاتے جس کا علم کبھی قاری صاحب کو قطعاً نہ ہوتا۔

یہ صحیح ہے کہ انتظامی امور میں بہت زیادہ رواداری درست نہیں۔ جمالِ صدیقی کے ساتھ جلالِ فاروقی بھی چاہئے اور صرف رواداری یہ انسان کا کبھی ضعف بھی کہلاتا ہے مگر عادت اور طبیعت جو چیز بن جائے اس کا بدلنا آسان نہیں ہے۔ قاری صاحب کی رواداری کی صفت بطور عادت اور طبیعت کے تھی اس وجہ سے آپ شدت اور سختی اور درشتی کا معاملہ کم کرپاتے تھے بلکہ نہیں کرپاتے تھے

حفظِ لسان

حضرت قاری صاحب کے اندر جو اللہ نے ایک بڑی صفت رکھی تھی وہ حفظِ لسان کی تھی۔ آپ کی مجلس میں دوسروں کی غیبت، دوسروں کے عیوب کا ذکر، دوسروں کی برائی قطعاً نہیں ہوتی۔ قاری صاحب کے ساتھ رہنے اور ان کے ساتھ کام کرنے والے شہادت دیں گے کہ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس سے پاکیزہ اور پُرنور انہوں نے دوسری مجلس دیکھی نہ ہوگی۔ یہ خاص صفت آپ میں اتنی نمایاں تھی کہ ڈھونڈھنے سے اس کی مثال اس زمانہ میں کہیں اور نہیں ملتی ہے۔

آج بڑے بڑے علماء و صلحاء کی مجلس میں بیٹھو ان کی صحبت میں رہو تھوڑی دیر کے بعد طبیعت اکتا جاتی ہے اس لئے کہ حاشیہ نشین قسم کے لوگ اپنا سب سے بڑا کارنامہ یہی سمجھتے ہیں کہ اپنے اندر کی گندگیاں زبان کے راستے سے دوسرے کے کانوں میں انڈیلتے رہیں اور صاحبِ مجلس بھی مزہ لیتا ہے۔ کچھ لوگ صرف اپنا ہی ذکرِ خیر سننا پسند کرتے ہیں۔ دوسروں کی ذات میں ان کو عیوب ہی نظر آتے ہیں ان کے سامنے دوسروں کی برائی کی جائے تو ان کو بڑا حظ آتا ہے۔

حضرت قاری صاحب کی ذات گرامی ان کمزوریوں سے بلند و بالا تھی حفظ اللسان کے قول نبوی پر آپ کا پورا عمل تھا نہ خود آپ کسی کی برائی کرتے نہ دوسروں کی ہمت ہوتی کہ آپ کی مجلس میں کسی کا ذکر برے الفاظ سے کرے۔ خود آپ کا عمل اور آپ کا رعب اس سے مانع ہوتا۔ جب کبھی اس قسم کی بات پیدا بھی ہوتی تو آپ یا تو اس کو روک دیتے یا اس بات کی کوئی اچھی تاویل کر دیتے۔

بہرحال حفظ لسان کی یہ صفت کامل و اکمل درجہ میں میرے علم کی حد تک اس وقت جتنی قاری صاحب میں تھی اس کی مثال دوسری جگہ نہیں ملتی۔

قاری صاحب کی مجلس

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہر مجلس بڑی پاکیزہ اور علمی و ادبی ہوتی بزرگوں کے واقعات علم و حکمت کی باتیں، کتاب و سنت کے اسرار و حکم مسلمانوں کی ترقی و زبوں حالی کے تذکرے۔ اصلاح نفس کی باتیں، حالات حاضرہ پر حکیمانہ و مبصرانہ تبصرہ مدارس عربیہ کا ذکر عالم اسلام میں پیش آنے والے واقعات اور ان کے واقعات کے علل و اسباب ان کا پس منظر سلوک و تصوف کے رموز، عالم اسلام کی شخصیتوں کا ذکر دارالعلوم کی ترقیات کی فکر کی باتیں دارالعلوم کی خدمات اور بیرونی دنیا میں ان کا چرچا۔ جلسے و جلوس کی ہماہمی، سفر کے تجربات شعر و شاعری، ان گوناگوں موضوعات پر آپ کی مجالس مشتمل ہوتیں خصوصاً زمانہ قیام دیوبند میں عصر بعد کی آپ کی قیام گاہ پر جو مجلس ہوتی اس میں علم و حکمت کے موتی لٹائے جاتے مختلف سوالات کے جواب دیے جاتے طلبہ کے مختلف النوع اشکالات کا آپ فی الفور اور محققانہ اور شافی جواب دیتے اساتذہ و طلبہ کے علاوہ اس مجلس میں دوسرے لوگ بھی شریک ہوتے انگریزی داں بھی تاجر بھی عوام بھی اس مجلس میں ہر شخص کی رہبری ہوتی، اور ہر شخص اس مجلس کی لذت حاصل کرتا نرم لہجہ، مسکراہٹ لب پر دماغ ہمہ وقت حاضر حافظ میں معلومات کی ایک دنیا قرآن و حدیث پر گہری نظر جب آپ بولتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ ایک کوہ وقار ایک پیکر جمال ایک علامہ وقت بزم عرفانی و احسانی سجائے ہوئے ہے۔ اور علم کا ایک سمندر ہے جو جوش زن ہے نہ طبیعت گھبرائے نہ اکتاہٹ محسوس ہو بلکہ خواہش یہ ہو وہ کہا کریں اور سنا کرے کوئی

علمی و ادبی ذوق

حضرت قاری صاحب کا علمی و ادبی ذوق بہت بلند تھا علم و ادب ان کی طبیعت بن گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انکا ذہن ہر وقت علم و ادب کی کسی نہ کسی دشت پیمائی کرتا ہوتا آپ کی طبیعت بڑی ستھری اور صاف تھی علم کا ذوق بھی بڑا ستھرا تھا متقدمین اور صوفیاء اور اسلامی علماء اسرار و حکم کی کتابیں عموماً آپ کے مطالعہ میں رہتی تھیں آپ کی ہر گفتگو میں ان کتابوں کا نچوڑ سامنے آتا۔ متاخرین میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی اور اپنے جد امجد حضرت نانوتوی کی کتابوں سے خاص لگاؤ تھا۔

کتاب و سنت سے استدلال و استنباط

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر ہو یا تقریر اس میں کتاب و سنت سے استدلال و استنباط کثرت سے ہوا کرتا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا قرآن ان کے سامنے کھلا ہے اور احادیث کا سارا ذخیرہ ان کی نگاہوں میں ہے جس نے ان کی تقریر سنی ہے یا جنکو قاری صاحب کی کسی کتاب کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا ہے انہیں اس کا اندازہ ہوگا۔

پھر استنباط و استدلال بھی نہایت لطیف مضمون کی طوالت کے پیش نظر یہاں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ ہم اس کے دو ایک نمونے بھی پیش کریں اس کیلئے قاری صاحب کی خصوصیت کے ساتھ مندرجہ ذیل کتابیں دیکھنی چاہیں التشبہ فی الاسلام، اسلام کا اخلاقی نظام اسلام اور سائنس، معجزہ کیا ہے وغیرہ۔

شعر و شاعری

شاعری وہبی چیز ہے۔ مشق و تمرین سے اس میں جلا تو پیدا کیا جا سکتا ہے مگر جبتک طبیعت میں شعری ذوق نہ ہو شعر نہیں کہا جا سکتا بعض لوگ میں سخن سنجی اور سخن فہمی اعلےٰ درجہ کی ہوتی ہے وہ شعر کے حسن و خوبی کو اچھی طرح پرکھ سکتے ہیں ان کی زبان پر ہزاروں اشعار بھی ہوتے ہیں مگر شعر کہنا ان کے بس کا روگ نہیں ہوتا اور چونکہ شاعری وہبی اور فطری صفت ہے کسب و اکتساب سے اس کا تعلق نہیں اس وجہ سے وہ شعر جس میں آمد ہو اور وہ شعر جس میں آورد ہو دونوں میں صاف فرق محسوس کیا جا سکتا ہے پہلے میں بے تکلفی بے ساختگی ہوگی اور دوسرے میں تکلف نمایاں ہوگا جیسے زبردستی شعر کھینچکر اندر سے باہر لایا جا رہا ہو۔

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اگرچہ شعر و شاعری کو کبھی اپنا مشغلہ نہیں بنایا مگر آپ کی طبیعت میں شاعری کا ذوق تھا اور یہ ذوق بالکل فطری تھا اس وجہ سے جب آپ کی طبیعت اشعار کیطرف مائل ہوتی تو طویل نظمیں تھوڑے وقت میں تیار ہو جاتیں۔ شاعر کیلئے ضروری ہیکہ اس میں تاثر و انفعال کی کیفیت ہو وہ مناظر فطرت اور حوادث عالم سے متاثر ہو جب ہی اس کے اشعار میں کیف اور سوز و گداز پیدا ہوتا ہے اور برمانے اور تڑپانے والے اشعار اس کی زبان سے نکلتے ہیں۔

قاری صاحب کی طبیعت میں انفعال و تاثر کی پوری صفت موجود تھی وہ مناظر فطرت اور حادثات عالم سے متاثر ہونا جانتے تھے۔ رنج و غم اور کیف و سرور کی کیفیت ان میں پیدا ہوتی تھی، بلبل کے نغمے، کوئل کی کوکو، پانی کی روانی توس و قزح کی دلفریبیاں بادل کی گھن گرج، توپ کی آواز، گولوں کا دھماکہ تلوار کی چمک تیز دوں کی تھنک ظفریابی کی مسرت ناکامیابی کا رنج، صحرا کی وسعت، آبشار کا جوش، عالم کی نیرنگیاں ان سے قاری صاحب متاثر ہوتے تھے اس وجہ سے ان کا شعری ذوق بیدار و جوان رہتا تھا اور وہ جب چاہتے بلا تکلف شعر کہتے ایک ایک ردیف و قافیہ میں طویل نظمیں اور سیکڑوں شعر کہدینا یہ ان کے لئے معمولی بات تھی اگرچہ تمرین اور مشق نہ ہونے کیوجہ سے ان کے اشعار اساتذہ کے اشعار کی ٹکر کے نہیں ہیں مگر کچھ ایسے اشعار

ضرور ہیں جن میں استادانہ رنگ موجود ہے مثلاً یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے جو بالکل ابتدائی عمر کے ہیں۔

زبون اندر زبوں نے گھر بنایا ہے کہاں میرا
ثریٰ اپنی زمیں ہے اور زمیں ہے آسماں میرا
نہیں قسمت میں جن کی کشف میں وہ رند پنہاں ہوں
نہیں ہے بزم گردوں میں بھی کوئی راز داں میرا
میں وہ کشتی ہوں جس کا ناخدا آغوش طوفاں ہے
فضا کے تند جھونکوں پر چلا ہے بادباں میرا
اس عالم کے مرقع میں میں ایک تصویر باطل ہوں
سراب وہم کی موجوں میں ملتا ہے نشاں میرا
صدف ہوں پھر بھی ایک نایاب سا اس بحر ہستی کا
کہ صد چشمک زن لولو ہے اشک خوں چکاں میرا
میں موسیٰ بن کے گو منت کش طور تمنا ہوں!!
مگر کرتی ہے حرماں کی تجلی امتحاں میرا

اور ایک طویل نظم کا یہ دو شعر ملاحظہ فرمائیے۔

فکر درماں کر مداوائے دل ناکام کر!!!
بیٹھ مت رہ دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام کر!
گرچہ ہے تو خاک پر دامن صبا کا تھام کر
ایک بگولہ بن کے اٹھ اور فوق گردوں کام کر

اور اس نظم کا یہ بند کتنا زوردار ہے۔

تو سمجھتا ہے کہ درماں نام ہے آرام کا!!
کرب کے مٹنے کا زخم درد کے ابرام کا!
دیکھ آنکھوں سے پلٹنا چرخ نیلی فام کا!
کر نظارا دھر کے اک انقلاب عام کا
درد ہی ہے آج درماں اور ٹھنڈک سوز ہے
بے خودی ہی آج اک عقل ادب آموز ہے

کوثر العلوم کے نام سے قاری صاحب کی طویل نظم ہے اور حق یہ ہے کہ بڑے پایہ کی ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

خرام ناز سے باد بہاری آج آئی ہے
بنا کر ہار پھولوں کا چمن میں ساتھ لائی ہے
پلا دے ایک ساغر ساقی رنگیں بیاں مجھکو
تری آنکھوں کے صدقے دے شراب ارغواں مجھکو
بتا دے عالم اسرار کے راز نہاں مجھکو
پلا دے وہ مئے عرفاں کہ کر دے بے نشاں مجھکو
وہ کملی اوڑھنے والا فقیری پر جو نازاں تھا
گدا تھے جس کے کوچہ کے سکندر قیصر و کسریٰ
گدائی جس کے گھر کی بادشاہی سے بھی بہتر تھی
زمیں جس شاہ کے کوچہ کی رشک قصر قیصر تھی
قدم بوسی کی جس کے آسماں نے آرزو کی ہو
بلا کر عرش پر جس سے خدا نے گفتگو کی ہو

آپ کا شعری مجموعہ عرفان و عارف کے نام سے چھپ گیا ہے۔ جس میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی قصائد اور قطعات بھی ہیں فارسی عربی اور اردو تینوں زبان کا نمونہ آپ کے اسی شعری مجموعہ میں ہے۔

آنکھ کی کہانی ایک ہی ردیف و قافیہ میں سیکڑوں شعر کی ایک مختصر کتاب ہے جس کی تعریف مولینا

عبدالماجد دریاآبادی نے جیسے ادیب نے کی ہے۔ آپ کی بعض نظمیں جب لسان العصر اکبر الٰہ آبادی کی نظر سے گذریں تو انہوں نے داد دی۔

مگر بہر حال شعر و شاعری کا یہ ذوق بطور مشغلہ کے کبھی نہیں رہا اور نہ ہمارے اکابر نے کبھی اس مشغلہ کو پسند کیا۔

خطابت

قاری صاحب کو اللہ نے جن امتیازی اوصاف سے نوازا تھا ان میں سے ایک وصف خطابت بھی تھا۔ بلامبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ برِ اعظم ہند میں اس زمانہ میں آپ کی ٹکر کا کوئی خطیب نہیں تھا۔ ایک موضوع پر گھنٹوں تقریر کرنا اور اس طرح کہ موضوع کا پورا حق ادا ہو رہا ہو یہ قاری صاحب کمال تھا آپ کی تقریر کیا ہوتی ایسا معلوم ہوتا کہ ایک بحر ساکن آہستہ آہستہ رواں ہے۔

قاری صاحب کی تقریر میں بھرتی کی کوئی چیز اور محض اضاعت وقت نہ ہوتا آپ کا کلام نہایت دلنشین، اسلوب نہایت پیارا آواز نہایت دلکش ہوتی مضامین کی آمد، عقل و نقل سے استدلال آیات ربانیہ اور احادیث نبویہ کا ذکر اکابر کے واقعات شبہات کا رد کبھی طنز و مزاح کی چاشنی درمیان درمیان میں اکبر و اقبال کے اشعار اور پھر میٹھے کا انداز سکون و اطمینان کی کیفیت، لطیف استنباطات و استدلالات یہ ساری چیزیں آپ کی تقریر میں کچھ اس طرح سے گھلی ملی رہتیں کہ عوام و خواص سب کے لئے اس میں دلچسپی کا سامان ہوتا۔ اور گھنٹوں لوگ آپ کی تقریر سنتے اور اکتاہٹ اور گھبراہٹ محسوس کرتے بلکہ ان پر بے خودی و وارفتگی کی ایک کیفیت طاری رہتی مخالف اور موافق سب آپ کی شان خطابت سے متاثر ہوتے۔

میں نے دیکھا ہے اور ہزاروں نے دیکھا ہوگا کہ حضرت قاری صاحب نے کبھی کسی اختلافی موضوع پر تقریر شروع کی تقریر میں مخالفین بھی موجود ہیں مگر مجال کیا کہ ذرا آپ کی زبان سے کوئی گرا کلمہ نکلا ہو۔ اپنی بات کو قرآن و حدیث کی روشنی میں اتنی مدلل کر کے پیش کرتے عقلی براہین سے اتنا اس کو مستحکم کر دیتے کہ مخالف کیلئے سوائے تسلیم کا سر خم کرنے کے اور کوئی چیز نہ ہوتی۔

اللہ نے آپ کو اپنی بات کو موثر بنا کر پیش کرنے کا وہ ملکہ عنایت فرمایا تھا اور پھر ایسا پیارا انداز عطا کیا تھا کہ تقریر کے وقت بس زبان پر یہ شعر ہوتا۔ ؏

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

اور آپ کی تقریر کی خواص بات یہ تھی کہ ہر طبقہ اسکو پسند کرتا تھا۔ دینی مدارس کے علاوہ انگریزی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں آپ کی تقریریں ہوتیں۔ عوام کے حلقہ میں بھی ہوتیں اور علماء اور خواص کے حلقہ میں بھی ہندوستان و پاکستان میں بھی ہوتیں اور یورپ افریقہ و امریکہ میں بھی ہوتیں مومنین کے سامنے ہوتیں اور ملحدین کے سامنے بھی اور ہر جگہ آپ کی تقریر دلچسپی توجہ اور انہماک سے سنی جاتی اسلام پر عقل و نقل کی روشنی میں قاری صاحب کے انداز پر تقریر کرنے والا امنتشککین متردین اور ملحدین اکافرین کے

ایک ایک شیشے فضا آسمانی میں بکھر کر رہ جائیں۔ موجودہ دور میں قاری صاحب کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں تھا اسلام کی ترجمانی کا حق آپ ادا کرتے اور اس کی فضیلت اس کی بڑائی اس کی عظمت کو دوسروں سے تسلیم کرا لیتے۔

قاری صاحب کی خطابت کا ایک وصف نمایاں یہ بھی تھا کہ آپ بلا سابقہ تیاری کے ہر قسم کے موضوع پر بولنے کیلئے تیار رہتے اور آپ کی برجستہ تقریر ایسا معلوم ہوتا کہ نقول اور تعلیقات کی محنت اور تیاری کے بعد ہو رہی ہے۔ علیگڑھ یونیورسٹی میں اسلام اور سائنس کے موضوع پر کی جانے والی تقریر اس کا بہترین نمونہ ہے۔ تین ساڑھے تین گھنٹہ کی یہ تقریر عقل و نقل کی روشنی میں اپنے انداز و بیان کی ایک بالکل انوکھی تقریر ہے اور پھر تقریر میں ایسا ربط کہ کبھی موضوع سے ہٹنے کا کوئی شکوہ نہیں کر سکتا۔

تصنیف و تالیف

حضرت قاری صاحب میں تصنیفی صلاحیت بے پناہ تھی تصنیف کا سلسلہ ابتدا زمانہ ہی سے تھا۔ مختلف موضوعات پر تقریباً ان کی چھوٹی بڑی سو تصانیف ہیں۔ بعض کتابیں مختصر رسالہ کی شکل میں ہیں مگر اپنے مواد اور اپنی جامعیت اپنے اسلوب بیان اور اپنے طرز استدلال میں انوکھی ہیں مثلاً عالم برزخ یہ چھوٹی سی ایک کتاب ہے جو حقیقت میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے محل عالم برزخ کے متعلق سوال کا جواب ہے لیکن یہ اپنے طرز کی بالکل انوکھی تحریر ہے۔

قاری صاحب کی تصانیف کے سلسلے میں ہمارے محترم مولانا اسیر صاحب ادروی کا طویل مفصل اور دلچسپ مضمون اس مجموعہ میں آپ پڑھیں گے اس مضمون سے قاری صاحب کی تصانیف کی خصوصیت معلوم ہوگی۔

قاری صاحب کا تصنیفی انہماک عجیب تھا کبھی کبھی نہیں بلکہ بارہا ایسا ہوتا کہ رات میں جب وہ قلم و کاغذ لیکر بیٹھتے تو اس وقت ہوش آتا جب مرغان سحر آواز دیتا یا دارالعلوم کی مسجد سے اذان کی آواز آتی۔ میں نے خود قاری صاحب کی اس انہماکی کیفیت کا مشاہدہ کیا ہے جو قاری صاحب پر عالم تحریر میں نمایاں رہتی ایسا معلوم ہوتا کہ مضامین کی دنیا میں کھوئے ہوئے ہیں اس عالم میں ہیں بھی نہیں۔ مسلسل چار چار پانچ گھنٹے تک لکھتے رہنا تو عام دستور تھا۔ ایک مجلس میں پورا پورا جز تصنیف کر ڈالتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قدر ہجوم کار اور اتنے اسفار کے باوجود آپ کا تصنیفی ذخیرہ کم و کیف ہر اعتبار سے بڑا عظیم الشان ہے۔

عموماً لوگ تصنیف و تالیف کے لئے سکون کا وقت تلاش کرتے ہیں لیکن قاری صاحب ان اصحاب قلم میں سے تھے کہ جو ہر وقت اور ہر حال میں اپنا تحریری مشغلہ جاری رکھ سکتے تھے۔ سفر و حضر، شور و شغب لوگوں کی بات چیت آپ کے لئے مخل نہ ہوتی اور ہر حال میں آپ کا سلسلہ جاری رہتا اور یہ صفت انسان

میں اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب لکھنے والا معانی اور مضامین کی دنیا میں کھو جائے۔ آپ کی کتنی اہم تحریرات ٹرین میں مکمل ہوئی ہیں لیکن ان تحریرات کو پڑھیئے تو اندازہ ہوگا کہ ذہن بالکل حاضر ہے تحریر میں پراگندگی کا نام و نشان نہیں مثلاً "اسلام کا اخلاقی نظام" اس کا بیشتر حصہ سفر میں لکھا گیا ہے لیکن یہ کتاب اپنے مواد اور اپنی جدت تحریر اور استدلال و استنباط کے اعتبار سے قاری صاحب کی اہم ترین کتابوں میں سے ہے۔

وقت کی قدر

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پوری زندگی حرکت و عمل سے عبارت ہے۔ آپ اپنے وقت کا ہر لمحہ مشغول رکھتے بیکار بیٹھنا آپ سے ممکن نہیں تھا۔ تصنیف و تالیف دارالعلوم کا انتظام، و انصرام، تبلیغی، اصلاحی دستار، لوگوں کی باطنی تربیت و اصلاح ذکر و تلاوت سے آپ کے سارے اوقات گھرے ہوئے تھے۔ علیگڈھ جب آنکھ کے آپریشن کے سلسلہ میں اسپتال میں تھے۔ اور کئی روز اسپتال میں رہنا پڑا تو بھی آپ نے اپنے لئے ایک مشغلہ ڈھونڈ نکالا اور آنکھ کی کہانی سیکڑوں اشعار پر مشتمل ایک عجیب و غریب کتاب وجود میں آگئی یہ کتاب کیا ہے ارباب علم و دانش کیلئے ایک بہترین لذیذ علمی تحفہ۔

وقت کی قدر ہمارے اسلاف و اکابر خوب کرنا جانتے تھے قاری صاحب بھی انہیں میں سے تھے۔ بارہا ایسا ہوتا کہ مجلس میں بہت سے لوگ ہیں اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی ہیں اور قاری صاحب کاغذ و قلم سے مشغلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔

میرے نزدیک اصلاح نفس کا شغل اوقات بڑا ذریعہ ہے جو لوگ اپنا وقت لایعنی باتوں میں برباد کرتے ہیں عموماً ان کی زندگی کا نقشہ اچھا نہیں ہوتا وہ دوسروں کی برائیوں میں پڑتے ہیں ان میں تجسس اور ٹوہ کا مادہ بڑھ جاتا ہے حسد، کینہ، کپٹ پیدا ہوتا ہے غیبت چغل خوری یہ ان لوگوں کا عام مرض ہے جو اپنے اوقات کو کسی مفید کام میں مشغول نہیں رکھتے۔

قاری صاحب کی پوری زندگی ان آلودگیوں سے پاک صاف تھی ان کے یہاں کام تھا یا کام کی بات تھی شغل لایعنی سے ان کو کوئی مطلب نہیں تھا۔

نفاست طبع

قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں نفاست طبع حد کمال کو تھی اور یہ نفاست ہر چیز سے ظاہر ہوتی تھی آپ کا لباس نہایت عمدہ کپڑے کا ہوتا عموماً باریک سوت کا ہوتا انتس پہنتے اور صاف ستھرا اس میں داغ و دھبہ کا نشان نہیں شیروانی آپ کے بدن پر ضرور ہوتی اور اس کا کپڑا اور اس کی تراش و خراش بھی نہایت موزوں اور مناسب۔ آپ ہمیشہ سلیم شاہی کامدار جوتہ استعمال کرتے جو ہر وقت نئے ہی معلوم ہوتے، کھانے پینے کا بھی ذوق بہت صاف ستھرا تھا پان آپ اپنے ہاتھ سے خود لگاتے اور فرماتے کہ پان ذوقی چیز ہے اس کو اپنے ہاتھ سے خود لگانا چاہئے آپ کے ہاتھ میں ایک

رومال ہوتا جو عموماً سرخ ہوتا جس سے پان کھا کر منہ پوچھتے، جاڑے کے زمانہ میں آپ چسٹر پہنتے جس میں کمربند ہوتا وہ بھی بڑا قیمتی ہوتا شیروانیاں آپ کے پاس متعدد ہوتیں اکثر بدل بدل کر استعمال کرتے۔

یہ نفاست صرف کھانے پینے ہی میں نہیں تھی بلکہ فطرتاً آپ نفیس طبیعت کے مالک تھے جس کا ظہور عادات واطوار میں بھی تھا۔ آپ کا لب ولہجہ نرم اور ملائم تھا آپ کی زبان پر مخالف کیلئے بھی برائی کے الفاظ نہیں آتے تھے کسی کو نقصان پہونچانا تو آپنے کبھی جانا ہی نہیں نرم دم گفتگو گرم دم جستجو آپ کی صفت تھی پاک طینتی و پاک سیرتی کے آپ مرقع تھے ناگوار بات کو سنکر پی جانا اور اس پر صبر کرنا یہ صفت اس زمانہ میں آپ پر ختم تھی حقیقت یہ ہے کہ آپ انسانوں میں ایک فرشتہ تھے یہ صرف قصیدہ خوانی نہیں ہے بلکہ یہ میری قلبی شہادت ہے یہ میرے تجربات اور مشاہدات ہیں بڑا ظلم کیا ان لوگوں نے قاری صاحب کی شخصیت کو ان کی آخری زندگی میں مجروح کیا اور انکے ضعف وپیری کا ذرا بھی خیال نہیں کیا اور اس مجسم شرافت پر ذرا بھی رحم نہیں کھایا

وفات قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ نے عمر طویل عطا فرمائی آپ نے ہوش وحواس کے ساتھ اپنی زندگی کی آخری ایام پورے کئے ۱۴۰۳ھ ماہ شوال میں ۶ تاریخ کو علم وفضل کا یہ آفتاب غروب ہوگیا اور تاریخ کا ایک عہد ختم ہوگیا دنیائے بزم ودانش سونی وسوگوار ہوئی اکابر کی امانتوں کا امین جدا ہوگیا قاسمی سلسلہ کا سالار قافلہ رخصت ہوگیا حکمت قاسمیہ کا ترجمان چلا گیا اسلام کے ایک مجاہد نے ہمکو داغ مفارقت دیا۔ علوم ولی اللّٰہی کا شارح پردہ کر گیا میدان خطابت کے شہسوار نے اپنی آخری سانس پوری کی اور بزم خطابت پراگندہ ہوگئی وفات کے وقت آپ کی عمر تقریباً چھیاسی سال کی تھی۔

اولاد حضرت قاری صاحب کی شادی رامپور ضلع سہارنپور میں حکیم ضیاءالدین صاحب رحمۃ اللہ جو سہارنپور کے نہایت معزز لوگوں میں سے تھے انھیں کے بھتیجے حضرت مولانا محمود صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی تھی آپ کا نکاح ۱۳۳۲ھ میں ہوا تھا۔ حضرت شیخ الہند علیہ الرحمۃ نکاح کا پیغام لیکر گئے تھے۔ حضرت تھانوی نے نکاح پڑھایا تھا۔ علماء واکابر اس تقریب سعید میں شریک تھے۔ آپ نے اپنی زندگی میں صرف یہی ایک نکاح کیا تھا۔ اس رفیقہ حیات سے آپ کی کئی اولادیں ہوئیں جن میں زندہ اولاد میں تین صاحبزادے مولانا محمد سالم قاسمی، مولانا محمد اسلم قاسمی اور محمد اعظم استاذ علیگڈھ یونیورسٹی ہیں۔ اور آپ کی تین صاحبزادیاں ہیں جن میں سے مشہور ادیبہ ہاجرہ نازلی بھی ہیں جو مولانا حامد الانصاری غازی سے منسوب ہیں۔

اور پھر پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کی بڑی تعداد ہے اللہ کے فضل سے اب خاندان وسیع ہے لیکن اس کا افسوس ہے کہ حضرت قاری صاحب کی خصوصیات کا حامل اس خاندان میں اب کوئی نظر نہیں آتا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاندان قاسمی کا جو امتیاز تھا اب ختم ہو جائے گا۔ ہماری تمنا ہے کہ ایسا نہ ہو اور خاندان قاسمی اپنی سابقہ روایات اور سابقہ امتیازات کے ساتھ باقی رہے خدا کرے یہ تمنا

واقعہ بن جائے۔

رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ واسکنہ فی دار جنانہ واسبغ علیہ من نعمہ وکرمہ وتغمدہ بغفرانہ وعفا عن زلاتہ وشملہ بعنایتہ وعاملہ بلطفہ انہ سمیع مجیب الدعوات وصلی اللہ علی رسولہ وحبیبہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔

محمد ابوبکر غازی پوری

ابن الانور سید ازہر شاہ قیصر

حضرت مہتمم صاحب کی زندگی کے بعض گوشے

ہر بڑے انسان کی طرح حضرت مہتمم صاحبؒ کی زندگی کے بھی مختلف پہلو اور ان کی صد رنگ سیرت کے بہت سے گوشے تھے ایک مختصر مضمون میں ان سب پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ممکن نہیں ایک بڑے عبقری، مفکر اور مصلح مزاج کے انسان کی زندگی بہت سی خصوصیات وامتیازات کی جامع ہوتی ہے بعض وقت خصوصیتیں ایک دوسرے کے متضاد بھی ہوتی ہیں مگر یہ اس بڑے انسان کی بڑائی کا ایک تابناک پہلو ہوتا ہے۔ کہ وہ ان سب خصوصیات کو ساتھ لیکر چلتا ہے اور اس کے عمل وکردار سے یہ متنوع اور متضاد صفتیں اپنی اپنی جگہ جلوہ گر ہوتی ہیں۔

مہتمم صاحبؒ کی زندگی پر محاسن ومکارم کا غلبہ تھا اس وجہ سے اپنے پچپن ۵۵ سال کے دور اہتمام میں وہ علمی، دینی اور سیاسی حلقوں میں نام نیک نام اپنی دینی جدوجہد میں کامیاب۔ اور اپنے علم وفضل اور قوت تحریر وتقریر کی بنا پر صف اول کے لوگوں میں شمار ہوتے رہے حضرت مہتمم صاحبؒ نے اپنی ساری زندگی میں جن امور کا خاص طور پر خیال رکھا وہ میرے خیال میں درج ذیل ہیں۔

مسلک کی پختگی

حضرت مہتمم صاحبؒ بظاہر نرم رو، نرم گفتار اور ہر مجلس کی زینت اور ہر طبقہ میں ہر دلعزیز تھے مگر واقعہ یہ ہے کہ دارالعلوم اور مسلک دیوبند ان کی زندگی کا پہلا اور آخری موقف تھا انھوں نے اپنی تحریر، تقریر، گفتگو، سفر، حضر سے دارالعلوم کے مسلک کو آگے بڑھانے میں غیر معمولی محنت فرمائی ہے جماعت دیوبند کا کوئی بھی نمائندہ ان کی طرح امریکہ، انگلینڈ، مصر، سعودی عرب، برما، سری لنکا، پاکستان، افغانستان، بنگلہ دیش، حبش وغیرہ تک بار بار جاکر دارالعلوم کا تعارف اور اس کے مسلک کی بنیادوں کو مستحکم نہیں بنا سکا ہے موصوف کی مکمل سوانح عمری سامنے آئیگی تو اس سے پتہ چلے گا کہ گذشتہ پچاس سال ہی انھوں نے اپنے ملک اور غیر ممالک میں لاکھوں میل کا سفر کرکے دور دراز حلقوں میں دارالعلوم کی آواز پہنچائی اور اس کے علم وتقویٰ کی خصوصیات کو کم از کم نصف دنیا میں مقبول بنایا۔

مجھے حضرت مہتمم صاحبؒ کی زندگی میں اکثر اس کا خیال آتا کہ دارالعلوم سے علمی اور دینی لٹریچر کی اشاعت

کا کچھ نہ کچھ سلسلہ قائم رہا لیکن حضرت مرحوم اگر دارالعلوم میں یا اس سے باہر ایک تحقیقی اور علمی ادارہ ایسا قائم فرما دیتے جو بہت وسیع پیمانہ پر دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں اسلامی تعلیمات کو عام کرتا تو یہ بھی ایک بہت بڑی خدمت ہوتی۔

جماعت کا اتحاد

حضرت مہتمم صاحبؒ کو جماعت کا اتحاد بہت عزیز تھا۔ اس کیلئے وہ جماعت کے ہر چھوٹے بڑے کی دلداری فرماتے اور سب کو اپنے ساتھ لیکر چلتے تھے پچاس سال تک دارالعلوم کی مجلس شوریٰ سے انھوں نے اس طرح نباہ کیا کہ کبھی ان کے اور مجلس شوریٰ کے اختلافات ابھر کر سامنے نہیں آئے حالانکہ دارالعلوم جیسے عظیم الشان اور عظیم الاثر ادارے کے وسیع انتظامات کے سلسلہ میں ان کے اور مجلس شوریٰ کے درمیان اختلافات کا پیدا ہونا ناگزیر تھا اور یہ اختلافات پیدا بھی ہوتے تھے مگر حضرت موصوف کبھی خود کو جھکا لیتے تھے اور مجلس شوریٰ کی بات مان لیتے تھے اور کبھی اپنے دلائل اور حقائق سے مجلس کو اپنی رائے ماننے پر مجبور فرما دیا کرتے تھے آخر عمر میں انھیں دارالعلوم کی بعض اونچی شخصیتوں سے اختلافات پیدا ہوئے جو اپنی جگہ بیحد رنجیدہ اور افسوسناک ہیں مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت موصوف تقاضائے عمر سے معاملات پر کنٹرول کرنے سے عاجز آچکے تھے اور بعض ایسے عناصر سامنے آگئے جنھوں نے نہ اختلافات کی سنگینی کا احساس کیا اور نہ ان کی کوئی حد مقرر کی۔

حضرت موصوف کا ایک نمایاں کارنامہ یہ تھا کہ ان کے دور اہتمام میں بیسوں ایسے مدرسین اور کارکنان دارالعلوم تھے جنکے فکر و نظر سے حضرت موصوف ہم آہنگ نہیں تھے مگر دارالعلوم کے اسٹیج پر حضرت موصوف نے کبھی انہیں بری نظر سے نہیں دیکھا کبھی ان کی حق تلفی نہیں کی اور کبھی ان کے مراتب و مناصب میں تخفیف کا ارادہ نہیں فرمایا حضرت شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ، مولانا حفظ الرحمن صاحب مولانا محمد میاں صاحب وغیرہ سے وہ سیاسی طور پر پوری طرح متفق نہیں رہتے تھے مگر ان سب حضرات نے ہمیشہ دارالعلوم کے وجود اور اس کے مفاد کو مقدم جانا اور احاطہ دارالعلوم میں یکدل، یک زبان اور ایک قلم ہو کر چلے یہی وجہ ہے کہ ان سب حضرات کے دور مسعود میں دارالعلوم کو روحانی اور مادی ترقیات نصیب ہوئیں اس کی عمارتیں بڑھیں۔ طلبہ، اساتذہ اور کارکنوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور دارالعلوم کی شہرت چار دانگ عالم میں پہونچی اور دارالعلوم کو اجلاس صد سالہ جیسی عالمی تقریب مناکر ہندوستان میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی داغ بیل ڈالنے کا موقع ملا۔

اساتذہ اور ان کی اولاد کا احترام

حضرت موصوف کو اپنے مشائخ اور اساتذہ حضرت شیخ الہندؒ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا غلام رسول ہزارویؒ

ملہ آپ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ سے لیکر حضرت مولانا محمد طیب صاحب تک کے استاذ دارالعلوم کے مدرس اعلیٰ نے حضرت شیخ الہند نے مالٹا سے آپ کی رحلت پر منظوم مرثیہ تحریر فرما کر بھیجا تھا۔

(مدرس قدیم دار العلوم) حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ، مولانا اعزاز علی صاحب وغیرہم سے غایت درجہ کا تعلق خاطر تھا ان کے بہت سے مضامین اور ملفوظات اور ان کی زندگی کے بہت سے واقعات انہیں محفوظ تھے جنہیں اکثر اپنی تقریروں اور مجلسوں میں بیان فرماتے تھے ۱۹۷۸ء میں کشمیر میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے متعلق سیمنار کے انعقاد کی کوشش میں وہ براہ راست اس جذبے کے ماتحت شریک رہے کہ اس طرح عام وخواص کے سامنے حضرت علامہ موصوف اور دوسرے بزرگان دیوبند کے حالات اور علوم کی یاد تازہ کرنے کا موقعہ ملے گا مشائخ و اساتذہ کا بے حد احترام فرماتے تھے ہمیشہ عزت کے ساتھ ان کا نام لیتے اور ان کی دینی خدمات اور علمی کارناموں کی یاد تازہ فرماتے اساتذہ کی اولاد کی ہر طرح خبر گیری بلکہ ناز برداری فرماتے ہمیشہ یہ چاہتے کہ ان کے اساتذہ کی اولاد باعزت طور پر علمی اور دینی مشاغل میں اپنا وقت گذارے اپنے اس جذبہ کو بروئے کار لانے میں ان نوجوانوں کو بھی کاموں میں معروف رہنے کی تاکید کرتے اور خود بھی ان کی نگرانی فرماتے تھے مجھے ایسے متعدد حضرت کے حالات کا علم ہے جنہیں حضرت مہتمم صاحبؒ اپنے علمی اور روحانی رشتوں کی بنا پر ہمیشہ مدد دیتے اور ان کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔

غیبت سے اجتناب

حضرت مرحوم کا سب سے بڑا اور بیحد قابل رشک وصف یہ تھا کہ وہ انتہائی شائستہ کلام تھے کسی چھوٹے بڑے سے کبھی بھی درشت کلامی نہیں فرماتے تھے پینتالیس سال کی طول طویل معیت میں ہم نے کبھی جلوت وخلوت میں انہیں اپنے بدترین سے بدترین کسی مخالف کی غیبت کرتے ہوئے نہیں پایا بعض وقت ناگوار طبع امور کے پیش آجانے پر کافی دیر تک تنہائی میں رہتے اور یہ محسوس ہوتا کہ جو ناگواری پیش آئی ہے اس پر اپنے باطن میں تحمل پیدا کرنے کی کوشش فرمارہے ہیں۔ اور بعض وقت کسی معاملے میں بہت ہی اذیت پہونچتی تو رنج وغم کی وجہ سے بخار ہوجاتا مگر ان نازک مراحل میں بھی کسی شخص کے خلاف نہ خود کچھ بولتے تھے نہ دوسرے کسی کو بولنے کی اجازت دیتے تھے ان کی صحبت میں اگر ہم لوگوں کو گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھنے کا موقع ملتا تھا تو ہم اس کو ایک نیکی سمجھتے تھے کہ ہمارا اتنا وقت مہتمم صاحبؒ کی صحبت کی وجہ سے غیبت، بدگوئی اور بدندیشی سے محفوظ رہا۔ کارکنان دار العلوم میں صرف مولانا عبد الحق صاحب سابق پیش کار اہتمام کو یہ شرف حاصل ہے کہ ان کے پچاس سالہ خادمانہ اور نیازمندانہ تعلق کی بنا پر حضرت مہتمم صاحب ان سے ایسے بے تکلف تھے کہ معاملات دار العلوم میں بعض وقت پیشکار صاحب کی غلطیوں پر کچھ اظہار ناراضگی فرمادیتے تھے۔

عبادات سے شغف

نماز کی جماعت کے ساتھ پابندی فرماتے بلکہ مسجد دار العلوم یا اپنے محلہ کی مسجد طیب میں خود امامت فرماتے۔ تہجد اور بعد مغرب نوافل پڑھنے کا دائمی معمول تھا۔ مہینے میں کم از کم بیس راتیں ایسی گذرتی جنمیں رات میں ڈیڑھ دو بجے تک جلسوں میں شرکت رہتی قیام گاہ پر واپس تشریف لاکر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ آرام فرماتے اور پھر تہجد کا اہتمام ہوتا جس دن بہت تکان ہوتی اس دن صبح سویرے

تلاوت کلام پاک ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر اٹھ، نو بجے تک سو رہتے حیرت کی بات ہے کہ علالت کے نو دس مہینے بھی کھڑے ہو کر پورے خشوع وخضوع کے ساتھ نمازیں ادا فرماتے رہے۔

علوم قاسمی پر نظر سب سے پہلے ہم نے مفسر قرآن اور محدث دوراں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کو علوم قاسمی کا بیان کرتے ہوئے پایا مولانا رحمۃ اللہ علیہ تقریر و تحریر پر مہارت تامہ اور جدید اسلوب واداپر پوری دسترس رکھتے تھے غامض مسائل کو اتنے آسان طریق پر بیان فرماتے کہ کم سواد لوگ بھی ان سے استفادہ کرتے پھر سنا کہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی سابق صدر المدرسین کے یہاں بھی علوم قاسمی کا چرچہ رہا ہے مگر ہمیں مولانا کی ان مجالس میں کبھی شرکت کا موقع نہیں ملا جس میں مولانا علوم قاسمی سے بحث فرماتے تھے۔ پھر حضرت مہتمم صاحب کی زبان پر ہمیں علوم قاسمی کا ذکر ملا حضرت مہتمم صاحب قدیم اسلوب اور اصطلاحات کا سانچا تو نہیں توڑتے تھے۔ مگر حضرت نانوتوی کے بہت سے علمی حقائق پر ان کی نظر تھی جس زمانہ میں پاکستان میں مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر لمبی چوڑی بحث چلی تو حضرت مہتمم صاحب نے کئی بار حضرت نانوتوی کے تصانیف سے ایسے مضامین بطور استشہاد واستناد کے نقل فرمائے جن سے حضرت کی حیات برزخی اور حیات تامہ کا سراغ ملتا تھا یاد آتا ہے کہ اس موضوع پر مرحوم نے ایک مفصل مضمون بھی تحریر فرمایا تھا افسوس ہے کہ اب روایات کہن کا جاننے والا اور ماننے والا کوئی شخص سامنے نہیں رہا ئی آب دہ اور نیاز مانہ ہے۔ ع

اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لیکر

مولانا محمد عثمان صاحب قاسمی معروفی

حکیم الاسلام رحمۃ اللہ الخبیر

۱۴۰۳ھ

بجمال قلم محمد عثمان معروفی

۱۴۰۲ھ

حضرت قاری صاحبؒ کو بہت قریب سے دیکھنے کے مواقع راقم الحروف کو ملے وہ میرے اساتذہ میں سے تھے۔ ۱۳۶۰ھ / ۱۹۴۹ء میں دورۂ حدیث کے سال میں انہوں نے ابن ماجہ شریف پڑھائی تھی کبھی کبھی ان کے دولت کدہ پر حاضر ہو کر ان کی صحبت اور ان کے مواعظ سے بھی فیضیاب ہوتا رہا۔ اب سوچتا ہوں تو حضرت کا وہ انداز تکلم وہ خطیبانہ شان اور وہ ساری ادائیں ایک ایک کر کے سامنے آرہی ہیں۔ آج وہ ہم میں نہیں ہیں مگر ان کے جاویدکارنامے جریدۂ عالم پر ثبت ہیں خدا نے انہیں ایسی عالمی شہرت عطا فرمائی تھی جو بہت کم لوگوں کو ملا کرتی ہے۔ مجھ جیسے طالب علم کا ان کی شان میں کچھ لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے مرادف ہے۔ لیکن حضرت سے تعلق خاطر کی بنا پر اپنے جذبات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے میں اپنی سعادت مندی محسوس کرتا ہوں۔ آپ بانیٔ دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتویؒ متوفی ۱۲۹۷ھ / ۱۸۷۹ء کے نبیرہ اور مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند متوفی ۱۳۴۷ھ / ۱۹۲۸ء کے فرزند ارجمند اور معزز علمی خاندان کے چشم وچراغ تھے۔

ولادت محرم ۱۳۱۵ھ مطابق جون ۱۸۹۷ء بروز یکشنبہ پیدا ہوئے تاریخی نام مظفرالدین اور اصل نام محمد طیب رکھا گیا۔ گھر کا ماحول علمی و دینی تھا جس میں آپ کی نشوونما ہوئی۔ ۱۳۲۲ھ میں علماء و صلحا کے ایک بڑے مجمع میں آپکی بسم اللہ ادا کی گئی اور آپ مکتب میں بٹھائے گئے اس سال کی تاریخ نعم بالخیر ۱۳۲۲ھ کے مادہ سے برآمد ہوتی ہے۔

حفظ قرآن عام دستور کے خلاف مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ متوفی ۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۹ء اور والد ماجد کی خصوصی توجہ کے پیش نظر تجوید کے ساتھ قرآن حفظ کرانے کیلئے ذاتی طور پر حضرت مولانا قاری عبدالوحید خاں الٰہ آبادی متوفی ۱۳۶۰ھ کو بلا کر گھر رکھا گیا پھر حضرت شیخ الہند متوفی ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء کے مشورہ سے ان کو دارالعلوم میں باقاعدہ مدرس رکھ لیا گیا تو آپ بجائے گھر کے مدرسہ میں داخل ہو کر پڑھنے لگے اور دو سال میں پورا قرآن تجوید کے ساتھ حفظ کر لیا۔ اسی وقت سے لفظ قاری آپ کے نام کے ساتھ اس طرح لگ گیا گویا نام کا جزو بن گیا۔

فارسی تعلیم حفظ قرآن کے بعد ۱۳۲۷ھ میں درجہ فارسی میں داخل ہوئے تین سال میں فارسی کے مروجہ نصاب اور تجوید کی کتابیں نیز ریاضی، حساب، جغرافیہ، وغیرہ کی تحصیل کی۔ فارسی کے اساتذہ

میں مفتی محمد شفیع صاحب کے والد مولانا محمد یٰسین صاحب خاص طور سے قابل ذکر ہیں جو فارسی دانی میں طویل تجربہ اور بڑی شہرت رکھتے تھے۔ استاذ کی توجہ اور آپ کی ذہانت کا یہ اثر ہوا کہ دوران تعلیم ہی آپ اردو فارسی میں قصائد اور غزل کہنے لگے اور فارسی بولنے پر قادر ہو گئے ۱۳۵۸ھ میں جب دارالعلوم کے نمائندہ بنکر افغانستان گئے تو وہاں عموماً فارسی زبان میں سوالات کے جوابات اور تقریریں کیں جنکا وہاں اچھا اثر پڑا۔

درس نظامیہ

۱۳۲۹ھ میں فارسی کی تکمیل ہوئی تو اگلے سال درس نظامی کی تحصیل کا آغاز کیا اور کل آٹھ سال میں مروجہ جملہ علوم و فنون کی تکمیل کر کے ۱۳۳۷ھ میں دورۂ حدیث سے فارغ التحصیل ہوئے۔

اساتذہ کرام

آپ کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ وقت کے ماہر فن اساتذہ سے آپ کو فیضیاب ہونے کا موقع ملا۔ مثلاً حفظ و تجوید میں مولینا عبدالوحید خاں الٰہ آبادی فارسی میں ماہر فن مولانا محمد یٰسین صاحب دیوبندی معقولات میں مولینا شبیر احمد صاحب عثمانی متوفی ۱۳۶۹ھ حضرت علامہ ابراہیم صاحب بلیاوی متوفی ۱۳۸۷ھ اور مولانا غلام رسول خانصاحب متوفی ۱۳۳۷ھ فقہ اور ادب میں شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب امروہوی متوفی ۱۳۷۴ھ اور حدیث میں والد محترم مولینا حافظ احمد صاحب مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی متوفی ۱۳۴۷ھ مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندی متوفی ۱۳۶۴ھ اور محدث عصر مولانا انور شاہ کشمیری متوفی ۱۳۵۲ھ جو کثرت معلومات کی بنا پر چلتا پھرتا کتب خانہ بولے جاتے تھے۔

مسند تدریس

فراغت کے بعد ہی علمی مناسبت اور طبعی ذہانت کے پیش نظر آپ دارالعلوم دیوبند میں مدرس منتخب ہوئے شروع میں ابتدائی درجات کی کتابیں آپ کے زیر درس تھیں لیکن آپ کی علمی استعداد اور افہام و تفہیم کی قوت نے آپ کو قبول عام بخشا اور چند سالوں میں وسطیٰ اور علیا کی کتابیں آپ کے زیر درس میں آگئیں اور یہ تدریسی سلسلہ آخر تک قائم رہا اگرچہ کثرت اسفار اور کار اہتمام کے ہجوم میں درس کا موقع کم ملتا رہا مگر جب بھی فرصت ملتی تو حجۃ اللہ البالغہ عقیدۃ الطحاوی یا حدیث کی کوئی کتاب ضرور پڑھاتے تھے۔

منصب اہتمام

آپ کے والد محترم حافظ محمد احمد صاحب جمادی الاخریٰ ۱۳۱۳ھ سے دارالعلوم کے مہتمم تھے لیکن ربیع الاول ۱۳۴۰ھ میں نظام دکن کی طلب پر ایک ہزار روپے مشاہرہ پر ریاست دکن کی عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) کے مفتی ہو کر حیدر آباد چلے گئے اور اہتمام کا تمام بار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی نائب مہتمم پر پڑا تو مجلس شوریٰ نے قاری صاحب کو نائب مہتمم ثانی مقرر کیا۔ حافظ محمد احمد صاحب حیدر آباد کے قیام میں بھی منصب اہتمام پر فائز رہے لیکن ان کی طول عدالت اور کبر سنی کے باعث ذوالقعدہ ۱۳۴۷ھ کے اجلاس شوریٰ نے ان کو اعزازی صدر مہتمم اور ان کی جگہ پر مولانا عثمانی صاحب کو مہتمم بنا دیا تو قاری صاحب کو نائب مہتمم اول مقرر کیا گیا رجب ۱۳۴۸ھ ۱۹۳۰ء میں جب مولانا عثمانی صاحب کا انتقال ہو گیا تو سرپرست دارالعلوم حضرت مولانا تھانوی متوفی ۱۳۶۲ھ کی تجویز پر قاری صاحب کو قائم مقام مہتمم بنا دیا گیا۔ پھر شوال ۱۳۴۸ھ کی مجلس شوریٰ نے آپ کو

مستقل مہتمم مقرر کر دیا پھر مسلسل ۲۱ ربیع الاول ۱۴۰۲ھ ۱۸ جنوری ۱۹۸۲ء تک کار اہتمام سنبھالا اور اپنی عالمی شہرت و مقبولیت سے دارالعلوم کو چار چاند لگا دیا۔ تقسیم ہند کے بعد آپ پاکستان جاکر وہاں کے شہری بن چکے تھے۔ لیکن حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی متوفی ۱۳۷۷ھ کی مساعی جمیلہ سے پھر ہندوستان آکر اپنے عہدہ جلیلہ پر فائز ہو گئے۔ تقسیم ہند سے پہلے یہاں کے مسلمان دو بڑی بڑی جماعتوں میں منقسم تھے۔ ایک جمعیۃ علمار ہند دوسری مسلم لیگ جس کا مطالبہ پاکستان بنوانیکا تھا حضرت قاری صاحب تعلق دوسری جماعت سے تھا قاری صاحب کے دور اہتمام کو عروج اس وجہ سے بھی زیادہ ملا کہ ان کو حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ اور حضرت مولانا فخر الدین مراد آبادی متوفی ۱۳۹۲ھ جیسا معاون و دست راست ملتا گیا ساٹھ برس تک آپ نے عہدہ اہتمام سنبھالا جس میں ابتداً آٹھ برس نائب مہتمم پھر چون برس اعلیٰ مہتمم رہے ؎

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

عہدۂ صدارت

آپ مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر رہے۔ اس طرح کی بہت سی انجمنوں کے صدر اور سرپرست رہے ۵، ۶، ۷، ۸ رمئی ۱۹۶۲ء کو جب بمقام دہلی جمعیۃ علمار ہند کا تینوں آل انڈیا اجلاس عام زیر صدارت مولانا عبدالوہاب صاحب آروی منعقد ہوا تھا اسی پنڈال میں ۸ رمئی کا آخری اجلاس کل ہند دینی تعلیمی کانفرنس کا تھا جو حضرت قاری صاحب کی صدارت میں تھا وہاں آپ کے پر از معلومات دلکش آفریں خطبۂ صدارت نے وہ سماں پیدا کر دیا تھا کہ اہل علم جھوم جھوم کر صدائے مرحبا بلند کرتے رہے راقم الحروف بھی اسٹیج پر قاری صاحب کے قریب ہی بیٹھا محظوظ ہو رہا تھا۔ اس اجلاس کی تزئین اور بورڈ و کتبات وغیرہ کی کتابت جمعیۃ علمار کی دعوت پر احقر نے جاکر کی تھی۔

بیعت و سلوک

تزکیہ نفس اور علوم باطنی کی تحصیل کیلئے حضرت شیخ الہند کے دست حق پرست پر بیعت کی ان کے وصال کے بعد اپنے استاذ حدیث حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے زیر تربیت سے وابستہ ہو کر ایک عرصہ تک منازل سلوک طے کیا ۱۳۴۵ھ میں جب اہتمام اور علامہ کشمیریؒ وغیرہ کے درمیان اختلاف کی شدت ہوئی جس کی وجہ سے وہ مع رفقار دارالعلوم سے نکلکر ڈابھیل چلے گئے تو ان سے سلسلہ سلوک بھی منقطع ہو گیا اس کے بعد حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کے ایمار سے حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے بیعت کی اور بہت جلد خلافت و اجازت سے مشرف ہوئے خلافت ملنے کے بعد بیعت و ارشاد کا سلسلہ شروع کیا تو مریدین و متوسلین کا حلقہ ملک اور بیرون ملک وسیع گیا۔

فن خطابت

خطابت و تقریر میں آپ کو وہ مہارت و ملکہ حاصل تھا کہ علمائے عصر میں آپ کا کوئی ثانی نہ تھا اسرار و حکم اور علوم و معارف کا ایک چشمہ زخار تھا جو ابلتا چلا جاتا تھا انداز بیان اتنا دل پذیر و موثر ہوتا کہ سامعین دو دو تین تین گھنٹے سراپا گوش بنے بیٹھے رہتے اور بجائے اکتاہٹ کے لذت یاب و لطف اندوز ہوتے۔ تقریر کی اثر اندازی عوام و خواص اور جدید تعلیم یافتہ حضرات ہر ایک کے لئے یکساں ہوتی۔

مسلم یونیورسٹی علیگڈھ، جامعہ ملیہ دہلی وغیرہ میں بھی آپ کی تقریریں بہت پسند کی جاتی تھیں اسی اثر اندازی کی وجہ سے آپ فاتح بمبئی بھی کہے جاتے تھے کیونکہ بمبئی کے اندر سب سے پہلے مقرر علمائے دیوبند میں آپ ہی ہیں آپ کے خلاف بھی بریلوی حضرات کی طرف سے وہاں کی دیواروں پر قدآدم پوسٹر لگائے گئے تھے مگر آپ کی تقریر سے کتنے بریلوی تائب ہوکر صحیح العقیدہ اور دیوبندی مسلک ہوگئے اور آپ سے پروگرام لے کر جگہ جگہ تقریریں کرائیں اس کے بعد سے بمبئی میں علمائے دیوبند کی تقریروں کا دروازہ کھل گیا۔

شاعری

آپ قادر الکلام شاعر بھی تھے جب شعر گوئی پر آئے تو سیکڑوں اشعار پر مشتمل طویل نظمیں کہہ ڈالتے آپ کے منظوم کلام کے مجموعے۔ جنونِ شباب، عرفانِ عارف، آنکھ کی کہانی اور ارمغان دارالعلوم وغیرہ آپ کی شاعری کی یادگار ہیں۔

تصنیف وتالیف

آپ نے مضمون نگاری زمانہ متعلمی سے ہی شروع کردی تھی جیسا کہ آپ کے علمی وتحقیقی مضامین ومقالات اس وقت کے ماہنامہ القاسم وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔
مختلف موضوعات پر آپ کی تصانیف وتالیفات مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتب ورسائل کی تعداد سو سے زائد ہے۔ جن میں کی بعض درج ذیل ہیں التشبہ فی الاسلام، سائنس اور اسلام، اصول دعوت اسلام، تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام اسلام اور فرقہ واریت، دین وسیاست، تفسیر سورہ فیل، فطری حکومت، شان رسالت، فلسفہ نماز، شرعی پردہ، علم غیب، خاتم النبیین، فلسفہ طہارت، داڑھی کی شرعی حیثیت، آفتاب رسالت، مشاہیر امت، اسلام کا اخلاقی نظام انسانیت کا امتیاز، شہید کربلا اور یزید، حاشیہ عقیدۃ الطحاوی وغیرہ۔

اسفار

دارالعلوم دیوبند کے آپ ہی ایک ایسے مہتمم گذرے ہیں جنہوں نے کثرت سے سفر کرکے دارالعلوم کے تعارف اور اس کے حلقۂ اثر کو ملک اور بیرون ملک کافی وسعت دی جس سے دیوبند اور جماعت دیوبند کا عالمی پیمانہ پر تعارف ہوا اور آپ کی بھی عالمگیر شہرت ومقبولیت ہوئی اور آپ کے مواعظ وتقاریر سے لاکھوں انسان مستفیض ہوئے آپ کے تبلیغی اسفار میں بنگلہ دیش، پاکستان، افغانستان، سعودیہ عربیہ، برما، مصر، جنوبی افریقہ، زنجبار، کینیا، روڈیشیا، ری یونین، ڈغاسکر، اتھوپیا، فرانس، جرمنی، انگلینڈ، امریکہ، وغیرہ شامل ہیں۔

زیارت حرمین شریفین

یہ تو مجھے نہیں معلوم کہ حج وزیارت کی سعادت کتنی بار آپ کو حاصل ہوئی مگر ۱۳۶۹ھ میں جس سال میرا دورہ حدیث تھا آپ حج کو تشریف لے گئے۔ واپسی پر مسجد دارالعلوم میں بعد نماز عصر آپ نے مختصر تقریر فرمائی اور جملہ طلبائے دارالعلوم کو آب زمزم اور مدینہ منورہ کی کھجوریں تقسیم کیں۔ کھجوریں کم پڑ گئیں تو چیر چیر کر تھوڑی تھوڑی دی گئیں اس موقع پر آپ نے فرمایا "تبرک آں باشد کہ از حلق فرد نشود"

آپ کی مجلس

راقم الحروف متعلمی کے دور میں حضرت شیخ الاسلام کے یہاں مدنی منزل میں بھی جاتا رہا اور حکیم الاسلام کی مجلس میں بھی جہاں مواعظ ونصائح اور اسرار وحکم کے موتی بکھرتے تھے۔
ایک بار بعد عصر آپ کی مجلس میں حاضر ہوا وہاں مستفیدین کی تعداد خاصی تھی آپ بیان فرما رہے تھے کہ تبلیغ دین کے

لئے دنیا کی ملامت کا اندیشہ حائل نہیں ہوتا چنانچہ دلی میں طوائف کی سردار گنّو نامی کی لڑکی شادی کی تقریب میں جہاں دلی میں تمام طوائف اور ڈھول باجہ والے جمع تھے اس مجلس میں حضرت مولانا اسمٰعیل شہید دہلویؒ نے جاکر نقیر کے بھیس میں ایسی موثر تقریر فرمائی کہ ناچنے والی تمام عورتوں اور باجہ بجانے والے تمام مردوں کی روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں تمام باجے چھت کے نیچے پھینک دیئے اور سچے دل سے سب کے سب تائب ہو گئے وہی رجوآپ خادم بن کر مجاہدین کے گھوڑوں کو گھاس دانہ کھلاتی رہی حتیٰ کہ بالا کوٹ کے میدان میں ۱۲۴۶ھ و ۱۸۳۱ء میں وہ بھی شہید ہوئی ایسی مجلس میں حضرت قاری صاحب نے یہ انکشاف بھی فرمایا کہ جب میں قرآن کا حافظ ہو گیا تو والد محترم نے پوچھا کہ جانتے ہو میں تمہیں کس لئے حافظ قرآن بنایا؟ میں نے لاعلمی ظاہر کی تو فرمایا کہ میں روزانہ بعد مغرب اوّابین کی چھ رکعتوں میں ایک پارہ قرآن پڑھ کر اپنے والد ماجد کی روح کو ایصال اجر کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم بھی میرے لئے اسی طرح ایصال کیا کرو۔ حافظ بنانے کا میرا پہلا مقصد یہ ہے حضرت قاری صاحب نے فرمایا کہ اس وقت سے اب تک میرا معمول چلا آرہا ہے کہ میں بھی روزانہ اوّابین میں ایک پارہ پڑھکر والد محترم کی روح کو بخشتا ہوں۔

اخلاق آپ نہایت وسیع الاخلاق، نرم خو رحمدل اور حلیم و بردبار بلکہ حلم و بردباری کے پہاڑ تھے آپ نے اپنے چون سالہ دور اہتمام میں کسی ملازم یا مدرس کو برطرف نہیں کیا اور نہ کوئی انتظامی کاروائی کی آپ کے اسی عفو درگذر کا نتیجہ تھا کہ کچھ لوگوں نے آپ کی نرمی سے ناجائز فائدہ حاصل کرنا شروع کر دیا تھا اور اخیر زندگی میں آپ کو وہ حادثہ دیکھنا پڑا جس کے تصور سے دل تڑپ اٹھتا ہے **یالیتنی مت قبل هذا**

حلیہ اور لباس قدرت نے حسن و جمال بھی آپکو وافر عطا فرمایا تھا نہایت گورا انگارہ رنگ میانہ قامت، متوسط جسامت نورانی چہرہ، چوڑی پیشانی گھنی اور لمبے بالوں کی بھویں، دودھ سے دھلے ہوئے جسم پر جیسے انار کا نچوڑ ہوا رس، اس پر اعلیٰ قسم کا قیمتی لباس، کپڑا عموماً باریک، نزاکت و نفاست کا مظہر ہوتا و لباس سے شہنشاہِ وقت، رعب و وقار کا مجسمہ پہلی بار میں نے آپ کو جامعہ مفتاح العلوم مئو میں ۱۳۶۲ھ میں دیکھا اور دیر تک محو نظارہ رہا جب میں وہاں عربی درجہ دوم میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اسی طرح ۱۳۹۰ھ کا رمضان میں نے مدنی مسجد میں گذارا تھا عید کی نماز کے لئے دیوبند کی عید گاہ میں ساتویں صف میں بیٹھا تھا کہ حضرت قاری صاحب تشریف لائے میں اس طرح کھڑا ہو گیا کہ وہاں ایک جگہ نکل آئی اور مجھے بالکل ان سے متصل بیٹھنے کا دیر تک موقعہ نماز سے پہلے اور نماز کے بعد میسر آیا اور دو مرتبہ سلام و مصافحہ کی سعادت ملی۔

وفات آپ کی وفات حسرت آیات دیوبند میں یکشنبہ ۶ شوال ۱۴۰۳ھ، ۱۷ جولائی ۱۹۸۳ء ساڑھے گیارہ بجے دن میں ہوئی۔ نماز جنازہ احاطہ دارالعلوم میں بعد نماز عشاء تقریباً چھ ہزار کے مجمع میں آپ کے صاحبزادہ مولانا محمد سالم صاحب نے پڑھائی اور رات کے ساڑھے دس بجے مقبرہ

قاسمی میں اس علوم و معارف اور اسرار حکم کے پیکر کو دفن کر دیا گیا ہے

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

آپ کی عمر قمری سال سے قریب تین ماہ کم تواسی سال ہوتی ہے اور شمسی سال سے قریب ایک ماہ زائد چھیاسی برس ہوتی ہے۔

حکیم اسلام قاری محمد طیبؒ صاحب طاب ثراہ اور نور مرقدہٗ النورالغنی سے برآمد کیا جاسکتا ہے۔

۱۴۰۳ ھ ۱۹۸۳ء

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں — کہیں سے آب بقائے دوام لا ساقی

فضل و کمال

حضرت قاری صاحب میری نظر میں

مولانا مجیب اللہ ندوی

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے بے شمار پہلو ہیں جن پر واقف کار حضرات اپنے اپنے انداز سے لکھیں گے۔ راقم الحروف ان سے بہت قریب سے واقف نہیں ہے اس لئے اپنے لئے یہ عنوان اختیار کیا ہے کہ اس میں واقعات سے زیادہ ذاتی مشاہدات اور تاثرات کے اظہار کا موقع ہے۔

حضرت قاری صاحب کے انتقال پر راقم الحروف نے الرشاد میں جو اداریہ لکھا تھا اس میں بہت سی باتوں کے ساتھ اپنے اس تاثر کا بھی اظہار کیا تھا کہ اپنی نظروں نے طبقۂ علماء میں دو ایسی باوقار دینی شخصیتوں کو دیکھا ہے کہ جو اپنے پروقار نورانی اور معصوم چہروں کے ساتھ جس مجمع میں پہونچ جاتے تھے پوری مجلس پر چھا جاتے تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ رحمت کے فرشتوں کا نزول ہو رہا ہے ایک حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ دوسرے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت اور مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خلافت کی وجہ سے تو قابل احترام تھے ہی مگر ذاتی طور پر بھی اپنے علم وفضل، اعتدال وتوازن اور شیریں مقالی کی وجہ سے پورے حلقۂ علماء میں ایک ممتاز شخصیت ہی کے مالک نہیں بلکہ اس حلقہ کے گل سرسبد تھے۔ انہوں نے دس پانچ سال نہیں بلکہ نصف صدی دارالعلوم دیوبند کی جو بے لوث خدمت انجام دی ہے ممکن ہے کہ وہ موجودہ تاریخ سازی کی نذر ہو جائے مگر ہندوستان کی دینی تاریخ سے ان کی خدمت کے نقوش تاباں کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ جس وقت ان کو اہتمام کا عہدہ سپرد کیا گیا تھا دارالعلوم کے حلقہ کے اندر اور اس کے حلقہ کے باہر بڑی بڑی شخصیتیں موجود تھیں۔ مگر سب کی نظر انتخاب اسی ۲۸، ۲۹ برس کے نوجوان پر پڑی۔ اور انہوں نے بزرگوں کے حسن ظن کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ آگے چلکر بذات خود ایک بڑی شخصیت بن گئے۔ جسوقت انہوں نے اہتمام سنبھالا دارالعلوم دیوبند ایک متوسط درجے کا مدرسہ تھا۔ جسے انہوں نے اپنے حسنِ انتظام سے ہندوستان کا جامع ازہر بنا دیا۔ ان کی غیر معمولی صلاحیت ہی تھی کہ جب وہ کچھ دنوں کے لئے پاکستان چلے گئے۔ اور وہاں کی شہریت اختیار کر لی تو دارالعلوم دیوبند کے اس وقت کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا ابوالکلام آزاد اور جواہر لال نہرو سے سفارش کر کے ان کو دوبارہ ہندوستان واپس لائے۔ جب مولانا آزاد نے مولانا مدنی سے کہا کہ کیا آپ کو کوئی دوسرا قاری طیب نہیں ملتا جو آپ ان کے بلانے پر اصرار کر رہے ہیں؟ تو انہوں نے جواب میں کہا کہ ہاں مجھے دوسرا قاری طیب نہیں مل رہا ہے۔

مولانا مدنیؒ کے ان کو دوبارہ لانے میں جہاں ان کی صلاحیت کو دخل وہیں یہ احسان شناسی بھی تھی کہ آزادی سے پہلے مولینا مدنی کے غیر معمولی سیاسی انہماک کی وجہ سے جب بھی مجلس شوریٰ میں یہ مسئلہ اٹھایا جاتا اور دارالعلوم کے بعض اکابر بھی ناگواری کا اظہار فرماتے کہ اس سے دارالعلوم کو دینی و علمی حیثیت کو نقصان پہونچ رہا ہے تو قاری صاحب ہی کی شخصیت تھی کہ مولانا مدنیؒ کا یہ کہکر دفاع کرتے تھے کہ اگر ان کے سیاسی انہماک سے کچھ نقصان پہونچتا ہے تو ان کی برگزیدہ زندگی اور درس حدیث سے دارالعلوم کو فائدہ بھی پہونچ رہا ہے اس کو پیش کرکے اس مسئلہ کو ہمیشہ دبادیا کرتے تھے۔

قاری صاحب کی ایک خاص خصوصیت عام مدارس اسلامیہ سے ان کا تعلق خاطر تھا۔ وہ اگر کسی گاؤں کے کسی مکتب کے جلسہ میں بھی بلائے جاتے تھے تو اس میں بھی اسی اہتمام و انشراح کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ جس طرح کسی بڑے مدرسہ کے جلسہ میں وہ شریک ہوتے تھے۔ خود جامعۃ الرشاد میں ان کو جب بھی بلایا گیا تو پورے انشراح قلب کے ساتھ شریک ہوئے۔ جامعۃ الرشاد کی ابتداء ۱۹۶۲ء میں ایک کرایہ کی عمارت اور مسجد میں ہوئی۔ مگر ۱۹۶۵ء میں اس کی جدید عمارت کا سنگ بنیاد جن علماء و صلحاء کے ہاتھوں رکھا گیا ان میں خاص طور پر قاری محمد طیب صاحب نے اس کی پہلی اینٹ رکھی اس موقع پر انہوں نے مدرسہ کی افادیت پر جو مؤثر تقریر کی اس سے متاثر ہوکر شہر اعظم گڈھ جیسے غریب مقام کے باشندوں نے کئی ہزار روپے کی رسید کٹوائی۔

مولانا قاری محمد طیب صاحب دوسری بار اس وقت تشریف لائے جب جامعۃ الرشاد کی طرف سے مشرقی اضلاع کے عربی مدارس کے ذمہ داروں کی مجلس بلائی گئی تھی۔ اس وقت مدرسہ کا ہال جہاں بنا ہوا ہے۔ وہاں ایک بڑا چھپر پڑا ہوا تھا۔ اسی چھپر میں مجلس ہوئی قاری صاحب مجلس سے کئی گھنٹہ پہلے تشریف لے آئے اور مجلس کے بعد بھی کئی گھنٹے اسی چھپر کے نیچے لیٹے رہے اور فرماتے رہے کہ آج اس میں بیٹھ کر بزرگوں کی یاد تازہ ہوگئی۔ انہوں نے اپنے معائنہ میں لکھا کہ جو کام کسی بڑے مدرسہ کو کرنا چاہیے بحمداللہ وہ جامعۃ الرشاد کر رہا ہے۔ تیسری بار قاری صاحب ۱۹۷۶ء میں دستار بندی کے جلسہ میں تشریف لائے۔ اسی موقع پر انہوں نے اسلامی ہاسٹل کا بھی معائنہ کیا جو جامعۃ الرشاد کی طرف سے انگریزی طلبہ کی تربیت کے لئے قائم کیا گیا تھا انہوں نے ہر موقع پر اپنا معائنہ بھی تحریر فرمایا جو ان کی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ہے۔ ان کی ہمت افزائی اور اعلیٰ ظرفی جامعۃ الرشاد ہی کے ساتھ مخصوص نہیں تھی بلکہ کسی بھی مدرسہ کی طرف سے جب ان کو مدعو کیا جاتا تھا تو وہ اس انشراح کے ساتھ تشریف لے جاتے تھے کہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کے نزدیک اس مدرسہ کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کسی بڑے دارالعلوم کی ہے۔

حضرت قاری صاحب کی ایک بڑی خصوصیت ان کی طبعی شرافت، مروت اور نرم خوئی تھی۔ انہوں نے زندگی میں شاید ہی کسی کے آبگینۂ دل کو ٹھیس پہونچائی ہو۔ جن لوگوں نے اس پیرانہ سالی میں ان کے معصوم دماغ کو مجروح کیا اور بے داغ شیشۂ دل کو چور چور کر ڈالا ان کے ساتھ ہی انہوں نے کبھی تلخ کلام نہیں کی۔

آخری علالت کے زمانہ میں ایک مجلس شوریٰ کے ممبر صاحب جنہوں نے ان کے خلاف بہت کچھ لکھا تھا بلکہ بعض نا گفتنی باتیں بھی لکھ ڈالی تھیں معافی کا خط لکھا تو انہوں نے جواب میں انھیں لکھا کہ میرا ذاتی کوئی معاملہ نہیں ہے، اور نہ مجھے کوئی شکایت ہے۔ دارالعلوم کا معاملہ ہے اس سلسلہ میں آپ اس کے ذمہ داروں ہی سے معافی مانگیں تو بہتر ہے اس جواب میں قدرے ناراضگی کا اظہار ہے مگر انداز کتنا شریفانہ ہے۔ دارالعلوم کے تعلق ہی کی بات تھی کہ جب ان سے دوسرا دارالعلوم قائم کرنے کے لئے کہا گیا تو انہوں نے انکار کر دیا۔

مجلس شوریٰ کے بعض ممبران بسا اوقات ان کے خلاف بہت سخت انداز اختیار کرتے تھے اور ان کے بہت سے کئے ہوئے اقدامات کو رد کرا دیتے تھے مگر وہ کبھی چیں بہ جبیں نہیں ہوتے تھے اور نہ اپنے کارناموں اور شخصیت کی بنا پر ان کی ان باتوں کو بے وزن سمجھتے تھے اور نہ یہ کوشش کرتے تھے۔ مجلس شوریٰ سے یہ کانٹا نکل جائے۔ اس کے برخلاف ایک بڑے ادارے کی مجلس انتظامیہ میں لکھنؤ کے ایک مرحوم ممبر صاحب نے کچھ اعتراضات کر دیئے تو ادارے کے ذمہ دار صاحب بلڈنگوں کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے کہ آپ لوگوں کو یہ سب کچھ نظر نہیں آتا صرف اعتراض کرنا آتا ہے ؎

ببیں تفاوت رہ از کجا تا بکجا

دارالعلوم دیوبند میں اساتذہ کا ایک گروپ ہمیشہ قاری صاحب کا مخالف رہا مگر انہوں نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔ ممکن ہے کہ کسی مخصوص وجہ سے کسی کی علیحدگی ہوئی ہو مگر عام طور پر ان کا طرز عمل یہی رہا۔ یہی حال طلبہ کے ایک گروپ کا رہا مگر وہ ہمیشہ ان کو معاف ہی کرتے رہے۔

ان کی یہ نرم خوئی ان کے مخالفین کے نزدیک سب سے بڑا قصور تھی۔ ظاہر ہے کہ نرم آدمی کے گرد کچھ غلط لوگ بھی جمع ہو جاتے ہیں اور ان سے غلط کام بھی کرا لیتے ہیں مگر اس کی وجہ سے ان کے کارناموں کو جب بھی نظر انداز کیا جائے گا تو اس کا نتیجہ پیرانہ سالی میں دارالعلوم سے ان کی علیحدگی نہیں بلکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابیؓ کی شہادت کی صورت میں بھی ظاہر ہو چکا ہے۔

سنہ ۱۹۶۴ء میں ایک بار دارالعلوم میں کچھ مالی بحران پیدا ہو گیا۔ قاری صاحب ذاتی طور پر خود جدوجہد کی اور اس کے لئے حضرت مولانا وصی اللہ صاحبؒ اور بعض دوسرے بزرگوں سے دعا کی درخواست کی اس خط سے متاثر ہو کر مولانا وصی اللہ صاحبؒ نے اپنی عام عادات کے خلاف دارالعلوم کے لئے مالی اعانت کی اپیل کی جس سے دارالعلوم میں ہزاروں روپے پہونچ گئے۔

اوپر عرض کر چکا ہوں کہ وہ اعتدال توازن اور نرم خوئی کا مجسمہ تھے۔ کسی مسئلہ کے سلسلہ میں وہ شدت کو پسند نہیں کرتے تھے اسی طرح ہندوستان کی مسلم جماعتوں کے سلسلہ میں بھی ان کا طرز عمل ہمیشہ اعتدال کا رہا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر طبقہ میں قبول کر لئے جاتے تھے۔

سنہ ۱۹۴۰ء میں ندوہ کے طلبہ کا ایک وفد دارالعلوم دیوبند کے لئے گیا تھا اس وقت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ

اللہ علیہ حیات تھے۔ انہوں نے اور قاری صاحب نے وفد کا اعزاز کیا اور ان کے استقبال میں مسجد کے اندر ایک جلسہ کیا۔ جس میں قاری صاحب نے تقریر فرمائی۔ اور اکبر الہ آبادی وہ مشہور قطعہ پڑھا جس میں دارالعلوم دیوبند اور علی گڈھ کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔

سیاست میں بھی ان کا طرز عمل انتہا پسندی کا کبھی نہیں رہا۔ وہ دارالعلوم کے مصالح کو پیش نظر رکھتے تھے ایمرجنسی کے زمانہ میں ان کے ایک بیان سے کچھ لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ فیملی پلاننگ کے موافق ہو گئے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ ان کے بیان کا خلاصہ یہ تھا کہ کسی مسئلہ میں جائز اور ناجائز کا فتویٰ دینا دارالعلوم کے دارالافتار کا کام ہے اور وہ فتویٰ دے چکا کہ یہ جائز نہیں۔ البتہ یہ مسئلہ چونکہ نیا ہے اس لئے اس پر علمار کو غور کرنا چاہئے کہ اس کی کچھ صورتیں بعض حالات میں مباح ہو سکتی ہیں یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ اس میں کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے۔

اللہ تعالےٰ نے ان کو علمی و دینی حیثیت کے ساتھ دنیادی وجاہت سے بھی نوازا تھا اسی وجہ سے ان کے گھر معاشرتی زندگی میں جو رکھ رکھاؤ تھا یا تھوڑی جدیدیت تھی وہ بھی بہت کم سواد لوگوں کی نظروں میں کھٹکتی اور وہ اس کو ان کا سب سے بڑا عیب بنا کر پیش کرتے تھے۔

کوربختاں آرزو خواہند   مقبلاں را زوال نعمت وجاہ

بہرحال دارالعلوم میں تعلیم ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی اور نظم و انتظام چل رہا ہے اور چلتا رہے گا مگر ان کی ذات سے جو اس کو دینی و علمی وقار حاصل ہوا تھا وہ آسانی سے پورا نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ قاری صاحب کو اعلیٰ علیین میں جگہ عنایت فرمائے اور ملک کی امانت دارالعلوم کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے اور اخلاص وللّٰہیت جو اس ادارہ کی سب سے بڑی خصوصیت تھی اس کے کارکنوں اساتذہ اور طلبہ کے سینوں میں پھر سے جاگزیں کر دے۔

خادم

مجیب اللہ ندوی ناظم جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ

از قلم جناب مولانا اسیر صاحب ادروی
استاذ جامعہ اسلامیہ بنارس

حضرت قاری صاحب کی تصانیف پر ایک نظر

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی شہرت ایک سحر البیان خطیب اور شیریں بیان مقرر کی حیثیت سے تھی۔ ان کا ظاہری جاہ و جلال، حسن و جمال، رکھ رکھاؤ، لباس کی پاکیزگی و زیبائی، پر وقار چہرہ، عالمانہ تمکنت و وجاہت ان تمام خصوصیات نے مل جلکر ان کی شخصیت کو دلکش اور پر وقار بنا دیا تھا، پہلی ہی نگاہ میں ان کو دیکھنے والا مرعوب اور متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ ایک خطیب اور شیریں بیان مقرر کی جملہ خصوصیات سے متصف تھے، کشیدہ قامت دلکش شخصیت، سرخ و سپید چہرہ، مخصوص لب ولہجہ، واضح اور صاف لہجہ و آواز، انداز گفتگو میں توازن و اعتدال، خودداری و خود اعتمادی، موضوع کے لحاظ سے الفاظ کا استعمال، احادیث و قرآن کے ایک ایک لفظ سے حکیمانہ نکتہ آفرینی خالص عالمانہ زبان میں حقائق و معارف اور اسرار و حکم کی ایسی نقاب کشائی فرماتے تھے کہ علماء صلحاء، زہاد، اساتذہ علم و فن تو ایک طرف عوام اور کم پڑھے لوگ بھی مسحور ہو کر رہ جاتے تھے۔ زبان جادو کرتی تھی اور انداز بیان دلوں کو جیت لیتا تھا۔

الفاظ و معانی کے پھول برساتی ہوئی زبان، شان و شوکت سے مرصع و مسجع کلام، مخصوص لب ولہجہ، خاص طرز ادا کے ساتھ موضوع کے دائرے میں رہتے ہوئے ہر ممکن مواد کو سمیٹتی ہوئی، علم و حکمت کا نور بکھیرتی چلی جاتی تھی۔ سلجھا اور نکھرا ہوا انداز بیان، معیاری اور دقیق عالمانہ زبان، پر شوکت الفاظ کے ساتھ حسن اخلاص مضمون سے لگن۔ موضوع سے وابستگی و وفاداری، علم کی گیرائی و گہرائی، مطالعہ کی وسعت، پیشکش کا خوب صورت سلیقہ دلوں پر سحر کرتا چلا جاتا تھا۔ ان کی دقت نظر سلامتی ذہن اصابت رائے، احتیاط و تیقظ، اکابر علماء و بزرگان دین کی صحبت و تربیت، تقویٰ و طہارت، اخلاص و بے نفسی، غیر جذباتی ٹھنڈی طبیعت علوم متداولہ پر عبور اور تبحر علمی سے متاثر ہوئے بغیر کوئی شخص نہ رہ سکتا تھا۔

حضرت قاری صاحب درحقیقت ممبر و محراب کے بزرگ تھے۔ اسی میدان میں ان کے جوہر بھی کھلے کیوں کہ ان کا حقیقی میدان یہی تھا، اپنی زندگی اور ماحول، عہدہ و منصب، ذمہ داری و فرائض کے لحاظ سے بھی خطابت و شیوا بیانی ان کی ضرورت تھی اور وہ ان کی ذات کا ایک ضروری عنصر بن گئی۔

قاری صاحب بحیثیت مصنف

اپنے فرائض و ذمہ داروں کی مصروفیتوں اور طول طویل سفار کے باوجود درجنوں کتابیں بھی یادگار چھوڑی ہیں۔ ہر کتاب اپنے مواد، اپنی معلومات، اپنے دلائل و براہین، استنباط مسائل و استخراج نتائج حکیمانہ نکتہ آفرینیوں پر شوکت

اور مرعوب کن کلامی مباحث کے لحاظ سے اپنا ایک خاص امتیاز و مقام رکھتی ہے۔ ان کتابوں کو پڑھ کر قاری محسوس کرتا ہے کہ دائرۂ معلومات میں بہت سی ایسی باتیں ضرور آ گئی ہیں جن پر اب تک ان کی نگاہیں نہیں پڑی تھیں ہر کتاب قاری صاحب کی مخصوص طرز تحریر کے ساتھ عالمانہ محققانہ مباحث مباحث، زبان و بیان کی رعنائیوں اور دل آویزیوں سے آراستہ و پیراستہ ہے۔

قاری صاحب کی اکثر کتابوں کا اپنا اپنا ایک تاریخی پس منظر ہے۔ ہر کتاب کسی ناگزیر ضرورت کے پیش نظر معرض تحریر میں آئی ہے۔ ایسا کم ہے کہ خود قاری صاحب کے ذہن نے کوئی علمی موضوع منتخب کیا ہو اور اس پر غور و فکر کے بعد اپنی کتاب مرتب کی ہو بلکہ اکثر ہوتا یہ رہا ہے کہ کسی نے ان سے علمی و مذہبی سوالات کئے یا ان کے گرد و پیش کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ اس میں مسلمانوں کی رہنمائی کی شدید ضرورت محسوس ہوئی یا اسلامی حلقوں میں کسی فتنہ نے سر اٹھایا اور اس کے دفعیہ کی ایک عالم دین کی حیثیت سے اُن پر ذمہ داری عائد ہوئی اور انہوں نے قلم اٹھا لیا اور مختصر جواب یا مضمون کے بجائے ایک مستقل کتاب تیار ہو گئی۔

قاری صاحب عرصہ دراز تک اسلامی دنیا کے ایک عظیم ترین مذہبی ادارے کے سربراہ رہے جس ادارے سے وابستہ عام اہل علم کا ملک میں ایک اہم پُر وقار اور بلند علمی مقام تھا۔ یہ ادارہ اپنی علمی و مذہبی خدمات اصلاح مفاسد و بدعات اور اسلامی دستور حیات و تعلیمات و روایات کو ہر قسم کی آمیزشوں اور آلائشوں سے پاک صاف، مصفیٰ و مجلیٰ رکھنے اور ان کو روشن و تابناک بنانے کی جہد مسلسل کی وجہ سے مستقل ایک مکتبۂ فکر بن گیا تھا۔ قدرت نے اس ادارہ میں ایسی عبقری شخصیتیں پیدا کیں جو اپنی بے پناہ علمی صلاحیتوں اور علوم اسلامی پر مبصرانہ نگاہ کی وجہ سے اپنے اندر اجتہادی شان رکھتے تھے۔ فرق باطلہ میں ان کی علمی شہرت نے زلزلہ ڈال دیا تھا ان کیلئے ان کی زبان ان کا قلم شمشیر براں کی تیزی اور رعد و برق کی کڑک اور گرج رکھتا تھا۔ انھیں اسباب کی بنا پر اسلام پر اعتراض کرنیوالے بھی انہیں کو اسلام کے ترجمان کی حیثیت سے خطاب کیا۔ اپنے شکوک و شبہات اور اعتراضات انھیں کے سامنے پیش کئے اسی کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات و روایات سے محبت رکھنے والوں ان کو روشن و تابناک دیکھنے کی تمنا رکھنے والوں کی نگاہیں بھی انہیں کی طرف اٹھتی تھیں جب اسلام پر اور اس کی تعلیمات و روایات پر کسی طرف سے کوئی حرف آتا تھا۔

قاری صاحب تو اس ادارہ کے سربراہ ہی تھے۔ اس لئے قدرتی طور پر اس طرح کے سوالات ان کے سامنے پیش کئے جاتے تھے خود قاری صاحب اپنی ذہنی و طبعی ساخت و پرداخت اور ایک عظیم علمی سلسلۃ الذہب سے وابستہ ہونے کی حیثیت اور ذہن و مزاج کے لحاظ سے انہیں علماء کے گروہ میں شامل تھے۔ جنھوں نے کچھ ہی دنوں پہلے عیسائیت کے دہاڑتے ہوئے سیلاب کے آگے بند باندھا تھا، آریوں کی یورشوں اور بدزبانیوں کا سد باب کیا قادیانیوں کے طائر فکر و خیال کے پر نوچ کر ان کی قوت پرواز چھین لی تھی انھیں اسباب کی وجہ سے جب وہ ملک میں اصلاحی و تبلیغی دورے کرتے تھے تو ان سے ہر طرح کے لوگ ملتے تھے اور وہ اپنے اشکالات شکوک شبہات

پیش کرتے تھے۔

ان شکوک و شبہات، اعتراضات و اشکالات کو دور کرنا وہ اپنا مذہبی و دینی فریضہ تصور کرتے تھے اور اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے اور وہ قلم ہاتھ میں اٹھا لیتے تھے عام طور پر قاری صاحب کی تصانیف کا یہی پس منظر ہے۔ میں نے قاری صاحب کی تصانیف کا تعارف کرتے ہوئے ان کے پس منظر بتانے کی بھی کوشش کی ہے تاکہ کتاب کے مباحث کو اس سے سمجھنے میں سہولت اور مدد ملے اور کتابوں کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے میرے سامنے قاری صاحب کی جو تصانیف ہیں میں نے انھیں پر اظہار خیال کیا ہے اگر ان کی کچھ اہم تصانیف کا ذکر اس مضمون میں نہیں ہے تو یہ سمجھ لیجئے کہ مجھے وہ کتاب دستیاب نہیں ہوئی اور تا دم تحریر مجھے نہیں مل سکی۔

اجتہاد اور تقلید

ہندوستان میں تقلید و عدم تقلید کی بحث ایک صدی سے چلی آرہی ہے اس مسئلہ پر چھوٹی بڑی کتابیں لاتعداد ہیں، مباحثے و مناظرے بھی بڑی تعداد میں ہوئے جو بالعموم چند فروعی مسائل تک محدود رہے اس ماحول اور بحث و مباحثہ نے تعلیم و تعلم کے طریقہ کو بھی ایک خاص رنگ میں رنگ دیا، احادیث کے اسباق میں قرأۃ خلف الامام، آمین بالجہر، رفع یدین، رکعات تراویح کی تعداد کے مسئلے پر اساتذہ دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں اور طلبہ کے ذہن میں ان مسئلوں کے سارے پہلوؤں کو اتنی تفصیل سے جاگزیں کر دیتے ہیں کہ ذہین طلبا ان مسائل کے دلائل دونوں طرح کی حدیثوں کے درمیان تطبیق، احادیث کی صحت و ضعف اس سلسلہ کے راویوں کی جرح و تعدیل تک سے واقف ہو جاتے ہیں۔ زیادہ تر یہ بحث انھیں چند جزئی مسئلوں تک محدود رہتی ہے ان مسئلوں نے ہندوستان میں دو گروہ بنا دیئے جو آج تک قلمی معرکہ آرائیوں اور برد آزمائیوں میں معروف ہیں۔ ان مسائل کی بحث ابھی ناتمام ہے ایک صدی گذر چکی لیکن ہنوز روز اول ہے۔ ہندوستان کی فضا میں اب بھی ھل من مبارز کی صدا گونجا کرتی ہے۔

ان دونوں گروہوں کا بنیادی اختلاف تقلید و عدم تقلید کا مسئلہ ہے جو اجتہاد کی ضرورت اور اس کے شرائط کی تفصیلات پر منحصر ہے اگر یہ مسئلہ حل ہو جائے تو سارے مسائل از خود حل ہو جائیں۔ آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے تک ہندوستان کے مسلمان میں ساری تباہیوں اور بربادیوں کے باوجود اس بحث و مباحثہ سے دلچسپی باقی رہی اور اس دور کے ہر قابل ذکر عالم نے جس کے ہاتھ میں قلم تھا اس مسئلہ پر کوئی کتاب کوئی رسالہ ضرور لکھا شبلی جیسا مورخ اسلام اور محقق انسان بھی اس گروہ بندی اور ہنگامہ آرائی سے دامن نہ بچا سکا اور اسکات المعتدی لکھ کر ان مجاہدین کی صف میں شامل ہو گیا جو عدم تقلید کے خلاف مصروف جہاد تھی۔

قاری صاحب کا دور شباب اسی ماحول اور فضا میں گذر رہا تھا وہ کیسے اس سے دور رہ سکتے تھے۔ اس لئے اس فضا سے متاثر ہو کر آپ نے بھی ایک مختصر رسالہ اجتہاد و تقلید کے نام سے سپرد قلم کیا۔ اور حق یہ ہے کہ بحث کا حق ادا کر دیا۔ آپ نے اپنی خداداد صلاحیتوں کے بدیع المثال نمونے پیش کئے ہیں جنکی طرف ابھی ایسی کوئی غائرانہ نظر نہیں ڈالی گئی تھی اور اپنی حکیمانہ نکتہ رسی کی وجہ سے مباحث کے ایسے ایسے پہلوؤں کو منصۂ شہود پر

لائے ہیں جن کی طرف عام طور سے اہل علم کے ذہن نہیں گئے تھے اس رسالہ میں بھی انہوں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی اور وہ راہ نہیں اختیار کی جس پر دوسروں کے ہزاروں نقوش قدم پہلے سے موجود تھے بلکہ انہوں نے اپنی راہ خود نکالی۔

آپ نے اصل بحث سے پہلے گفتگو کا آغاز تکوین و تشریع کے درمیان ایک تعلق خاص کو بتاتے ہوئے نتیجہ نکالا کہ جسطرح کائنات عالم کے کلی مادے آب و خاک و باد و آتش پھر ان کے کلی موالید جمادات، نباتات حیوانات پھر ان کے علویات اور سفلیات پھر موالید علوی و سفلی کی جامع انواع و اجناس انسان، شیر، بکری شجر، حجر، بحر و بر، جن و ملک، سیارات و ثوابت، ارض و سما وغیرہ وغیرہ کی یہ مجموعی ہیئت جسے عالم کہتے ہیں اب کوئی کمی بیشی قبول نہیں کر سکتے اسی طرح دین کے اصول و کلیات اساسی، قواعد و ضوابط اور تمام منصوص عقائد و احکام کی اس مجموعی ہیئت کذائی میں جسے اسلام کہتے ہیں کوئی کمی بیشی اور ترمیم و تنسیخ نہیں ہو سکتی کیوں کہ لن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا کہدیا گیا ہے۔

یہ نتیجہ نکالنے کے بعد قاری صاحب نے بتایا کہ جس طرح کائنات کا نظام درجہ تکمیل کو پہونچ جانے کے بعد اس میں تغیر و تبدل نہ ہوتے ہوئے بھی سیکڑوں اور ہزاروں پہلو ایسے ہیں جو اب تک نگاہوں سے مخفی ہیں اور جب غور و فکر سے کام لیا جاتا ہے تو ایسے ایسے عجائب و غرائب نگاہوں کے سامنے آتے ہیں جہاں تک عقل انسانی کی ابتک رسائی نہیں ہوئی تھی، اسی طرح تشریع کے منتظم احکام و مسائل اور قواعد و کلیات کے مخفی علوم و اسرار کا پتہ لگا کر ان سے تمدن کے نئے نئے فروعی مسائل لطائف و ظرائف اور حقائق و معارف پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ تکوینی اکتشافات کا نام ایجاد ہے اور تشریعی استخراج کا نام اجتہاد ہے۔

آپ نے کتاب میں آگے چلکر بتایا کہ اجتہاد کا رنگ ہر دور کی علمی ذہنیت اور تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے مجتہد انہیں کے مسائل کے استخراج پر اپنی توجہ مرکوز رکھتا ہے جن کی اس دور کو ضرورت ہوتی ہے اور جب ضرورت پوری ہو جاتی ہے تو اس کے بعد اجتہاد کا وہ دور نہیں لوٹتا جو آچکتا ہے کیوں کہ زمانہ کو بات حاصل ہو چکی ہوتی ہے اب صرف اس سے نفع اٹھانے کا موقعہ رہ جاتا ہے۔ آپ نے مزید ارقام فرمایا کہ ہر دور میں مسلمانوں میں دو طبقے رہے ایک وہ جن میں قدرت نے استنباط و استخراج مسائل کی فطری صلاحیت ودیعت کر دی تھی اور دوسرے وہ لوگ جو اس نعمت عظمیٰ میں ان کے شریک نہیں تھے، جن کی احادیث کے ذخیرہ پر نگاہ ہے وہ جانتے ہیں کہ صحابہ کرام میں بھی دو طبقے موجود تھے۔ بعض صرف حافظ حدیث تھے اور بعض فقیہ و مجتہد تھے جیسے ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، ابن مسعودؓ حضرات شیخین رضی اللہ عنہم، پھر فقہائے صحابہؓ میں بھی فرق مراتب تھا بعض کے ذہن کی رسائی بہت گہری تھی اور بعض کی اس سے کم کیوں کہ ملکۂ اجتہاد وہبی ہوتا ہے کسبی نہیں۔ بعض اس کے اہل ہوتے ہیں بعض نہیں احادیث قرآن اور واقعات صحابہ سے بہت سی مثالیں دیتے ہوئے اس فرق مراتب کو آپ نے واضح کیا ہے۔

فرق مراتب کی موجودگی نے یہ ثابت کر دیا کہ اگر اجتہاد ضروری ہے تو تقلید بھی ضروری ہو جاتی ہے ظاہر ہے کہ قدرت نے جن لوگوں کو قوت اجتہاد نہیں دی ہے ان کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا ہے کہ وہ اس مسئلہ میں جو اس کی دسترس سے باہر تھا مجتہد کی تقلید کرے اور اس پر عمل کرے جب خود علم نہیں رکھتا ہے تو علم والے کی اتباع کرے خود ان مخفی دلائل و علل تک نہیں پہونچ سکتا ہے تو ان بیان اسرار و علل کے سامنے جھک جائے کیوں کہ علم کے دو ہی مرتبے ہیں یا تو خود سمجھنا یا سمجھے ہوئے لوگوں کی اطاعت کرنا اس کے علاوہ کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون اس دعوی کی تائید کیلئے شاہد عادل ہے۔

اسلامی تاریخ سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ قرون اولیٰ میں بھی یہی صورت حال رہی اگر کوئی صحابی مجتہد ہے تو دوسرے صحابی مجتہد صحابی کے قول پر عمل کرتے تھے واقعات شاہد ہیں عبد اللہ بن عمر سے پوچھا گیا کہ قرض دینے والا قرض کی مدت سے پہلے قرض ادا کرنے پر قرض کا کچھ حصہ کم کرنے کے لئے تیار ہے تو کیا یہ درست ہوگا۔ آپ نے اس کو ناپسند فرمایا اور ایسا کرنے سے منع کیا جبکہ اس سلسلہ میں کوئی مرفوع حدیث موجود نہیں تھی ظاہر ہے کہ یہ ان کا اجتہاد تھا۔ اسی طرح حضرت عمر فاروق سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے دوسرے شخص کو اس شرط پر غلہ دیا کہ وہ دوسرے شہر میں اس کو ادا کرے گا حضرت عمرؓ نے منع فرمایا اور کہا کہ بار برداری کا کرایہ کہاں گیا؟ اس مسئلہ میں بھی کوئی حدیث مرفوع حضورؐ سے مروی نہیں کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ حضرت عمرؓ کا اجتہاد تھا مذکورہ بالا دونوں مسئلوں پر عمل کیا گیا سائلین نے حضرت عمرؓ اور حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ کی باتیں مانی اور انہیں پر عمل بھی کیا۔ سوال کرنے والوں نے ان حضرات سے دلیل کا مطالبہ نہیں کیا حالانکہ سائل و مسئول دونوں صحابی ہیں لیکن ایک میں اجتہادی ملکہ تھا دوسرے میں نہیں اس لئے جو اہل علم نہیں تھے انہوں نے اہل علم کی رائے پر عمل کیا اور ان کی اتباع کی۔

آپ نے اس شبہ کا ازالہ بھی دلائل و براہین کی روشنی میں بہت واضح طور پر کر دیا کہ اجتہاد کا دروازہ ہر ایک کیلئے کھلا ہوا ہے اور ہر ابجد خوان مدعی اجتہاد بن جائے شریعت اسلامیہ میں اس کی گنجائش نہیں ہاں عام تحقیق و تلاش کتاب و سنت میں تدبر ان کے لطائف و حقائق کا استخراج ہر زمانہ کے تکوینی حوادث سے تشریعی مسائل کو تطبیق دے کر مناسب فتوی دینا، معاندین اسلام کے نئے نئے شکوک و شبہات اور اعتراضات کی تردید کیلئے نصوص شرعیہ سے استنباط کرنا، اصول اسلام کے اثبات اور تحقیق کے لئے کتاب و سنت سے تائید پیدا کرنے کا کام باقی ہے اور ہر دور میں اہل علم کیلئے میدان کھلا باقی ہے۔ اجتہاد کی یہی نوع کل بھی تھی اور آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی اجتہاد کی بحث سے لازمی طور پر ہر شخص کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ مجتہدین کی رایوں میں اختلاف کی صورت میں تو سوائے امت کی تفریق کے اور کیا حاصل ہوگا۔ امت میں اختلاف ہے کہ شریعت کے احکام کی کوئی معین صورت اور تحقیقی شکل باقی نہیں رہے گی۔ یہ اختلاف رحمت کے بجائے زحمت بن جائے گا اس خلجان کو دور کرنے کے لئے قاری صاحب نے ایک لطیف اور دقیق بحث چھیڑی ہے اور انہوں نے عقل و درایت کی روشنی

میں اسے امت کیلئے رحمت ہی ثابت کیا ہے اس مسئلہ کو واضح کرنے کیلئے آپ نے جو مقدمات ترتیب دیئے ہیں عقل کو اپیل کرنے والے ہیں اس لئے آپ نے ان مقدمات سے جو نتیجہ نکالا ہے عقل اسے ازخود قبول کر لیتی ہے۔

قاری صاحب نے اس دکھتی ہوئی رگ پر بڑے ماہرانہ انداز میں نشتر لگائے ہیں جس کو تقلید شخصی کہہ کر بدنام کیا جاتا ہے۔ آپ نے محکم دلائل سے جب بات کر دیا کہ اجتہاد مشروع ہے اجتہادیات پر عمل بھی مشروع ان کا مجموعی ذخیرہ فراہم کرنا بھی شرعی چیز اس مجموعہ کا نام رکھنا بھی شرعی بات ہے تو اس کے بعد آپ نے بتایا کہ اجتہادیات میں غیر مجتہد کیلئے تقلید کرنا بھی ناگریز اور ضروری ہو جاتا ہے یہ صحیح ہے کہ اجتہادی مسئلوں میں دو رائیوں یا اس سے زیادہ کا ہونا فطری اور قدرتی بات ہے اور ہے اور وہ دائرہ شرع میں داخل ہے تو ایسے اختلافی مسائل میں تقلید شخصی بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ آپ نے عقلی مقدمات ترتیب دے کر بطور نتیجہ ثابت کیا ہے کہ ایک مسلمان کیلئے تقلید شخصی کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے اگر ایک شخص اپنی صوابدید کے مطابق کسی مسئلہ میں کسی امام کی رائے پر عمل کرتا ہے اور دوسرے مسئلہ میں دوسرے ائمہ کی تقلید کرتا ہے تو جس لمحہ بھی وہ کسی امام کی تقلید کرے گا تو وہ تقلید شخصی ہی تو ہوتی ہے کیونکہ دو متخالف رایوں پر بیک وقت عمل ممکن نہیں ہے اس لئے جب کسی مسئلہ خاص میں کسی امام کی رائے ترک کر کے دوسرے امام کی رائے پر عمل کرتا ہے تو وہ بھی تقلید شخصی ہوئی فرق یہ ہے کہ پہلے امام کے بجائے اب اس نے دوسرے امام کی رائے قبول کر لی ہے پہلے امام کی رائے کو ترک کر دیا ہے۔

سب سے آخر میں آپ نے اس بحث کو چھیڑا ہے جو حاصل کلام ہے اور جس کے لئے یہ کتاب معرض وجود میں آئی ہے اور وہ مسئلہ ہے امام واحد کی تقلید کا اگر تقلید ضروری ہے تو پھر ایک ہی امام کی تقلید کیوں ضروری ہے ظاہر ہے کہ ہر امام اور مجتہد کا اہل علم میں شمار ہے اور جن میں اجتہاد کی صلاحیت نہیں وہ اہل علم نہیں ٹھہرے اب وہ کسی بھی اہل علم یا مجتہد کی رائے پر عمل کرتا ہے تو اس کا یہ فعل عین شریعت اور منشار شریعت ہونا چاہیئے ایک شخص بعض مسائل میں ابو حنیفہ کی تقلید کرتا ہے اور بعض مسائل میں امام مالک کی رائے پر عمل کرتا ہے کچھ ایسے مسئلے ہیں جن میں وہ امام شافعی کی رائے کو قبول کر لیتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے بہرحال میں وہ مجتہد اور اہل علم ہی کی رائے کا حامل ہوتا ہے پھر یہ بات اس کے لئے ممنوع کیوں ہو گئی جبکہ وہ فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لاتعلمون پر عمل کرتا ہے۔

قاری صاحب نے اس بحث کو بڑی تفصیل سے تحریر فرمایا ہے۔ اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ بیک وقت ایک سے زیادہ ائمہ کی تقلید کی صورت میں بعض مسائل میں جزیاتی تناقض ہوگا۔ بعض میں ان جزئیات کے کلیوں اور اصولوں میں تناقض نمایاں ہوگا اور پھر اس دعویٰ کو درجنوں مثالوں سے واضح کیا ہے اور تناقض کی مختلف صورتوں کو تحریر کیا ہے پھر بتایا ہے کہ کسی مجتہد کے مزاج میں توسع کا غلبہ ہے اور کسی کے مزاج میں احتیاط کا۔ کسی میں شدت عمل ہے کسی کا مزاج لینت، کسی میں جمعیت کا غلبہ ہے اور کسی میں جامعیت کا کسی

کسی میں دیانات کا وفور ہے اور کسی میں اس کے ساتھ سیاست و نظم اور اجتماعیات کا بھی اعلیٰ شعور ہے کسی میں ظاہریت کا غلبہ ہے اور کسی میں باطنیت کا، کسی میں تاسّی باسوۃ السلف کا غلبہ ہے اور کسی میں رجحانات سلف کے تتبع و استقرار کا ظاہر ہے کہ جہاں ظاہریت غالب ہوگی وہاں سب سے بڑا مرجع ظواہر روایت ہوں گی اور جہاں باطنیت کا غلبہ ہوگا وہاں سب سے بڑا مرجع بواطن روایت یعنی درایت ہوگی جس امام کی جو ذہنی خصوصیت ہوگی وہی اس کے اصول استنباط سے جھلکیگی اور پھر وہی خصوصیات ان اصولوں کے تحت مستنبط شدہ جزئیات سے مترشح ہوں گی اور انہیں خصوصیات کا خاص رنگ بالآخر ان افراد کی ترتیب کرے گا جو اس فقہ پر عامل ہوں گے۔ ایک سے زائد امام کی تقلید کرنے والا ہر جگہ متضاد خصوصیات کے مابین متعارض جزئیات کا شکار ہو کر پھر کلیاتی تناقض کا شکار ہوگا اس مقلد میں دو ذوقی رنگ اپنے تناقض کے ساتھ جمع ہونے کی کوشش کریں گے جس کا لازمی نتیجہ روحانی مزاج میں فساد ہوگا اور دو متضاد اثرات کی کشاکش میں گرفتار ہو کر پراگندہ حال بن جائے اور اس میں عملی فساد پیدا ہو جائے اس طرح شریعت اسلامیہ کی طرف سے عائد کردہ فرائض کی اصل روح اس کے عمل سے ختم ہو جائے گی اور شریعت بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائیگی۔

قاری صاحب نے اس پامال موضوع پر اپنے نکتہ آفریں دماغ اور دقیقہ رس نگاہ سے کام لیکر روایت و درایت کی روشنی میں اتنی لطیف بحث کی ہے کہ عقل اس سے حاصل شدہ نتائج کو قبول کرنے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے اب تک اس مسئلہ پر اردو میں بہت کم ایسی کتابیں وجود میں آئی ہیں اپنی متکلمانہ انداز بیان میں روایات و آیات قرآنی سے ایسے لطیف نکتے پیدا کرتے ہیں جہاں تک عام اہل علم کے ذہنوں کی رسائی مشکل سے ہوتی ہے پوری کتاب استخراجِ نتائج کے اس خصوصی پہلو کے لحاظ سے شاہکار ہے۔

علم غیب

ہندوستانی مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا ہے جو اسلامی تعلیمات و روایات میں عیسائیوں اور یہودیوں کی طرح افراط و تفریط کا شکار ہے۔ عقائد و مسائل میں یہ افراط و تفریط اس کے ذہن کی پیداوار اور اس کی کم فہمی و کوتاہ علمی کا نتیجہ ہے جسطرح حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں ان پر ایمان والے تو کم ہی رہے اور اتنی تعداد بھی نہ ہو سکی کہ وہ اپنے پیغمبر کو دشمنوں سے بچا سکیں جب وہ پھانسی پر چڑھانے کے لئے لیجا رہے تھے اور جب یہودیوں نے اپنے خیال کے مطابق پھانسی دے دی تو پھانسی کی لکڑی ساری دنیا کے عیسائیوں کے گلے کا ہار بن گئی صلیب یا اس جیسے ہی ان کے مذہبی شعار میں داخل ہو گئی ایک طرف تو ان کو پیغمبر تک ماننے میں تامل رہا اور جب پیغمبر ماننے پر آمادہ ہوئے تو ان کو اتنا بڑھایا کہ خدا بنا دیا آج پوری عیسائی دنیا اسی وجہ سے تثلیث کے شرک میں گرفتار ہے یہ افراط اور غلو محبت کے اظہار کی حد ہے۔ جبتک پیغمبر نہیں مانا تو کافر مطلق رہے اور جب ان کی عظمت کو پہچاننے کی گھڑی آئی تو

مشرک مطلق ہو گئے۔ کچھ یہی حال ہندوستان میں اس گروہ کا ہے اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت، علوم اسلامی کی تعبیر و تشریح، احادیث و قرآن کی تفسیر و تشریح، اسلام دشمن قوتوں اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنے، دوسرے مذاہب کے اہل علم کے اسلام اور بانیٔ اسلام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراضات کے جوابات دینے، ملک میں اسلام اور مسلمانوں اور ان کے شعائر کو محفوظ کرنے کا کوئی کام بحیثیت مسلمان ہونے کے اپنے ذمہ نہیں سمجھتے، مسلمان تباہ ہوتا ہے بجود جبر کے ہاتھوں مجبور ہو کر مرتد ہوتا ہے ہو جائے، مسجدیں اصطبل بنا دی جائیں ہو جانے دو مسلمانوں کی جان مکھی مچھر سے زیادہ کم قیمت بنا دی جائیں، بن جانے دو اسلام کا نام لینے والوں پر عرصہ حیات تنگ کیا جائے ان کی بلا سے ان کو نہ ان باتوں کا غم ہے اور نہ پروا، نہ اس کی صلاحیت نہ جذبہ، لیکن جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے زبانی دعویٔ محبت کے اظہار پر آمادہ ہوئے تو ان کو رسول اور پیغمبر کے بجائے خدا اور خدائی طاقت و قوت کا مالک بنا دیا اور ساری صفات خداوندی کو حضورؐ کی ذات سے وابستہ کر دیا۔

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفےٰ ہو کر!

وہ مالک کائنات بھی ہیں اور مختار کل بھی اور جنت و دوزخ کی کنجی بھی آپ کے دست مبارک میں ہے اور ہر جگہ حاضر و ناظر بھی، ازل سے ابد تک کا پورا علم بھی ہے اور سارے مغیبات کا اسی طرح علم رکھتے ہیں جیسے خداوند قدوس کا علم محیط ہے جس کو چاہیں جنت دے دیں جس کو چاہیں جہنم میں بھیج دیں، وغیر ذالک

اسی گروہ نے علم غیب کے مسئلہ کو پیدا کیا ہے اس مسئلہ پر چھوٹی بڑی اتنی کتابیں رسالے، اور مضامین اردو میں لکھے جا چکے ہیں کہ مزید اس پر اضافہ کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اب اس مسئلہ پر کوئی نئی کتاب سامنے نہیں آتی ہے اور فضا میں ایک طرح کی خاموشی ہے۔ قاری صاحب نے آج سے بہت پہلے جب ملک میں اسلامی ذہن رکھنے والوں اور دل و دماغ سے سوچنے والوں اور پیٹ سے سوچنے والوں کے درمیان معرکہ کارزار گرم تھا تو آپ نے علم غیب کے نام سے یہ کتاب لکھی تھی اور شائع تو اور بعد میں ہوئی جب شور و غوغا ایک حد تک خاموش ہو چکا تھا۔

"علم غیب کسے کہتے ہیں؟ قاری صاحب نے بات یہیں سے شروع کی ہے۔ قدیم علماء کی کتابوں سے علم غیب کے مفہوم کو واضح طور پر پیش کرتے ہوئے حاصل کلام یہ بتایا کہ غیب وہ ہے جو انسان کی اپنی کسی بھی ادراک کی قوت سے خواہ ظاہری ہو یا باطنی حاصل نہ ہو سکے اور حواس و عقل اور کشف اکتشاف سے بالاتر ہو اور جب علم غیب کا یہ معنی متعین ہو گیا تو علم غیب کے لئے جو وسائل امت کے حق میں منفی ہیں یعنی عقل و نظر فکر و بصیرت وغیرہ وہ نبی کے حق میں بھی بدستور منفی رہیں گے کہ انبیاء کو بھی ان وسائل سے علم غیب حاصل نہیں ہوگا البتہ غیب کی خبر پیغمبر کے بجائے پیغمبری و رسالت و نبوت خدا کی خبر اور علم غیب کا ذریعہ

بنیں گی جس کو وحی کہتے ہیں. معلوم ہوا مخلوق کیلئے علم غیب کا ذریعہ صرف وحی ہے. جو پیغمبر پر براہ راست آتی ہے اور امتی کو پیغمبر کے ذریعہ سے اس طرح نبی اور امتی صرف خدا کی اطلاع ہی سے غیب پر مطلع ہو سکتے ہیں خود اپنی کسی ادراکی قوت، عقل و نظر یا حس و وجدان سے مطلع نہیں ہو سکتے اور ظاہر ہے کہ علم غیب وہی کہا جائے گا جو بلا واسطہ اسباب ہو اور جب وہ بالواسطہ آئے گا تو وہ حقیقی معنی میں علم غیب نہیں ہوگا، اہل اللہ کو کشف والہام کے ذریعہ کسی بات کا علم ہو جائے تو عُرفاً اسے علم غیب کہیں گے کہ غیبی امور کا انکشاف ہوا لیکن شرعاً علم غیب نہیں کہیں گے علم کے جملہ حسی وسائل ہوں یا معنوی. کھلے ہوئے ذرائع ہوں یا چھپے ہوئے ان سے حاصل شدہ علم کو شرعاً علم غیب نہیں کہا جائیگا اور ظاہر ہے کہ جب اصطلاحاً علم غیب وہی ہوگا جو عادی وسائل سے بالاتر ہو کر بلا توسط اسباب از خود ہو تو اس معنی میں علم غیب بجز ذات بابرکات خداوندی اور کسی کیلئے نہیں ہو سکتا کیوں کہ غیر خدا کو جب بھی علم ہوگا اور جیسا بھی ہوگا وہ عطاء الٰہی ہوگا اور وسائل و اسباب میں سے کسی نہ کسی وسیلہ کے واسطے ہوگا خواہ وحی سے ہو یا کشف والہام سے تجربے سے ہو یا حواس سے یا عقل و خرد سے، ظاہری اسباب کے راستہ سے ہو یا باطنی اور معنوی اسباب کے طریق سے، ظاہر ہے کہ ان معنوں میں علم غیب خاصۂ خداوندی نکل آتا ہے

قاری صاحب نے اپنے دعویٰ کو متعدد آیتوں سے مدلل و مبرہن کیا ہے. الفاظ قرآنی سے ایسے حکیمانہ نکتے اور الفاظ کی معنوی وسعت کو ظاہر کرتے ہوئے اس کے حقیقی مقصود کو اس طرح واضح کیا ہے کہ دل استدلال واستنباط نتائج سے قطعی طور پر مطمئن ہو جاتا ہے. آیتوں کی تفسیر و تشریح کرتے ہوئے آیت کے ایک ایک لفظ اور آیتوں کے انداز بیان سے غیر اللہ سے علم غیب کی کلی نفی اور اس سے متعلق ہر شبہہ کا حل اور ذہنی خلجان کو دور کر دیا ہے اور تمام شرک آمیز تصورات کا قلع قمع کر دیا ہے.

قرآن کی آیتوں میں کئی مقامات پر علم غیب پر رسولوں کو مطلع کرنے کا ذکر آیا ہے اس سے عام ذہن میں یہ خیال آسکتا ہے کہ جب ذات خداوندی عالم الغیب ہے اور اس نے اپنے علم غیب پر رسولوں کو مطلع کر دیا ہے تو خدا اور رسول دونوں علم غیب میں برابر ہو گئے زیادہ سے زیادہ ایک کا علم ذاتی ہوگا اور دوسرے کا عطائی لیکن علم میں مساوات تو پیدا ہو ہی گئی اور یہ سراسر مشرکانہ عقیدہ ہے کہ عبد و معبود دونوں میں کسی طرح مساوات ثابت کی جائے.

قاری صاحب نے اس بحث کو بڑی تفصیل سے لکھا ہے اور خود آیت ہی کے لفظوں سے اس ذہنی خلجان کو واضح طور پر دور کر دیا ہے اس سلسلہ میں آپ نے تحریر کیا ہے کہ اظہار غیب کے موقعہ پر رسول کا لفظ قرآن میں ذکر کیا گیا ہے یعنی جس ذات پر غیب کو ظاہر کیا گیا ہے وہ وصف رسالت سے متصف ہے. یعنی اطلاع غیب کی مستحق اور متقاضی کسی رسول کی ذات نہیں بلکہ وصف رسالت اور عہدہ و منصب نبوت ہے اسی وجہ سے خصوصیت کے ساتھ اس موقعہ پر لفظ رسول لایا گیا ہے اور یہ بالکل واضح اور ہر شخص جانتا ہے کہ رسول

کی رسالت کا موضوع اور مقصد وحید اصلاح خلق اللہ ہے اور بندگان خدا کو راہ حق کی طرف رہنمائی اور ان کی تربیت و تکمیل ہے اس لئے وصف رسالت کا قدرتی تقاضا وہی علوم غیب ہو سکتے ہیں جو کہ ہدایت واصلاح میں کار آمد ہوں اور جن علوم غیبیہ کا اصلاح و تربیت میں دخل نہ ہو اس سے وصف رسالت کو خود ہی سروکار نہ ہوگا۔ مغیبات میں سے قیامت کے وقت اس کی تاریخ و سنہ یا اس کی مدت کے قرب و بعد کی اگر رسولوں کو اطلاع نہ ہو جیسا کہ قرآن کی متعدد آیتوں سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کا علم کسی کو نہیں دیا گیا ہے اسی طرح ان بے شمار کائناتی حوادث اور جزئیات کا انہیں علم نہ ہو جو ذرہ ذرہ دنیا میں رونما ہوتی رہتی ہیں تو یہ ان کے حق میں نہ صرف یہ کہ کسی طرح کا نقص نہیں بلکہ ان امور کا علم نہ ہونا ہی ان کے وصف رسالت کا ایک طبعی و فطری تقاضا ہے۔

جب رسولوں کو علم غیب کی صرف وہی قسم دی گئی جن کا ان کے منصب رسالت سے تعلق ہے اور بقیہ مغیبات کا علم نہیں دیا گیا کیوں کہ ان کے منصب نبوت کو ان کی ضرورت ہی نہیں تھی تو پھر اس سے نبی کی شان میں نقص کیسا لازم آتا ہے۔ ان حقائق کے ہوتے ہوئے رسول کیلئے جمیع ماکان ما یکون کے علم کا دعویٰ وہی شخص کر سکتا ہے جو قرآن کے اسلوب بیان اور شریعت خداوندی کے مزاج سے ناآشنا اور وصف رسالت کے فطری تقاضوں سے بے خبر ہو۔

قرآن وحدیث، عقل و نقل سے علم غیب کے مسئلہ کی صحیح صورت پیش کرکے آخر میں تحریر کیا کہ قرآنی تصریحات و تلمیحات کے ہوتے ہوئے حضرت سید الاولین و الآخرین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے علم غیب کا دعویٰ اور وہ بھی علم کلی اور علم ماکان ما یکون کی قید کے ساتھ نہ صرف بے دلیل بے سند بلکہ مخالف دلیل معارض قرآن اور اس توحیدی شریعت کے مزاج کے خلاف ہونے میں اب کوئی شک شبہ باقی نہیں رہا ــــ علم ماکان ما یکون حضور کیلئے ثابت کرنے کی غرض سے بعض احادیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے فاضل صاحب نے بالاستیعاب ان دلائل کا علمی جائزہ لیا ہے اور ہر ایک کا شافی اور مدلل و مبرہن غیر مبہم الفاظ میں رد کیا ہے۔

بحث کے آخر میں آپ نے حکیمانہ انداز میں مسئلہ غیب پر روشنی ڈالی ہے اور عقل و درایت کی کسوٹی پر اس مسئلہ کو پرکھ کر کھوٹے اور کھرے کو علیحدہ علیحدہ کر دیا ہے اس سلسلہ بحث میں علم غیب کی حقیقت و ماہیت کو پیش کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ عقلی طور پر بھی علم کلی مخلوق کے لئے ممکن نہیں۔ آپ نے نظام کائنات کی قدرتی ترتیب کو پیش کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ ایک حقیر سے حقیر جزئی کا بھی علم و ادراک اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ موجودہ اور ممکنہ کائنات کا یہ سارا کلیاتی نظام اپنی حقیقت سمیت علم میں نہ آجائے اور ذہن ان سارے حقائق و کلیات کا احاطہ نہ کرے اور یہ انسانی بساط اور دخل بخشش سے باہر ہے۔ یہ کلامی اور فلسفیانہ بحث پچاسوں صفحات پر پھیلی ہوئی ہے یہ کتاب کا آخری حصہ اتنا بلند اور دقیق ہے کہ جن لوگوں

کے دل و دماغ کی تطہیر کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے ان کے مبلغ علم سے کہیں بلند اور دقیق ہے لیکن جو لوگ منقول اور معقول دلائل کے متلاشی ہیں ان کے لئے یہ کتاب تسلی بخش دلائل فراہم کرتی ہے اور ذہن کے سارے خلجان کو دلیل و برہان کی روشنی میں دور کرتی ہے اور مسئلے کے صحیح پہلو کو متعین کرتی ہے تسکمانہ بحث دیکھکر متکلم اسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کی یاد آجاتی ہے جنہوں نے ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی اور دشمنان اسلام کے منہ بند کر دیئے قاری صاحب نے بھی اس سے حظ وافر پایا ہے یہ کتاب دیکھ کر یہ یقین کرنے پر دل مجبور ہے۔

اسلام کا اخلاقی نظام!

ہندوستان میں انگریز آئے تو ان کے ساتھ ہی عیسائیت بھی آئی دونوں کو ایک دوسرے کے سہارے کی ضرورت تھی عیسائی مذہب کی سرگرمیوں اور ہنگامہ آرائیوں کا مقصد سیاسی استحکام کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ مگر بڑے پیمانے پر عیسائی پادریوں کی فوج تیار کی گئی اور اس نے ہندوستان میں مسلمانوں سے پنجہ آزمائی شروع کر دی بڑے بڑے مناظرے ہوئے۔ قدرت بھی وقت کے لحاظ سے افراد پیدا کرتی ہے علماء اسلام میں بھی ایسے افراد پیدا ہوئے جنہوں نے عیسائیت کی تار پود بکھیر کر رکھ دی مگر پھر بھی عیسائیت نے ہندوستان میں اپنے قدم جما لئے اور لاکھوں ہندوستانی عیسائی ہو گئے ہندوستانی عیسائیوں میں بھی کچھ پڑھے لکھے تھے انہوں نے بھی مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ جاری رکھی اسی طرح ایک پادری نے رڑکی سے قاری صاحب کو ایک خط لکھا جس میں اس نے اسلام پر کچھ اعتراضات کئے اور اسلام کے اخلاقی نظام کو اپنا نشانہ بنایا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلام سے عیسائی کا نظام اخلاق کہیں بہتر اور برتر ہے، اس خط میں سب سے اہم اور بڑا اعتراض حضرت زینب سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح پر تھا کہ آپ نے زینب کے حسن سے متاثر ہو کر ایک مسلمہ اصول کو نظر انداز کر دیا اور اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا جبکہ خود عرب میں بھی یہ معیوب تھا لیکن زینب کے حسن نے آپ کے دل میں اپنی جگہ بنالی تھی اور چاہتے تھے کہ کسی طرح زینب سے نکاح کر لیں قرآن نے خود کہا کہ آپ دل میں جو کچھ چھپا کر رکھتے ہیں اللہ ان کو ظاہر کر دینے والا ہے تخفی فی نفسک واللہ مبدیھا قرآن میں موجود ہے اس نے خط میں کہا کہ "قرآنی اخلاقی معیار ایک عجیب چیز نظر آتی ہے جب بیٹے کی بہو پر طبیعت چل گئی تو پھر آسمانی وحی نے ساری روحانیت نیکی اور سچائی پر ایسا بھاری پردہ ڈالدیا کہ تمام دینداری چھپ گئی اور اپنے بیٹے کی بہو کو اپنی بیوی بنانے کا حق اللہ میاں سے حاصل ہو گیا آپ کو ماننا پڑیگا کہ زید کی بیوی کا نبی کی جورو بنا دینے کا حکم غلط ہی نہیں بلکہ گناہ اور زناکاری کو فروغ دینا ہے کیونکہ خدا ایسی بات کبھی نہیں کر سکتا کہ ایک موزوں جوڑے کو توڑ کر ایک نہایت غیر موزوں جوڑا بنا دے ؟"

اس کے بعد پادری نے قرآنی نظام اخلاق کے مقابلہ میں بائبل کے بیان کردہ نظام اخلاق کے دس اصول کو ترجیح دی ہے بائبل کے ان اصولوں میں سے چوری نہ کر، زنا نہ کر، خون مت کر، کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔

قاری صاحب نے اولاً بائبل کے حوالے سے پیش کردہ دس احکام کو معیار اخلاق قرار دینے پر جو گفتگو کی ہے اس سے محسوس ہوتا ہے کہ قاری صاحب انیسویں صدی میں عیسائیوں سے ہونے والے معرکۃ الآرا مناظروں کی بحثوں سے پوری طور پر واقف ہیں جن اسلامی مناظروں کے مستحکم دلائل کی قوت ان کی تاثیر ان کی اثراندازی نے عیسائی دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا اور جس کی وجہ سے ہندوستان سے یورپ تک کے عیسائیوں کے دل ودماغ کو نو مار گیا اور میدان مناظرہ سے عیسائی مناظرین اس طرح سرپٹ بھاگے کہ قرآن نے باطل کے فرار کی جو محاکات کی ہے اس کا پورا نقشہ سامنے آگیا جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا

قاری صاحب نے اصل مسئلہ پر گفتگو سے پہلے موجودہ بائبل کو ناقابل اعتبار قرار دیتے ہوئے انھیں ناقابل شکست دلائل سے اس کو محرف ثابت کیا جو ان کے اسلاف نے عیسائی دنیا کے سامنے پیش کئے تھے جس کے بعد رعد وبرق کی طرح کڑکنے اور گرجنے والے عیسائی مناظرین میں شہر خوشاں کا سکوت اور قبرستان کا سناٹا چھا گیا تھا، بائبل کی تحریف کے ثابت کرنے کے باوجود بائبل کے حوالے پیش کردہ ان دسوں احکام کے بارے میں تحریر کیا کہ یہ امور نہ خود معیار اخلاق ہیں اور نہ معیار اخلاق بن سکتے ہیں کیوں کہ یہ دس باتیں مثلاً تو چوری مت کر، تو زنا مت کر، تو خون مت کر از قسم افعال ہیں جن کا تعلق کرنے نہ کرنے سے ہے از قسم اخلاق نہیں ہیں جو قلب کے خلقی مادے ہیں اخلاق کی حیثیت بیج کی ہے اور قلب ان کیلئے زمین ہے۔

جب یہ بیج اس جڑ کو پکڑ لیتا ہے تو اس بیج سے شاخیں پھوٹتی ہیں۔ شاخوں سے تخم نہیں بنا کرتا اس لئے افعال تو اخلاق سے سرزد ہو سکتے ہیں لیکن افعال سے اخلاق پیدا نہیں ہوتا، آدمی میں خلق شجاعت ہے تو اس سے حملہ کرنے کا فعل ظاہر ہوگا آدمی میں خلق جودوسخی ہے تو اس سے دادودہش کا فعل وجود میں آئے گا اس طرح تمام افعال اخلاق کے بیج سے پیدا ہوتے ہیں، قلب میں صبر، شکر، سخاوت، شجاعت، مروت، غیرت حیا وغیرہ جنکو اخلاق کہا جاتا ہے اگر انسان میں یہ اخلاق پیدا ہو جائیں تو اس شخص سے انھیں اخلاق کے مطابق افعال سرزد ہوں گے، اس لئے آپ کے بیان کردہ چوری نہ کر، زنا نہ کر، خون مت کر معیار اخلاق کہنا ایسا ہی جیسے کوئی شخص شاخوں کو بیج کے اچھے ہونے کا معیار بتانے لگے، پھر ان جملوں سے ان چیزوں کے حرام ہونے کا تو علم ہو سکتا ہے لیکن ان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان فعلوں کی ممانعت کی بنیاد کیا ہے اور ان افعال کی حرمت کی علت کیا ہے وہ علت ہی درحقیقت معیار حکم بن سکتی ہے پھر یہ علت جہاں جہاں پائی جائے گی وہ چیز حرام ہوتی چلی جائے گی، ان جملوں سے ان کی علتوں کا کوئی پتہ نہیں چلتا اس لئے وہ ایک جزئی حکم بن کر رہ جاتا ہے اور بطور حکم کلی اس کا اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا اور جزئیات منفردہ کا نام قانون اور ضابطہ نہیں ہوتا، معیاری قانون اگر دیکھنا ہے تو وہ ہے جو انھیں احکام کے بارے میں قرآن حکیم نے بنایا ہے کہ ان میں سے ہر ایک جزئی حکم کے ساتھ اس کی جامع علت اور علت وحکم کا درمیانی رابطہ دکھلا کر اسے معیاری قانون بنا دیا ہے۔

قاری صاحب نے قرآن کی متعدد آیتوں سے اس کی مثالیں پیش کی ہیں ان سے ایسے حکیمانہ نکتے پیدا کئے جہاں تک عام اہل علم کی نگاہیں عام طور پر نہیں جاتی ہیں۔ اور ان کے ذہن وقاد نے جو نتائج نکالے ہیں ان سے قرآن کی جامعیت اور قرآنی الفاظ کی معنوی وسعت، اسلامی قانون کی گیرائی و گہرائی کا یقین ہوتا چلا جاتا ہے اور دل حیرت و استعجاب میں ڈوب جاتا ہے کہ یہ آتیں روز پڑھی جاتی ہیں لیکن ان لطیف نکتوں کی طرف ذہن نہیں جاتا ہے جو در حقیقت روح کلام کا درجہ رکھتے ہیں۔ قاری صاحب کی نکتہ شناسی اور دقیقہ رسی کی اسی سلسلہ میں ایک مثال پیش ہے۔

آپ نے بائبل کے جزئی فعل کے مقابلہ میں قرآن کے کلی حکم اور اس کی قانونی وسعت کو سمجھانے کے لئے "لاتقربوا الزنا انہ کان فاحشۃ وساء سبیلا" کو پیش کیا ہے آپ نے بتایا کہ آیت نے زنا سے روکتے ہوئے اس کی بنیادی علت بھی بتادی ہے، اس علت کو لفظ فحش اور "سوء سبیل" سے تعبیر کیا ہے، یہی اس کی ممانعت کا معیار ہے۔ انھیں دو باتوں کی وجہ سے فعل زنا میں حرمت پیدا ہوئی، اگر قلب میں فحش" اور غلط روی" کے بجائے عفت و پاکدامنی ہو اور نکاح اور ملک متعہ کی راہ اختیار کرے تو یہی فعل حرام ہونے کے بجائے حلال ہو جاتا ہے، اس سے ثابت ہوا خود یہ فعل اپنی ذات سے برا ہے نہ ممنوع، فحش" "سوء سبیل" نے اس میں ممانعت کا حکم پہونچایا ہے اس لئے اس آیت میں حکم زنا کی ممانعت کے ساتھ اس کا معیار بھی ذکر کر دیا ہے کہ وہ فحش اور سوء سبیل ہے یعنی بے حیائی اور بے راہی، اس لئے اس قرآنی حکم کو معیاری حکم کہیں گے نہ کہ انجیل کے حکم کو کہ جس میں صرف ممانعت زنا تو ہے معیار کا کوئی ذکر نہیں اور جبکہ یہ علت ہی معیار حکم ہے اور وہ انجیل میں مذکور نہیں تو انجیل کا یہ حکم معیار اخلاق تو کیا ہوتا معیار حکم بھی نہیں، حکم اور علت دونوں کو ساتھ ساتھ ذکر کر دینے سے یہ معلوم ہو گیا کہ ممانعت میں فعل زنا اصل نہیں بلکہ فحش اور سوء سبیل اصل ہے تو ممانعت فحش اور سوء سبیل کی ہوئی چونکہ زنا میں بھی یہ علت ہے اس لئے وہ بھی ممنوع ہوئی اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ فحش ممنوع جس فعل میں پایا جائے گا وہ فعل بھی بضمن فحش درجہ بدرجہ ممنوع ہوتا چلا جائے گا جیسے اجنبی عورت پر نگاہ ڈالنا، اس کی طرف بری نیت سے چلکر جانا، اُسے ہاتھ لگانا، دل میں اس کے خیالات پکانا وغیرہ فحش کے افعال تھے اس لئے یہ سب ممنوع قرار دیئے گئے اسی لئے حدیث میں نگاہ بازی کو آنکھ کا زنا کہا گیا، اجنبی عورت کو چھونے کو ہاتھ کا زنا کہا گیا بدکاری کی نیت سے چلکر جانے کو پاؤں کا زنا کہا گیا اس لئے کہ فحش کی علت کی بنا پر ایک زنا ہی حرام نہیں ہوا بلکہ وہ سارے افعال بھی ممنوع ہو گئے جنکو فحش اور بے حیائی نے ابھارا ہو جنکو ہماری شریعت میں دواعی زنا کہا گیا ہے۔ بس اس ایک حکم زنا کی ممانعت سے ایک ہی آیت کی بدولت بے حیائی کے ہزاروں افعال حرام ہو گئے جو در حقیقت بیان معیار کا اثر ہے قاری صاحب نے قرآن کے اس حکم اور بائبل کے حکم کا موازنہ کرتے ہوئے قرآنی حکم کی وسعت، پھیلاؤ، جامعیت اور اس کے دور اس اثرات کی حقیقت و معنویت کو اتنا واضح کیا ہے کہ اس کے

بعد کسی کلام کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔

قاری صاحب نے اپنے دعوے میں کہا ہے کہ قرآن میں ننانوے اخلاقی معیار بتائے گئے ہیں اور ان کو خداوند قدوس کے ننانوے اسمارِ حسنیٰ سے ثابت کیا ہے۔ آپ نے سب سے پہلے حدیث سے ننانوے اسمارِ حسنیٰ کو شمار کرایا ہے پھر قرآن کریم کی مختلف آیتوں سے ان ننانوے اسمارِ حسنیٰ کو شمار کرا کے انھیں اسمار سے ننانوے اصولِ اخلاق ثابت کئے ہیں اور ننانوے اخلاقی قوانین مستنبط کر کے شمار کرائے ہیں۔ یہ بحث اپنی نوعیت کی منفرد بحث ہے اور قاری صاحب کے ذہن کی دقیقہ رسی اور نگاہ نکتہ رسی کا ثمرہ ہے۔ حیرت یہ ہے کہ جب پوری بحث پڑھئے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ وہ حقیقتیں ہیں جو ہماری زندگی میں جاری و ساری ہیں لیکن آج تک ان الفاظ کی معنوی گہرائی تک ہماری رسائی نہیں ہوئی، اور جب قاری صاحب کے قلم نے ہمارے لاعلمی کے پردے ہٹا دئے تو ہماری جانی پہچانی حقیقتیں ہمارے سامنے آگئیں اسی لئے بیاختہ قاری صاحب کے لئے حکیم الاسلام کا خطاب ہماری زبانوں سے نکل جاتا ہے جس کے وہ صحیح طور پر مستحق ہیں۔

آیات قرآن سے ننانوے اسمائے حسنیٰ شمار کرانے کے بعد آپ نے بتایا کہ یہی حق تعالیٰ کے وہ اصولِ اخلاق رحم و کرم، حلم و صبر، عفو و درگذر، عظمت، قدرت، قوت، محبت، عدل و انصاف، علیمی و خبیری، وسعت و احاطہ یکتائی، غنا، نورانیت، ہدایت، بزرگی، حفظ و نگہبانی، نفع و ضرر، انعام، انتقام، سلب عطار، ثبات و استقلال، مصدریت کمالات، تقدس، پاکی، حکومت و ملوکیت، لطافت، ستمرائی، علوِ شان، اعزاز تذلیل وغیرہ وغیرہ ہیں جن کی اصولی تعداد ننانوے تک پہونچتی ہے جنھیں حدیث نے اسمارِ الٰہیہ کے نام سے تعبیر کیا ہے اور قرآن نے اسمارِ حسنیٰ کے لقب سے یاد کیا ہے۔ یہی وہ پاکیزہ اخلاقِ خداوندی ہیں جنھیں حاصل کرنے کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو حکم تخلقوا باخلاق اللّٰہ سے دیا ہے۔ انھیں اخلاقِ الٰہیہ سے مخلوق کی اخلاقی تکمیل کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ آپ نے فرمایا ہے

بعثت لاتمم مکارم الاخلاق

اسلام کے قوانین اخلاق کو پیش کر کے آپ نے انجیل کے مذکورہ دس احکام کو ایک بچکانہ بات بتایا اور کہا کہ قرآن کے نظام اخلاق کی وسعت کے سامنے یہ چند سطحی باتیں پیش کر کے سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ اس کے باوجود عیسائی کہتے ہیں کہ اسلام کا کوئی نظام اخلاق نہیں ہے۔ اور اگر معیاری اخلاق ہیں تو عیسائیوں کی تحریف شدہ انجیل کی تعلیمات میں ہیں جنوں کا نام خرد رکھ لیا خرد کا جنوں۔

رڑکی کے پادری نے دوسرا اعتراض حضرت زینب سے حضورؐ کے نکاح پر کیا ہے۔ یہ اعتراض رڑکی کے اس معمولی پادری کے دماغ کی اختراع نہیں ہے بلکہ مشہور مستشرقین کا چبایا ہوا لقمہ ہے۔ سمومیر، درمنگھم، واشنگٹن ارونگ اور لامنس نے اپنی اپنی کتابوں میں بڑے زور و شور سے لکھا ہے جن کا مدلل جواب علمار مصر نے عربی اور انگریزی میں اتنی تفصیل سے دیا ہے کہ اب مزید اس پر اضافہ کی گنجائش

نہیں ہے۔ یہ مستشرقین کی غلط فہمی نہیں اور نہ تاریخ اسلام سے ناواقفیت کی بنیاد پر یہ اعتراض کیاگیا ہے، بلکہ تنگ نظری، عصبیت، اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کی سازش کے طور پر کیاگیا ہے۔ ورنہ معترضین کو خوب معلوم ہے کہ مشاہیر مفسرین نے ان آیات قرآنی کی جو تفسیریں کی ہیں اور اسلامی تاریخ میں جو تفصیلات مذکور ہیں ان کو پڑھنے کے بعد کسی انصاف پسند، اور حقانیت دوست کے لئے اعتراض کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ وجا ئج دیہ علمار اسلام یہ مفسرین کرام آیات قرآنی کے مفہوم و مقصد کو ان مستشرقین سے کہیں زیادہ اور بہتر طور پر سمجھتے ہیں، اور مستند اسلامی تاریخوں میں واقعہ کی ساری تفصیل موجود ہے ان کی موجودگی میں اعتراض بے غیرتی اور بے حیائی کے سوا اور کچھ نہیں، اس پاکیزہ واقعہ کو بد منظر بنانے میں صرف مستشرقین کی بدنیتی کو دخل ہے اس کے باوجود بھی دور جدید کے محقق علمار اسلام نے یورپ کو کافی وشافی جوابات دیدیئے ہیں جس کے بعد اس مسئلہ پر مزید گفتگو عیسائیوں کی بے غیرتی اور بے حیائی ہے اور کچھ نہیں۔

حضرت قاری صاحب نے بھی رڑکی اس پادری کو تفاسیر اور تاریخ اسلام کے مستند حوالوں سے جو جواب دیا ہے وہی اصل حقیقت ہے تفسیر وتاریخ کی تفصیلات کو قاری صاحب نے اپنے مخصوص انداز بیان اور حکیمانہ نکتہ رسی سے اور زیادہ واضح، موثر، باوزن اور باوقار بنا دیا ہے۔

حدیث رسول کا قرآنی معیار!

آزادی سے پہلے کے پنجاب سے انکار حدیث کا فتنہ اٹھا تھا، اس گروہ کا کہنا تھا کہ احادیث کا یہ انبار غیر یقینی رطب ویابس اور متضاد باتوں پر مشتمل ہے، ان احادیث کی روشنی میں اسلام کی جو تصویر بنتی ہے وہ اس اسلام سے قطعاً مختلف ہوتی ہے جو قرآنی آیات کے رنگ و روغن سے تیار ہوتی ہے۔ اس لئے اگر اسلام کو اپنی اصل ہیئت پر باقی رکھنا ہے تو صرف قرآن کو معیار عمل بنانا ہوگا احادیث کے اس سارے ذخیرہ کو آگ لگانا پڑے گا۔ انہوں نے عوام کے ذہن کو خراب کرنے کیلئے احادیث سے تضادات کو جمع کر کے احادیث پر عمل کو ناممکن ثابت کرنے کیلئے کئی کتابیں بھی لکھی تھیں "دو اسلام" ان کی مشہور کتاب ہے۔

جب یہ فتنہ شباب پر تھا اور بازار میں ان کی کتابیں آئیں تو اسی دور میں ان کی رد میں بہت سی کتابیں اور مضامین لکھے گئے۔ تدوین احادیث کی تاریخ پر محققانہ کلام کیا گیا، احادیث کی صحت اور ان کے کلام رسول ہونے کو بدلائل قطعیہ ثابت کیا گیا اور بتایا گیا کہ احادیث کے ذخیرہ میں صحیح اور موضوع دونوں طرح کی روایتیں ضرور ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ غلط اور موضوع روایتوں کو رد کرنے کے ساتھ ساتھ صحیح حدیثوں کو بھی ردی کی ٹوکری میں ڈالدیا جائے، احادیث رسول کے کلام رسول ہونے کی سند اور دلیل دنیا کے تمام مروجہ معیار تحقیق سے کہیں زیادہ مستند اور محقق ہے اور یہ معیار اتنا اونچا،

بلند اور یقینی ہے کہ اس سے زیادہ کھری کسوٹی پر کبھی کوئی واقعہ پرکھا نہیں گیا اگر کوئی شخص احادیث کے معیار تحقیق اور اس کی تسلیم کردہ کسوٹی کی صحت پر یقین کرتا تو آج دنیا کی پوری تاریخ جھوٹ کا پرت ہو کر رہ جائے گی کیوں کہ ان کا معیار تحقیق حدیث کے معیار تحقیق کے مقابلہ انتہائی گھٹیا اور غیر یقینی ہے حالانکہ ہر شخص تاریخ کی صحت پر یقین کرتا ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ تاریخ سے کہیں زیادہ سچی کسوٹی پر رکھی ہوئی احادیث کو صحیح تسلیم کرنے سے انکار کیا جاتا ہے۔ احادیث کی حقیقت کو جانچنے کے لئے فن بیوگرافی کو ایجاد کیا جو اس سے پہلے وجود میں نہیں آیا، چار لاکھ اشخاص کے پوست کندہ حالات مرتب کر کے لکھے گئے ان کے صدق و کذب کی پوری پوری چھان بین کی گئی جب ان کی صداقت و امتیازی کی تحقیق کر لی گئی تو ان کی زبانی سنی ہوئی حدیث کو صحیح قرار دیا گیا ورنہ اس کے منہ پر مار دیا گیا ہے۔ موضوع روایتوں کے وجود سے انکار نہیں لیکن ایسا بھی نہیں کہ صحیح اور غلط احادیث میں تمیز نہ کی جا سکے اور قطعیت کے ساتھ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کیا جا سکتا ہے، تضادات، اسرائیلیات، بدمذہبوں اور زندیقیوں کی الحاقی باتیں کم علم والوں کے ذہن میں تذبذب اور تشکیک کا باعث بن سکتی ہیں۔ اہل علم جن کی پورے ذخیرہ حدیث پر مبصرانہ نگاہ ہے وہ کھوٹے اور کھرے کو ٹھوس کسوٹی پر پرکھتے جس سے زیادہ قابل اعتبار یقینی بھی کسوٹی آج تک دنیا میں وجود میں نہیں آئی۔ فتنہ انکار حدیث نے زیادہ پر و بال نہیں نکالے اور جلد ہی اپنی موت آپ مر گیا، غالباً قاری صاحب نے بھی اسی دور میں یہ کتاب تحریر فرمائی ہے اور اپنے بلند علمی معیار سے کلام کیا ہے اور قرآن ہی سے احادیث کے واجب العمل ہونے کو جن جن طریقوں سے ثابت کیا ہے اور احادیث کی ساری قسموں کو آیات قرآنی کی روشنی میں مستنبط کیا ہے اور اس کے درجہ اعتماد کو متعین کیا ہے حق یہ ہے کہ بڑی دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے۔ احادیث کی حجیت کو قرآن کی آیات سے جس باریک بینی اور الفاظ قرآنی کی معنوی وسعت کو نمایاں کرتے ہوئے جس گہرائی سے ثابت کیا ہے حق یہ ہے کہ یہ کام قاری صاحب کا ہی نکتہ آفریں دماغ کر سکتا تھا اور اسی نے کیا بھی۔

قاری صاحب گفتگو کا آغاز اس دعویٰ سے کیا ہے کہ دین کی دو اصلیں ہیں قرآن اور سنت، ان کے علاوہ اجماع اور قیاس بھی حجت اور واجب العمل ہیں مگر بذات خود اصل نہیں ہیں بلکہ بالواسطہ ہیں کیونکہ کوئی اجماع اور قیاس وہی معتبر ہے جو قرآن و حدیث کی تصریحات کے مطابق ہوں اس کے علاوہ کوئی اجماع اور قیاس قابل اعتبار اور واجب العمل نہیں، پھر اس دعویٰ کو متعدد آیات قرآنی سے ثابت کیا ہے، اور دلائل کا مفصل ذکر کیا ہے اور مثالوں سے واضح کیا ہے۔

آپ نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ حدیث کے بغیر قرآن کے صحیح اور حقیقی معنی مفہوم کو سمجھنا ممکن ہی نہیں اور اس کی ناقابل تردید دلیل بھی دی اور کہا کہ خدا کی ذات جس طرح لامحدود ہے اسی طرح اس کی صفات کمال بھی لامحدود ہیں اور انسانی قلب و دماغ، فکر و فہم اور عقل و فراست ہر لحاظ سے

محدود و متناہی ہے اس لئے انسان اس کا ادراک بغیر تحدیدات، تعینات اور تشخیصات کے نہیں کر سکتا اور اس کے لئے کسی طرح ممکن بھی نہیں کہ وہ محدود رہتے ہوئے لامحدود ذات وصفات تک رسائی پائے یا اس کا ادراک ومعرفت کرے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان ایک برزخ اور درمیانی طبقہ پیدا کیا جو ذات حق سے قریب تر اور تعینات کے لحاظ سے بندوں میں شامل اور کمال بشریت کا نمونہ رہتا ہے، انھیں کو ہم انبیاء ورسل کہتے ہیں، کمالات ربانی کے نمونے جب کسی ذات قدسی صفات میں ظہور کرتے ہیں تو عام بندوں کے لئے سہل ہو جاتا ہے کہ اس نبی سے وابستہ ہو کر حسب استعداد خدا تک رسائی حاصل کرلیں۔

حق تعالیٰ کی صفات کمالیہ میں ایک صفت صفت علم یا صفت کلام بھی ہے یہی علوم خداوندی کی ترجمانی اور تعبیر کرنے والی ہے اور اس صفت علم کا مظہر اتم قرآن حکیم ہے جو اپنی اصولیت وکلیت، کمال جامعیت اور شئون الہیہ سے بھرپور ہونے کی وجہ سے جن سے یہ کلام وجود میں آیا ہے ذات خداوندی کی طرح لامحدود الحقائق، لامحدود المعارف اور لامحدود المطالب ہے جو ایک نوع نہیں بلکہ ماضی ومستقبل اور حال کی ہزارہا انواع علوم پر حاوی اور مشتمل ہے، اب ایسے کلام کا سمجھنا بلا خدا کی رہنمائی کے ممکن نہ تھا اور اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ کوئی ایسا فرد کلام اور اس کی تفہیم کا واسطہ بنے جس کا تکلم تو ہم جیسوں میں سے ہو لیکن اپنے قلب صافی اور دماغ عالی کی جہت سے عرشیوں میں سے ہو، جس طرح ذات خداوندی تک بلا رسول کے واسطے کے ہماری رسائی ناممکن تھی اسی طرح کلام خداوندی تک بلا کلام رسول ہماری فہم کی رسائی ناممکن تھی، ہم اسی کلام رسول کو احادیث کہتے ہیں گویا حدیث پر عمل عین قرآن پر عمل اور منشاء خداوندی پر عمل ہے اور اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

آپ نے اپنے دعوئی کو اور مدلل کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ قرآن کے الفاظ اور معانی دونوں منجانب اللہ ہیں، حضور اس کے ناقل اور ہیں، نزول الفاظ، جمع الفاظ، اقرار الفاظ سب کچھ ذات باری کی طرف سے ہوا اور بیان معانی، شرح مطالب اور تعیین مراد بھی خدا ہی کی جانب سے ہوئی۔ ظاہر ہے کہ جب پیغمبر کو بھی معانی مرادات کے سمجھنے میں بیان حق کے تابع رکھا گیا جن پر خود قرآن اترا تو امت کی کیا مجال ہے کہ اس کے فہم کو مطالب قرآنی پر حکم بنا کر چھوڑ دیا جائے کہ وہ سلسلہ معانی میں مدعی یا مجتہد بن جائے، قرآن کی آیتوں سے اپنے اس دعوئی کو ثابت کرتے ہوئے آپ نے یہ بات واضح کردی کہ احادیث رسول درحقیقت مرادات قرآن ہیں، کلام رسول آیات قرآنی ہی کی تشریح ہیں اس کے سوا کچھ نہیں اب اگر کوئی احادیث کو ترک کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کو ترک کرتا ہے اگر احادیث پر ایمان نہیں تو اس کا قرآن پر بھی ایمان باقی نہیں رہا۔

آپ نے بعض اذہان کے ان شکوک کو بھی تفصیل سے بیان کرکے ان کا ازالہ کیا ہے جو ایسی

احادیث کے موقعہ پر پیدا ہوتے ہیں کہ ان میں کسی ایسی بات کا حکم ہے جو قرآن میں مذکور نہیں صرف کلام رسولؐ میں ان کا ذکر ہے مثلاً حمار اہلی کی حرمت، واشمہ پر لعنت ولامت وغیرہ۔ قاری صاحب نے اس کا اصولی جواب دیا ہے کہ قرآن میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ رسول جو لا کر دیں اسے لے لو اور جس سے روک دیں رک جاؤ۔ اب جو احکام آپ نے ایسے دئے ہیں جو بظاہر قرآن میں مذکور نہیں ہیں وہ بھی اسی آیت کی وجہ سے بالواسطہ قرآن ہی کے احکام متصور ہوں گے۔ صحابۂ کرام سے اس طرح کے استدلالات کو احادیث کی کتابوں سے پیش کر دیا ہے۔

اس کے بعد قاری صاحب نے احادیث کی قسموں، غریب، خبر عزیز، خبر مشہور، خبر متواتر، کو آیات قرآنی سے ثابت کیا ہے اور ان کا صحیح مقام اور درجہ متعین کیا ہے۔ یہ بحث بڑی لطیف، دلچسپ اور حقیقت آفریں ہے اور بہت تفصیلی ہے۔ اس حقیقت کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آیات قرآنی سے استخراج نتائج و شواہد اور استنباط مسائل پر قاری صاحب کی نگاہ کتنی دقیقہ رس اور نکتہ آفریں تھی۔ یہ متکلمانہ بحث اور اس کے ناقابل شکست عقلی دلائل انکار حدیث کے فتنہ کے لئے آخری کیل سے کم نہیں۔

کلمہ طیبہ قاری صاحب کی ایک چھوٹی سی کتاب اسی نام سے ہے جو ایک ابھرتے ہوئے فتنہ کے سدِ باب کے لئے معرضِ تحریر میں آئی۔ آزادی سے کچھ دنوں بعد جب کہ مسلمانوں کا مستقبل غیر یقینی اور انتہائی خطروں میں گھرا ہوا تھا اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس سرزمین پر مسلمان نام کی کوئی چیز نہیں رہ جائے گی۔ پھر آہستہ آہستہ زندگی کے سورج کی ہلکی ہلکی کرنیں نظر آنے لگی تھیں اور یہ آس بندھ چلی تھی کہ شاید کچھ دن اور یہاں نغمۂ توحید گونجے گا۔ لاالٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کا نغمۂ لاہوتی فضاؤں میں اپنا نورانی ایمان افروز ترنم بکھیر گیا کہ جنوبی ہند سے کسی بدبخت نے ایک شوشہ چھوڑا کہ لاالٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ جو حریم اسلام کے دروازے کی کنجی سمجھا جاتا ہے یہ صرف اہل عجم کی ذہنی اختراع ہے۔ قرآن و حدیث میں کہیں اس شکل میں اس کلمہ کا وجود ہی نہیں ہے اس پر مستزاد یہ کہ چونکہ کلمۂ طیبہ کی موجودہ شکل عجم کے ذہن کی پیداوار ہے اس لئے عربی اصول و قواعد کے لحاظ سے بھی اس میں خامی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ قرآن میں یہ کلمہ اس شکل میں پایا جاتا ہے اور نہ پورے ذخیرۂ احادیث میں۔ یہاں تک کہ کسی صحابی کے قول سے بھی یہ ثابت نہیں ہے بلکہ اس کلمہ میں نہ عربیت ہے اور نہ شرعیت بلکہ ایک ذہنی اختراع اور بدعت ہے جس سے اسلام نے روکا ہے "البدعۃ ضلالۃ و کل ضلالۃ فی النار"

کسی زمانہ میں آریوں نے مسلمانوں پر یہ اعتراض کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد مسلمانوں پر دو محاذوں سے بیک وقت حملہ ہوا تھا۔ ایک محاذ پر عیسائی مناظرین حملہ آور تھے اور دوسرے محاذ سے آریہ سماجی مسلمانوں پر اعتراضات کے زہریلے تیر

برسارہے تھے اسی زمانہ میں آریوں کے مسموم ذہن نے یہ اعتراض پیدا کیا تھا لیکن اب کی بار یہ کھلے دشمن کی طرف سے نہیں بلکہ عبداللہ بن ابی کے سلسلۂ نسب کے کسی فرد نے یہ سوال اٹھایا تھا اس لئے یہ اور بھی خطرناک تھا۔

یہ کتاب قاری صاحب اسی اعتراض کے جواب میں لکھا ہے اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔ آپ نے گفتگو اس کلمہ کے مادہ سے شروع کی اور بتایا کہ اس کا اصل ماخذ کیا ہے، آپ نے اس کلمہ کے دونوں جزوں کو قرآن کی متعدد آیتوں سے نکال کر پیش کیا کچھ آیتوں میں جزو اول ہے اور کچھ آیتوں میں جزو ثانی موجود ہے، اس طرح دونوں اجزا قرآن میں موجود ہیں، اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اس کلمہ کی موجودہ ہیئت ترکیبی اور جمع و ترتیب اور دو آیتوں کو ملا کر پڑھنے اور انھیں ایک جگہ جمع کر کے ایک کلمہ کہنے کا مسئلہ ہے اس کو قرآن کے اطلاق سے ثابت کیا ہے اور کہا کہ آیات قرآنی کے سلسلہ میں اتصال، انفراد، استقلال، عدم استقلال، اضافہ، عدم اضافہ، اجتماع، انفراد، نوشت و خواند اسی طرح کے اور بہت سے احوال اور تقدیریں جو اس کلمہ کو ادا کرتے وقت اس کے ساتھ جمع ہو سکتی ہیں ان سب کے بارے میں قرآن مطلق ہے یعنی اس نے اس قسم کی صورتوں میں سے نہ کسی صورت کو متعین کر کے دوسری صورتوں کی نفی کی ہے اور نہ ان صورتوں میں سے کسی خاص صورت پر زور دے کر اسے حصر کے ساتھ متعین کیا ہے جس سے دوسری صورتوں پر قید اور پابندی عائد ہو جاتی ہو۔ بلکہ یہ سب صورتیں مساوی طور پر اس کے اطلاق کے تحت آجاتی ہیں اس لئے اصول تفسیر اور عام اصول شرعیہ کی رو سے یہ تمام تقدیریں اور صورتیں اس اطلاق کی وجہ سے نہ صرف جائز ہی رہیں گی بلکہ اس اطلاق قرآنی کا ایک حال اور ایک مصداق بنکر قرآن کی مراد ثابت ہوں گی، جن پر حسب تصریحات اصول قرآن کی دلالت مانی جائے گی اور یہ سب احوال مدلولات قرآن ثابت ہوں گے۔ انھیں احوال میں سے ایک حال ان دونوں آیتوں کو ملا کر سمجھنے کا بھی ہے تو یقیناً وہ بھی مدلول قرآن ہی مانا جائے گا، اسطرح کلمہ طیبہ کی ہیئت ترکیبی قرآن کی دلالت سے جائز اور شرعی ثابت ہو جائے گی اور لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ آیتوں کا ایک مجموعہ بن جائیگا جو کلمہ کے مادہ کے بارے میں قرآنی نص ثابت ہوا اور اس کی ہیئت ترکیبی کے بارے میں قطعی دلالت کے ساتھ دال ثابت ہوا جس کو یا تو نص ہی کہا جائے یا ماخذ شمار کیا جائے جو ماخذ قریب ہونے کیوجہ سے نص ہی کے قریب قریب ہو گا۔

قاری صاحب نے اصولی بحث کر کے کلمہ طیبہ کی موجودہ ہیئت ترکیبی کی شرعیت کو ثابت کر کے اس کے بہت سے شواہد بھی احادیث سے پیش کئے ہیں۔ پھر آپ نے بدلائل قطعیہ یہ ثابت کیا ہے کہ کلمہ کے دونوں جزوں کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا، اس کے لئے بھی آپ نے قرآن ہی سے استدلال کیا ہے، ایک

آیت سے اخلاص عبادت اور دوسری آیت سے اتباع سنت کے وجوب کو ثابت کرتے ہوئے آپ نے تحریر فرمایا کہ دونوں مطلوب قرآنی لازم ملزوم ہیں، اخلاص عبادت بغیر اتباع سنت کے اور اتباع سنت بغیر جذبہ اخلاص عبادت کے وجود میں نہیں آسکتا ہے، اگر عبادت میں اخلاص نہ ہو تو وہیں سے شرک کی سرحد ہو جائے گی اور اگر اتباع سنت کو ترک کر دے تو وہیں سے ابتداع کا آغاز ہو جائے گا، شرک و بدعت ہی دو اصلیں ہیں جو دین کی عمارت کو منہدم کرتی ہیں اسلئے اخلاص عبادت اور اتباع سنت کا اقرار و اعتراف لازم و ملزوم ہو گئے اور جب دو حقیقتوں میں تلازم ہے تو ان کی تعبیروں میں بھی تلازم ضروری ہو جاتا ہے، کیونکہ معانی کا تلازم تعبیرات کے باہمی تلازم کے بغیر ممکن ہی نہیں، ظاہر ہے کہ اخلاص کی تعبیر جو شرک کی ہر قسم سے مانع ہے وہ لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے اور اتباع سنت کی وہ تعبیر جو ہر قسم کی بدعت سے مانع ہو محمد الرسول اللہ ہے اب خواہ ان تعبیرات کو شہادت کے الفاظ سے ادا کیا جائے یا اقرار و قول وغیرہ سے یا بلا کسی خاص لفظ کے اضافہ کے صرف اصل الفاظ میں ادا کیا جائے بہر حال لاالہ الا اللہ اور محمد الرسول اللہ میں تلازم باہمی ثابت ہوا اور حاصل تلازم اور حاصل جمع وہی کلمہ طیبہ لاالہ الا اللہ محمد الرسول اللہ نکلتا ہے۔

قاری صاحب نے بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے کلمہ طیبہ کی وجہ تسمیہ کو آیت قرآنی سے نکالا اور متعدد احادیث سے کلمہ کی موجودہ ہیئت ترکیبی کو ثابت کیا ہے جن میں اسی جمع و ترتیب کے ساتھ یہ کلمہ مذکور رہے، کلمہ طیبہ کے شرعی وجود کو ثابت کرنے کے بعد کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت کے محل استعمال کا صحیح معیار اور فرق اور مواقع استعمال کی تفصیل بھی پیش کر دی ہے اور بتایا ہے کہ جب اس کلمہ سے عہد و میثاق اور اعلان شہادت مقصود ہوتا ہے تو اس کے دونوں جملوں کو کلمات شہادت اقر، اشہد، وغیرہ سے مزین کر کے استعمال کیا جاتا ہے اور جب کلمہ کا قول محض، یا تکلم محض، یا ذکر خالص منظور ہوتا ہے تو اسے بغیر ان حروف روابط کے خالص قرآنی الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب کسی کو دائرۂ اسلام میں داخل کرتے ہیں تو چونکہ توحید و رسالت کا اقرار اور عہد و میثاق لینا مدنظر ہوتا ہے اس لئے کلمہ کے دونوں جملوں کو شہادت کیساتھ ادا کر دیا جاتا ہے اور کلمہ شہادت کی تلقین کیجاتی ہے اور جب محض ذکر اللہ یا ذکر وحدانیت و رسالت کے رسوخ کیلئے کلمہ کا تکرار پیش نظر ہوتا ہے تو کلمہ طیبہ کی تلقین کیجاتی ہے جسمیں ادوات شہادت کا اضافہ نہیں کیا جاتا۔

آخر کتاب میں قاری صاحب نے اس اشکال کو دور کیا ہے جو معترضین نے اس کی عربیت کے خلاف ہونے کی صورت میں پیش کیا تھا اور کہا تھا کہ عربیت اور اصول نحو کے لحاظ سے غلط ہے۔ دونوں جملوں کا ایک ساتھ موجودہ شکل میں استعمال صحیح نہیں ہے، آپ نے اولاً تو اس

اعتراض کی بنیاد ہی منہدم کر دی کہ جن قواعد واصول کو پیش نظر رکھکر یہ اعتراض اٹھایا گیا ہے وہ خود اسی قرآن کی طرز ادا اور طرز تعبیر سے ماخوذ ہیں۔ اس لئے ان اصول وقواعد عربیت پر قرآن کی عبارتوں کو جانچنا کسوٹی پر سونے کو جانچنا نہیں بلکہ سونے پر کسوٹی کو پرکھنے کی الٹی منطق اور کھلی ہوئی حماقت ہے۔ یہ کلمہ اپنے اجزاء کے لحاظ سے قرآن میں موجود ہے اور قرآن کے اطلاق کی رو سے ان اجزاء کو انھیں کی ہیئت کے ساتھ ترکیب دے کر یا ملاکر پڑھنا جائز ہے اور اپنی ترکیب کے لحاظ سے بعینہٖ احادیث میں موجود ہے اس کے بعد عربیت کی سند کیلئے کسی رسمی حجت کی ضرورت ہی کہاں باقی رہ جاتی ہے۔

اس کے باوجود قاری صاحب نے کلمہ کی ہیئت کذائی کو درست اور صحیح ثابت کرنے کیلئے فن بلاغت کے قواعد واصول پیش کر کے آپ نے ثابت کیا ہے کہ اصول نحو اور قواعد واصول بلاغت کی رو سے بھی لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کی ہیئت ترکیبی درست صحیح اور فصیح ہے۔ اور اس پر کسی کلام کی گنجائش نہیں ہے، کتاب اپنے موضوع اور عالمانہ طرز استدلال کے لحاظ سے منفرد ہے۔

التشبہ فی الاسلام

قاری صاحب کی یہ کتاب اسلامی تہذیب وتمدن اس کی خصوصیات اس کی اہمیت پر تفصیلی روشنی ڈالتی ہے تہذیب کا ایک لفظ مختصر اپنی پنہائیوں اور معنوی وسعت کے لحاظ سے پوری انسانی زندگی کو گھیرے ہوئے ہے اور صرف مادی اور ظاہری زندگی اس کے دائرے میں نہیں آتی بلکہ اس کا اثر انسان کی داخلی زندگی، خیالات، جذبات، اور رجحانات پر پڑتا ہے، تہذیب ایک قوم کو دوسری قوم سے ایک دور کو دوسرے دور سے ممتاز کرتی ہے تہذیب کا درحقیقت قوموں کی حیات وموت سے گہرا ربط وتعلق ہے اگر کوئی تہذیب فنا ہوگئی اور اس کا وجود مٹ گیا تو سمجھ لیجئے کہ ایک قوم مرگئی اس لئے اگر کوئی قوم اپنی تہذیب کی حفاظت کرتی ہے اور اس کو محفوظ رکھنے کیلئے ہر قربانی دینے کے لئے تیار رہتی ہے تو کوئی طاقت اس قوم کو نہیں مٹا سکتی، اگر کسی قوم کا حقیقی اور علمی وجود مٹانا ہے تو اس کی تہذیب کا گلا گھونٹ دو وہ قوم از خود مر جائے گی، اس کی تہذیب کو تہ وبالا کردو اس قوم کو بغیر ایک قطرہ خون بہائے قتل کر دوگے اور اس کے وجود کو فنا کے گھاٹ اتار دوگے اگر اس قوم کا مادی وجود باقی بھی رہ گیا تو بحیثیت ایک زندہ قوم کے اس کا کوئی وجود نہیں ہوگا اس کی حیثیت سیلاب میں بہتے ہوئے تنکے ہو کر رہ جائے گی اس کی اپنی توانائیوں کا وجود ختم ہو جائے گا۔ اس کی زندگی ایک بے مقصد زندگی ہی ہوگی اس کی حیثیت ایک ایسے کارواں کی ہو جائے گی جس کی کوئی منزل نہ ہو یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اسلامی تہذیب پر بہت زور دیا ہے اسلامی تہذیب میں کسی دوسری

تہذیب کی آمیزش کی سختی سے ممانعت کی ہے تہدید آمیز لفظوں میں کہا گیا ہے من تشبہ بقوم فھو منھم اسلام نے اسی لئے اسلامی تہذیب کی بقا کے اصول و قواعد اور حدود مقرر کئے ہیں اور ان سے سر مو انحراف کو اسلام برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں ہے۔

قاری صاحب کی کتاب التشبہ فی الاسلام اسی اسلامی تہذیب کی خصوصیات اس کی اہمیت اس کے حدود کو روشنی میں لانے کی ایک کامیاب کوشش ہے، مصنف نے اپنی فطری دقیقہ رسی و نکتہ شناسی کی صلاحیتوں کی وجہ سے مسئلہ کو پوری جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے، مانعیت کے پہلو سے اسلامی تہذیب کے گرد ایک آہنی حصار قائم کرنے کی قابل قدر کوشش ہے۔

ایک قوم کا دوسری قوم کی تہذیب کو قبول کر لینا یا اپنی زندگی میں جاری و ساری کو لینا اس قوم کی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ہوتا ہے یہ کس طرح ہوتا ہے ؟ قاری صاحب نے اس کو احادیث و قرآن اور تاریخ کی روشنی میں بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے، آپ نے ان حدود کا بھی ذکر کیا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے کسی دوسری قوم سے ارتباط و تعلق رکھنا اسلام میں جائز ہے اور ان حدود سے تجاوز کرنا کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں۔

آپ نے متعدد آیات قرآنی و احادیث سے مسلمان قوم کا کسی دوسری قوم کا اثر لینے اور اس کے مخصوص افعال و اشکال میں مشابہت اختیار کرنے کو اسلامی شریعت کیخلاف ثابت کیا ہے آپ نے مشہور حدیث من تشبہ بقوم فھو منھم کی معنوی وسعت کو بتاتے ہوئے ان حدود کی نشاندہی کی ہے جس سے آگے بڑھنا ایک مسلمان کے لئے ممنوع ہے مشابہت سے کیا مراد ہے اور کن چیزوں میں مشابہت ممنوع مفصل بیان کیا ہے آپ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے لیکر صحابہ کرام تابعین و ائمہ عظام کے دور تک حوالوں کے ساتھ بتایا ہے کہ کس طرح ہمارے اسلاف دوسری قوموں کی وضع قطع اختیار کرنے سے کتنی سختی سے روکتے تھے اور کتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر گرفت کرتے تھے تاکہ دوسری قوموں سے ادنیٰ تشبہ بھی نہ پیدا ہو۔

آپ نے بڑی وضاحت سے یہ بات بتائی ہے کہ غیر مسلموں سے مشابہت کا مطلب یہ نہیں کہ غیر اختیاری امور میں بھی مشابہت ممنوع ہے البتہ اختیاری امور میں تشبہ کی سخت ممانعت ہے مثلاً سر، داڑھی، اور مونچھوں کے بالوں کے بارے میں خصوصی احکام ہیں کیونکہ اس کی وضع قطع میں آدمی کے قصد و اختیار کو دخل ہے اس لئے سر کے بال یورپین طرز کے رکھنا، جدید فیشنوں کے مطابق بنانا، سنوارنا، کٹوانا، یہودیوں کی طرح کی داڑھی رکھنا، عام غیر مسلموں کی طرح منڈوانا، یعنی مونچھیں اظہار رعونت کیلئے رکھنا ان کو بل دینا داڑھی مونچھ دونوں صاف کرا دینا وغیرہ وغیرہ اب سب باتوں میں اسلامی شریعت کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنے کی اسلام اجازت نہیں دیتا اسی طرح عورتوں کو مردوں کی اور مردوں کو عورتوں کی وضع اختیار کرنا دونوں

ممنوع ہے، ایک مسلمان کا لباس کیسا ہونا چاہیے، اس کی تراش خراش کیسی ہو، اسلام نے اس کے کچھ بنیادی اصول مقرر کئے ہیں، مثلاً ریشمی لباس صرف عورتوں کے لئے ہے مردوں کو اس کا لباس ممنوع، لباس اظہار فخر و مباہات اور تکبر کی غرض سے نہ ہو، پاجامہ ٹخنوں سے نیچے نہ ہو، آستین اتنی لمبی نہ ہوں کہ انگلیاں ان میں ڈوب جائیں، عورتوں کا لباس اتنا باریک نہ ہو جس سے جلد کا رنگ جھلکے نہ اتنا چست ہو کہ اس سے بدن کی ساخت معلوم ہو، اسلام میں ایسے کپڑوں کے استعمال کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے جو خوبصورتی اور گراں قیمتی میں مشہور ہوں اسی طرح وہ لباس بھی ممنوع ہے جو اپنی بدہیئتی میں مشہور ہو، ایسے لباس بھی استعمال کرنے سے روکا گیا ہے جو فساق، آوارہ مزاج بازاری اور بدنام افراد عموماً استعمال کرتے ہیں یا زندیق و بدمذہب لوگ پہنتے ہیں۔

مصنف نے یہ نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ ایک شخص جس طرح کے لوگوں کا لباس اختیار کرتا ہے بتدریج اس کا اندروں بھی اس سے متاثر ہوتا رہتا ہے اور انجام کار اسی ذہن و مزاج کا بن جاتا ہے جس طرح کے لوگوں کا اس نے لباس اور وضع قطع اختیار کی ہے آپ نے مزید بتایا ہے کہ لباس درحقیقت انسانوں میں امتیاز کا بنیادی وسیلہ ہے آپ روزمرہ کی زندگی میں اس کا مشاہدہ کرتے ہیں ہر طبقہ کے لوگوں کو آپ صرف اس کا لباس دیکھکر پہچان جاتے ہیں اور اس کی وضع قطع دیکھکر اس کی حیثیت، اس کے رجحانات اس کی شرافت و رذالت، بدکرداری، نیک کرداری کا اندازہ کر لیتے ہیں، ظاہر کو دیکھکر باطن کا اندازہ عام طور پر کیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام نے دوسروں کے ساتھ مشابہت کو اختیار کرنے سے منع کیا ہے۔

حضرت قاری صاحب نے آیات قرآنی و احادیث سے اپنے ہر دعویٰ کو مدلل کیا ہے اور جو کچھ بیان کیا ہے اس کو کتاب و سنت سے ثابت کیا ہے اور ہر بحث کو بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے اور بڑی باریک بینی سے اس تشبہ کے مسئلہ اور اس کی حدود کو بیان کیا ہے پوری کتاب شواہد و دلائل و براہین آیات قرآنی و احادیث سے بھری ہوئی ہے اپنے موضوع پر یہ ایک اہم کتاب ہے۔

فلسفہ نعمت و مصیبت

یہ کتاب وجود باری کے منکرین کے جواب میں لکھی گئی ہے جب انہوں نے قاری صاحب سے کچھ سوالات کئے تھے، جن دنوں ہندوستان میں جنگ آزادی شباب پر تھی اور بچہ بچہ کے دل و دماغ میں آزادی کا سودا سمایا ہوا تھا۔ اس جنگ میں شریک ہر طرح کے لوگ تھے، ہر فرقہ، ہر مذہب اور ہر طبقہ کے افراد اپنے اپنے نقطہ نگاہ سے اس تحریک آزادی سے وابستہ تھے، جنگ آزادی کے سورماؤں میں وہ طبقہ بھی تھا جو روس کے انقلاب سے متاثر تھا جو اکتوبر ۱۹۱۷ء میں ہوا۔ اس انقلاب نے ان ہندوستانی نوجوانوں کو بے حد متاثر کیا جو ان دنوں یورپ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے روس کا یہ انقلاب درحقیقت کارل مارکس کے نظریہ حیات کمیونزم کی

کامیابی تھی یہ علمی نظریہ حیات عملی وجود کا جامہ پہن چکا تھا۔ یہ ہندوستانی نوجوان جب یورپ سے اپنی تعلیم مکمل کر کے آئے تو انھوں نے ہندوستان میں ایک مشنری کی طرح کمیونزم کی تبلیغ شروع کر دی وہ خود عملی طور پر سب کے سب ملحد، دہریئے، دین بیزار، خدا دشمن تھے۔ کیونکہ کمیونزم صرف ایک سیاسی دستور ہی نہیں تھا بلکہ وہ مستقل طور پر ایک نظریہ حیات تھا جس کا دائرۂ عمل انسانی زندگی کے داخلی خارجی دونوں پہلوؤں تک وسیع تھا اس نظریہ حیات کو عملی حیثیت سے پیش کرنے والا کارل مارکس تھا اس نے اپنی کتاب کیپٹل میں لکھا ہے کہ دنیا میں جتنے بھی انقلابات آئے چاہے وہ بادشاہوں، قومی لیڈروں مذہبی رہنماؤں حتیٰ کہ رسولوں اور پیغمبروں نے وہ انقلاب پیدا کیا سب کی اساسی معاشی مسائل پر تھی۔ ابتدائے آفرینش سے لیکر آج تک کے سیاسی انقلابات کی تہ میں روٹی بیٹی کی جنگ کارفرما تھی اس کے علاوہ کچھ نہیں، خدا، رسول، مذہب یہ سب روٹی روزی کے مسئلہ کو حل کرنے کی راہیں تھیں، اس کے سوا کچھ نہیں مذہب کا وجود انسانی زندگی میں افیون کا نشہ ہے جو انسان کی قوت عملی کو سست اور بیکار کر دیتا ہے۔ اس لئے ایک طاقتور کے لئے ضروری ہے کہ مذہب سے بہت دور رہو، اور اپنی حدود مملکت سے اس کو دیس نکالا دیدے، اسی نقطۂ نگاہ کی وجہ سے ہر کمیونسٹ ہندوستان میں خدا بیزار اور مذہب دشمن رہا، اور خود ان کی اپنی زندگی الحاد کا شکار تھی، لیکن ہندوستان جیسے مذہبی ملک میں اپنے اس عقیدہ کا برملا اظہار نہیں کر سکتے تھے اور وہ محتاط تھے لیکن اپنی تحریروں میں ڈھکے چھپے لفظوں میں بیان کرتے رہتے تھے، چونکہ ہندوستانی معاشرہ اتنا مربوط اور مستحکم تھا کہ کسی خاندان کے کسی جوان کو ہندوستان کے مذہبی ماحول میں دین بیزاری کے برملا اظہار کی ہمت نہیں تھی اس لئے وہ اپنی بدعقیدگی اور الحاد کو اپنے ہی تک محدود رکھتے تھے، زیادہ سے زیادہ اپنے بے تکلف دوستوں میں اپنا ہم نوا بنانے کے لئے اس اظہار کرتے رہتے تھے، اور ملک میں کھلم کھلا مذہب بیزاری کی تحریک نہیں چلائی گئی لیکن ذہنوں کو تیار ضرور کیا جاتا رہا اور نوجوان طبقہ اس سے متاثر بھی ہوتا رہا تاکہ جب وقت آجائے کہ اشتراکی نظام بروئے کار لایا جائے تو آسانی کے ساتھ سمرقند و بخارا اور ایشیائے کوچک کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی طرح یک بیک مذہب کے خلاف طبل جنگ بجا دیا جائے اور مذہب کو دیس نکالا دے دیا جائے روسی انقلاب کی تاریخ ہمارے دعویٰ کی شاہد عادل ہے۔

آزادی سے پہلے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک یہ تحریک دہریت بڑے شباب پر تھی اسی زمانے میں کچھ لوگوں نے خدا کے وجود و انکار پر مشتمل کچھ سوالات قاری صاحب کو لکھ کر بھیجے تھے جس میں ان سے ایسے جواب کی فرمائش کی گئی تھی جو عقل و درایت کی روشنی میں دیا گیا اور جواب اس کسوٹی پر پورا اترے، قرآن و حدیث سے کسی مسئلہ کو ثابت کرنا ان کے نزدیک کوئی وزن نہیں رکھتا تھا، ان کو یقین تھا کہ کارل مارکس نے جو تھیوری دنیا کے سامنے پیش کی ہے وہ فلسفیانہ ناقابل شکست دلائل سے مسلح ہے، بوسیدہ روایتوں

فرسودہ عقائد، اور دقیانوسی نظریہ رکھنے والے مولویوں میں کہاں سے وہ علم پیدا ہوگا کہ اس کا کوئی عقلی جواب دے سکیں اس لئے سوال نامہ میں اس بات پر پورا زور دیا گیا تھا کہ جو جواب دیا جائے وہ عقل اور کی میزان پر پورا اترے، محض قرآن و حدیث کا حوالہ دینا کافی نہیں ہے، کیوں کہ ان کے نزدیک ان دونوں کی کوئی قدر و قیمت اور کوئی حیثیت ہی نہیں تھی وہ سمجھتے تھے کہ پہلے کے ذہین لوگوں نے اپنے دور میں انقلاب برپا کرنے کے لئے یہ کتابیں لکھی تھیں اور اس کی وجہ سے انقلاب برپا کرنے میں وہ کامیاب بھی ہوئے لیکن ان کا دور اب ختم ہو چکا ہے اور نئے انقلاب کیلئے ایک نئے نظریہ حیات کی ضرورت ہے اور وہ کمیونزم ہے۔

وہ سوالات جو قاری صاحب کو بھیجے گئے تھے اور ان کے رسالہ "مذہب کے آنسو" میں بھی شائع ہوئے تھے مختصر طور پر یہ تھے کہ اللہ اگر رحیم و کریم ہے۔ تو اس کے رحم و کرم کا یہ تقاضا تو نہیں کہ انسان ہر وقت درد و غم اور آفات و مصائب میں گرفتار رہے، اگر انسان اپنے اعمال کی وجہ سے گرفتار بلا ہے تو آسمانی بلائیں پیہم اور ہر دم نازل ہوتی رہتی ہیں؟ یا رحم و کرم ہے یا ظلم و ستم؟ کہ خدا کسی بھی وقت رحم و کرم کی نگاہ ہی نہیں کرتا اور اگر یہ آفات و مصائب انسانوں کے گناہوں کے نتیجہ میں آتی ہیں تو بچے، معصوم افراد نیک اور دین دار لوگ حتی کہ بے قصور جانور تک اس خدائی عذاب کو بھگتنے کیلئے کیوں مجبور کئے جاتے ہیں ان کا کون سا گناہ ہے اور کون سا قصور؟ جس کی پاداش میں وہ مبتلائے درد و غم ہوتے رہتے ہیں؟ اور اگر یہ مصائب انسان کو عبرت و سبق دینے کیلئے آتی ہیں تو خدا کو ایسا ظالمانہ اور بے رحمانہ طریقہ اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی کوئی دوسرا آسان طریقہ اختیار کرتا جیسے ڈاکٹر کوئی بڑا آپریشن کرتا ہے تو کلوروفارم سنگھا کر پہلے بیہوش کر دیتا ہے تب آپریشن کرتا ہے تاکہ مریض نشتر کی اذیت نہ محسوس کرے اگر روحانی اصلاح میں یہ بھی نہیں تو اس کو سوائے بے رحمی اور ظلم کے اور کیا کہا جائیگا۔ اور اس کی کمال قدرت بھی مشتبہ ہو جاتی ہے کہ اس طریقہ کے علاوہ اس کو کسی دوسرے طریقہ علاج پر قدرت ہی نہیں ہے اس سے زیادہ تو انسان ہی ہے کہ وہ رحم و کرم کا پتلا بن سکتا ہے وہ ایسی دوائیں ایجاد کرتا ہے اور طریقہ علاج کو کام میں لاتا ہے کہ اس سے اجتماعی وبائیں اور بیماریاں بھی کم ہو جاتی ہیں، کالرا، طاعون، چیچک، ملیریا کی وبائیں ڈاکٹروں کی محنت کے نتیجہ میں بڑی حد تک کم ہو گئیں اور انسانیت کو ان مصیبتوں سے انھوں نے نجات دلا دی ورنہ خدا تو پہلے مسلسل یہ بلائیں بھیجتا رہتا تھا۔

اور اگر یہ مصائب انسانوں کی آزمائش اور جانچ کے لئے ہیں تو اس کو علیم و خبیر بھی تو کہا جاتا ہے کون سا ایسا راز رہ گیا ہے کہ ہزاروں برس کے بعد بھی اس کو معلوم نہیں ہو سکا اور انسانوں کو مسلسل آزمائے چلا جا رہا ہے۔ اگر انسان خدا کو چھوڑ کر اپنی عقل اور تجربہ کی رہنمائی میں کام کرے تو اس سے زیادہ آرام میں رہ سکتا ہے، جن ملکوں کی سائنس نے ترقی کی ہے آج ان کو دنیا کی ساری آسائشیں اور سہولتیں میسر ہیں وہ ہر طرح پرسکون اور مطمئن زندگی گزارتے ہیں۔ ان کا معیار زندگی، ان کا رہن سہن ساری دنیا کیلئے باعث رشک ہے اگر وہ بھی

خدا کے بھروسے پر بیٹھے رہتے تو دانے دانے کو محتاج رہتے، چیتھڑے لپیٹے رہتے، خدا سے دعائیں کرتے رہتے اور خدا ان کو سسک سسک کر مرتے ہوئے دیکھتا رہتا اور ان کو اس سے چھٹکارا کی بات بھی نہیں سوجھتا جیسا کہ عام طور سے مذہب کے نام لیوا ملکوں کے باشندوں کا حال ہے ان حالات و اسباب کی بنا پر اگر کوئی خدا کے وجود سے انکار کرتا ہے تو کیوں قابل ملامت ہے اور اس کا کیا قصور ہے؟

قاری صاحب نے اپنی کتاب میں دو طرح کے جوابات دیئے ہیں ایک تو الزامی جواب ہے دوسرا اصولی اور تحقیقی الزامی جواب میں آپ نے انہیں کے انداز پر بات پلٹ کر مسکت جواب دیا ہے بذات خود یہ جواب بھی خاموش کرنے کیلئے کافی ہے آپ نے تحریر کیا کہ اگر ایک طرف آفات و مصائب آتی رہتی ہیں جنکی تم شکایت کرتے ہو تو انہیں کے مقابل بیشمار نعمتیں اور لطف و کرم کے بے پناہ احسانات بھی موجود ہیں اگر بیماری پھیلانے والے ایذا دینے والے جانور ہیں تو اس کے بالمقابل ایسے بھی جانور ہیں جو صحت بخش اور قوت آفریں ہیں اگر زمین پر آفات سماویہ آتی ہیں تو دوسری طرف فضاؤں کی نسیم جانفزا، فرحت بخش ہوائیں، بادلوں کی سخاوت، بارش کی حیات بخشی، دریاؤں کی حیات آفرینی، دانائے عالم کیلئے صد الوان نعمتوں اور زندگیوں کا سہارا بھی موجود ہے غرض جتنی مصیبتیں آپ شمار کرا سکتے ہیں ان کے مقابلہ میں ان سے کہیں زیادہ ہم نعمتیں گنوا سکتے ہیں بلکہ ہر نوع میں جہاں مصیبت کا پہلو ہے وہیں اسی میں راحت و سکون کا بھی پہلو موجود ہے اگر زہر جان لیوا ہے تو انہیں زہروں سے بہت سی بیماریوں کا علاج بھی کیا جاتا ہے اس لئے اگر تم ان مصائب کی وجہ خدا کا انکار کرتے ہو تو ان نعمتوں پر خدا کے وجود کا اقرار کیوں نہیں کرتے؟ یہ کون سی منطق ہے کہ مصیبت بھیجنے کا فعل تو اس کے انکار کیلئے حجت ہو مگر اس کی نعمتیں نازل کرنے کا فعل اس کے اقرار کی حجت نہ ہو، ان آفتوں پر خدا کا شکوہ تو جائز ہو مگر ان کے مقابل اضعاف مضاعف نعمتوں پر اس کا شکریہ جائز نہ ہو، یہ عقل و فہم کا کیسا فیصلہ ہے؛ اور یک طرفہ فیصلہ کیوں ہے؟

الزامی جواب کو قاری صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں بڑی تفصیل سے تحریر فرمایا ہے اس کے بعد جو تحقیقی جواب دیا ہے وہ اردو میں کلامی مباحث کا ایک بے مثال شاہکار ہے یہ جواب چھوٹے سائز کے ۲ پاسو صفحات پر پھیلا ہوا ہے، ترتیب مقدمات و استخراج نتائج کی ایک طویل بحث پر مشتمل ہے اور یہ بحث کتاب ہی میں پڑھنے کی چیز ہے، یہ جواب ایسے عقلی مقدمات پر مشتمل ہے اور ہر استدلال اتنا محکم اور ناقابل تردید ہے کہ اس کی صداقت کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں، وجود باری پر جتنے شبہات بھی وارد ہو سکتے ہیں ان کا مدلل و مبرہن جواب دیا ہے کتاب نوع بنوع مباحث طرز استدلال و استخراج نتائج کے اعتبار سے ایسی ہے کہ عوام کے بجائے اہل علم کے مطالعہ کی چیز ہے منکرین وجود باری میں اگر ضد کا مادہ نہیں ہے تو یقیناً ان کا دل ان دلائل پر مطمئن ہو جائے گا ورنہ ضد کے سامنے تو سر پر چمکتے ہوئے سورج کا بھی انکار کیا جا سکتا ہے۔

آفتاب نبوت

قاری صاحب کی تقریر رنگین، شیریں زبانی وحلاوت بیانی کے ساتھ، الفاظ صحیح انداز بیان جچا تلا احادیث وآیات قرآنی کے ایک ایک لفظ سے نکتہ آفرینی کی خصوصیت کی وجہ سے ہر ایک کے لئے اپنے اندر بڑی دلکشی رکھتی تھیں وہ ایک فصیح وبلیغ خطیب کی حیثیت سے پورے ملک میں قابل رشک شہرت رکھتے تھے۔ یہ شہرت سطحی باتوں کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ ان کی تقریروں کی معنوی قدر وقیمت کی بنا پر تھی، ان کی ہر تقریر اپنے اندر ایسے علمی جواہر پارے رکھتی تھی جہاں تک عام اہل علم کی رسائی نہیں تھی۔ کچھ قدرتی طور پر آپ کا ذہن گہرائیوں میں ڈوب کر ایسے نادر ونایاب اور بیش قیمت نکال لاتا تھا جو دوسروں کی دسترس سے باہر تھا اس لئے اگر ان کی تقریر کو قلمبند کر کے شائع کر دیا جائے تو کم ہی لوگ سمجھ پائیں گے کہ یہ سنبھل سنبھل کر لکھی ہوئی کتاب ہے یا کوئی برجستہ تقریر، مثال میں قاری صاحب کی یہی کتاب "آفتاب نبوت" پیش کی جا سکتی ہے۔

یہ قاری صاحب کی سیرت نبوی پر ایک عالمانہ تقریر ہے جو قلمبند کر کے شائع کر دی گئی ہے اور خود قاری صاحب کے قلم سے ہے، حسب دستور ابتدا میں ایک لمبی تمہید، خوبصورت الفاظ کے برمحل استعمال اور اس کے معنویت کے نئے نئے پہلو تراشنا استعارات ومجازات کا ایک طویل سلسلہ جو ابتداء کتاب سے آخر تک یکساں ہے پایا جاتا ہے کتاب پڑھتے جائیے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اہل علم مرصع عبارت میں شاندار تقریر سنا رہا ہے، انداز تحریر، انداز بیان اور لب ولہجہ سے ہم آہنگ ہے صاف پتہ چلتا ہے کہ لکھا نہیں جا رہا ہے بلکہ بولا جا رہا ہے، آفتاب نبوت ذات نبوی کا استعارہ کیا گیا تو آخر کتاب تک اس استعارہ کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے اور سیرت کے ہر ہر پہلو کو اسی آفتاب اس کے نور اور اس سے متعلق اشیاء وکیفیات وخصوصیات کے استعاروں میں گفتگو کی گئی ہے۔ اگر اس کو تصنیف مان لیا جائے تو کہا جائے گا کہ سیرت کے موضوع پر اپنی نوعیت کی یہ منفرد کتاب ہے جس میں تقریر وتحریر دونوں کی چاشنی موجود ہے اس میں دو لذتیں ہیں ایک سے دل محظوظ ہو رہا ہے اور دوسری سے قوت سامعہ لطف اندوز ہو رہی ہے

قاری صاحب کا شمار ان علماء میں تھا جن کا اپنا ایک علمی مقام تھا اور وہ اپنے دل میں اصلاح وتبلیغ کا پاکیزہ جذبہ رکھتے تھے ان کی تقریر کا مقصد عوام وخواص کو اسلامی تعلیمات وروایات کی اہمیت وعظمت سے آگاہ کرنا، سیرت نبوی کے ان گوشوں کو روشنی میں لانا تھا جو دلوں میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر ومنزلت، علو شان، علوئے مرتبت کو جاگزیں کر دیں وہ اپنے موضوع سے ایک لمحہ کیلئے بھی صرف نظر نہیں کرتے تھے۔ ذخیروں سے واقفیت کی بنیاد پر اپنی طویل ترین تقریروں میں بھی جو اپنا موضوع سخن بنا لیا اس سے سر مو انحراف نہیں کرتے تھے جب تقریر ختم ہوتی تو ہر سننے والا محسوس کرتا کہ اپنے موضوع پر ایک سیر حاصل اور مفید بحث سے استفادہ کا موقعہ حاصل ہوا، اگر کوئی شخص تقریر کا خلاصہ بتانا چاہے تو دوسرے کو آسانی سے بتا سکتا کیوں کہ وہ ایک مربوط بیان اور علمی شاہکار ہوتا تھا میرے اس

بیان کی وہ تمام لوگ شہادت دے سکتے ہیں جنھوں نے کبھی بھی قاری صاحب کی تقریر سنی ہے اور ان کے وعظ میں شریک ہوئے ہیں۔

"آفتاب نبوت"، کی تقریر داعیاً الی اللہ باذنہ و سراجاً منیرا آیت کی تفسیر و تشریح پر ہے اور حق یہ ہے کہ پوری تقریر ایک مرصع، شاندار اور خوبصورت شہ پارہ ایک کا مرقع ہے جو کتابی شکل میں آفتاب نبوت کے نام سے پیش ہے۔

مضامین کے مجموعے

میرے سامنے قاری صاحب کی جتنی کتابیں بروقت موجود تھیں میں نے ان کا تعارف پیش کر دیا ہے ان کے علاوہ ان کے مضامین کے بہت سے مجموعے بھی مرے سامنے ہیں ان میں اہم مضامین معجزہ کیا ہے؟ "نسب اور اسلام" میلاد النبی کی حقیقت تصویر اسلام کے آئینہ میں، اردو کی شرعی حیثیت، شبر قرآنی، اسلام کے امتیازی پہلو، فہم قرآن اور تعلیم مذہب کے دو بنیادی اصول سورہ فیل میں پرویزی تحریف خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ان میں بعض طویل مقالے کی حیثیت رکھتے ہیں جو کامل غور و فکر کے بعد سپرد قلم کئے گئے ہیں یہ تمام مضامین حکیم الاسلام کے حکیمانہ طرز استدلال، ٹھوس معلومات، مستحکم دلائل، آیات قرآنی سے استنباط مسائل، اور استخراج نتائج کے بہترین شاہکار ہیں لیکن فی الحال ان پر تبصرہ میرے موضوع سے خارج ہے اس لئے ان پر گفتگو نہ کر کے اتنی بات کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ اگر اہل علم ان مضامین کا مطالعہ کریں تو وہ محسوس کریں گے کہ ان کے علم میں اضافہ ہوا، ان کی معلومات کا دائرہ مزید وسیع ہو گیا، کیوں کہ قاری صاحب نے جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے سطحی طرز کلام اختیار نہیں کیا ہے، ان میں سے کوئی بھی مقالہ یا مضمون ان کی عالمانہ محققانہ اور حکیمانہ شان سے فروتر نہیں ہے۔

آخری بات!!

قاری صاحب ایک عظیم المرتبت علمی خانوادے کے فرد فرید ہیں اس خانوادے کا ہر فرد علم و فضل کا آفتاب و ماہتاب ہے اور کہا جائے کہ "ایں خانہ ہمہ آفتاب است" تو اظہار واقعہ ہوگا، قاری صاحب کے جد امجد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے جس علم کلام کا علماء میں ذوق پیدا کیا تھا حضرت قاری صاحب کو اس سے حظ وافر ملا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی بیشتر کتابوں پر ان کا یہ حکیمانہ رنگ چھایا ہوا نظر آتا ہے، اس کی وجہ سے ان کی تصنیفات مرعوب کن، دقیق اور شاندار ہو جاتی ہے اور ان کی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے، چوں کہ زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے اس لئے دقیق کلامی مباحث کو اردو میں سہل بنا کر پیش کرنے میں ان کو کمال حاصل ہے، البتہ زبان بالعموم وہ استعمال کی گئی ہے جو ہمارے عربی مدارس کی درسی تقریروں میں رائج ہے۔ جس کی وجہ سے زبان بوجھل ہو جاتی ہے، عربی زبان کے ایسے مغلق اور اجنبی الفاظ مسلسل استعمال کرتے ہیں جن سے اردو داں طبقہ بڑی حد تک نامانوس ہے جب کہ اردو کو سہل اور سادہ بنا کر اس میں علمی مباحث کو

اداکرنے کی جدوجہد کیجارہی ہے شبلی نے اس دور میں اپنی کتابیں لکھکر ایک روشن مثال قائم کردی ہے جبکہ اردو پر ابھی پورے طور پر نکھار بھی نہیں آیا تھا لیکن انھوں نے اپنی معرکۃ الآراکتابیں لکھ کر ثابت کردیا کہ دقیق علمی مسائل بھی سلیس اردو میں اس طرح پیش کئے جاسکتے ہیں کہ اظہار مطالب کو ادنیٰ ٹھیس بھی نہیں لگ سکتی ہے۔ اردو زبان تو اس کے بعد اور بھی وسیع ہو چکی ہے اب ہر طرح کے مباحث کیلئے اس کے پاس ایک عظیم الشان ذخیرہ الفاظ ہے۔ کہیں بھی قلم کو اردو کی تنگ دامانی کی شکایت لاحق نہیں ہو سکتی ہے۔ میں صرف ایک کتاب کے ایک صفحہ سے چند الفاظ بطور مثال پیش کرتا ہوں بعض الفاظ کا تلفظ بھی اردوداں طبقہ کو دشوار محسوس ہوگا مثلاً مستضر بجانہ، مالوفات، زتی دہیئة، تجمل وتزین، نقد عیار، دورالتباس مستقلا لغتہ، تدین، متشتت، مائدہ، باصرہ اہل نظر، وغیرہ جب اردو تحریر میں ان لفظوں کو استعمال کیا جاتا ہے تو یہ الفاظ اسطرح وحشت زدہ نظر آتے ہیں جیسے کوئی اجنبی بے تکلف دوستوں کی محفل میں گھس آئے۔

دوسری بات جو میں نے محسوس کی وہ یہ ہے کہ قاری صاحب کی بیشتر کتابوں پر وعظ وتقریر کا انداز و بیان غالب ہے۔ مروجہ تقریروں کی طرح طویل ترین تمہید، بات اتنی دور سے شروع ہوتی ہے کہ معلوم نہیں ہوتی ہے کہ اصل موضوع سے کیا تعلق ہے ایک شخص کتاب کا موضوع معلوم کرکے کتاب اٹھاتا ہے اور چاہتا ہے کہ موضوع سے متعلق فوراً کچھ معلوم کرلے اور جب کتاب شروع کرتا ہے تو بڑی دور تک اس کی رسائی اصل موضوع تک نہیں ہوتی تو اکتاہٹ محسوس کرتا ہے حالانکہ اگر یہ تمہیدی صفحات کوئی پڑھ لے تو اصل موضوع کے علاوہ بھی اس کی معلومات میں قابل قدر اضافہ ہوگا کیوں کہ بالعموم تمہید میں جو بحثیں اٹھائی گئی ہیں وہ بڑی عالمانہ اور حکیمانہ ہیں اسلئے اس کا وقت رائگاں نہیں ہوگا لیکن انسان بڑا عجلت پسند واقع ہوا ہے اسلئے وہ جلد از جلد اپنے مطلب کی باتیں جاننا چاہتا ہے اس لئے طویل تمہید سے اس کے ذہن پر افسردگی طاری ہو جاتی ہے

حاصل کلام

حضرت قاری صاحب علم وفضل کے بلند ترین مقام پر فائز تھے اس سے نیچا تر کر باتیں کرنا انکے لئے ممکن ہی نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ ان کی تقریر یا تحریر دونوں میں وہ علمی جواہر وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں جو عام کتابوں کے مطالعہ سے حاصل نہیں کئے جاسکتے ان کی تقریر وتحریر جہاں انکے وسیع مطالعہ ومعلومات کا پتہ دیتی ہیں وہیں یہ بھی یقین کرنے پر مجبور کرتی ہیں کہ قاری صاحب کو قدرت نے علماء متکلمین کا ذہن وقاد عطا فرمایا ہے، اسی لئے ایک ایک لفظ سے معارف وحقائق کے لئے نکتے خود پیدا کر لیتے ہیں جو کتابوں میں آسانی سے دستیاب نہیں ہو سکتے اسلئے اگر اہل علم حضرت قاری صاحب کی تصنیفات کو اپنے مطالعہ میں رکھیں تو ان کو علمی زندگی میں بڑی روشنی ملیگی، قاری صاحب کی یہ تصانیف درحقیقت اہل علم پر احسان عظیم ہے اور جبتک یہ کتابیں پڑھی جائینگی ان کا نام نیک زندہ وپائندہ رہیگا اور جن نیک مقاصد ومقدس جذبات کے تحت یہ کتابیں وجود میں آئی ہیں ان کی وجہ سے امید ہے کہ قدرت نے اپنی رحمتوں مغفرتوں اور انعامات سے یقیناً نواز دیا ہوگا اور رحمت خداوندی نے استقبال کرتے ہوئے ان کی روح سے کہا ہوگا۔

ادخلی فی عبادی وادخلی جنتی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؁

مولانا محمد ظفیر الدین دارالافتار دارالعلوم دیوبند

ایک جامع کمالات شخصیت !!!

اچھی طرح یاد ہے کہ سب سے پہلے حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کو میں نے شہر مونگیر کے ایک عظیم الشان اجلاس میں دور سے دیکھا جب آپ کرسی پر بیٹھے وعظ کر رہے تھے، وعظ اس قدر دلآویز و دل پذیر تھا کہ پورے مجمع میں کہیں سے کھانسنے کی آواز تک نہیں آرہی تھی، ایسا معلوم ہورہا تھا کہ واعظ جادو کر رہا ہے اور پورا مجمع ہمہ تن گوش اس کی طرف متوجہ سکتہ کے عالم میں ہے، خود اپنا بھی اس وقت یہی احساس تھا کہ آپ سے بڑھ کر موثر بولنے والی شخصیت دوسری نہیں ہے دو ڈھائی گھنٹہ رات کے دس بجے سے ساڑھے بارہ بجے تک مسلسل بولتے رہے، لیکن مجمع جب وہاں سے اٹھا تو سب کی زبان پر تھا کہ تقریر جلد ختم ہوگئی، کاش کچھ دیر تک اور حضرت مہتمم صاحب بولتے رہتے۔ اور ہم لوگ سنتے رہتے، تقریر کا عنوان تھا یٰبنیّ اقم الصلوٰۃ وأمر بالمعروف وانہ عن المنکر واصبر علی ما اصابک ان ذالک من عزم الامور (لقمان ۲)

حضرت مہتمم صاحب کی زبان بہت شیریں، لب ولہجہ بڑا ہی خوشگوار، اور انداز بیان ہلکا پھلکا بہت سلیس و دلنشیں تھا، قرآن پاک کی آیتیں، احادیث نبوی کے ٹکڑے اور صحابہ کرام و اولیاء اللہ کے تاریخی واقعات اس طرح تقریر میں برجستہ پڑھتے اور بیان کرتے جاتے کہ سننے والا محو حیرت رہ جاتا، پوری تقریر مربوط مدلل اور ذہن و فکر کو متاثر کرنے والی تھی، اپنا تاثر یہی تھا کہ اس قدر بلیغ، عام فہم اور موثر وعظ کبھی اور سننے میں نہیں آیا، یہ حقیقت ہے کہ آپ جہاں تقریر کرنے گئے چھا گئے، نہ گھن گرج، نہ نشیب و فراز، نہ ہاتھ پاؤں کے اشارے، سنجیدہ و متین اور صاف و شستہ انداز، کہا جاسکتا ہے کہ آپ بلاشبہ اپنے دور کے بے مثال واعظ و مقرر اور جاندار خطیب تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتک وہ تقریر ذہن کے گوشوں میں گونج رہی ہے۔

ابتک دور سے ہی سنا تھا اور دور سے ہی دیکھا تھا، ان دنوں خاکسار دارالعلوم معینہ سانحہ ضلع مونگیر کی صدارت تدریس کی خدمت انجام دے رہا تھا، اور اس مدرسہ کو خس پوش چھپر سے پختہ بلڈنگ میں منتقل کرنے کی جدوجہد میں ہمہ تن مصروف تھا، ۳۰ جون ۱۹۵۶ء کو دارالعلوم دیوبند (یوپی) کا ایک لفافہ ڈاک سے موصول ہوا، حیرت ہوئی کہ دیوبند میں میرا کوئی نہیں، کس نے یاد کیا، کھولا تو دارالعلوم کے پیڈ پر ٹائپ شدہ خط ملا۔

حضرت المحترم زید مجدکم السامی

سلام مسنون، نیاز مقرون، صحت وری مزاج کا خواہاں ہوں، اس وقت ایک خاص ضرورت سے عریضہ

لکھ رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اس وقت دار العلوم کے شعبہ تبلیغ اور یہاں کے نشر واشاعت کو ایک ایسے فاضل کی ضرورت ہے، جو صاحب قلم، خوش تحریر، اور شرعی مسائل وحقائق کو دلنشین پیرایہ میں اچھے اسلوب کے ساتھ۔ موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق پیش کرنے پر قادر ہو۔ بالخصوص مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کے اُن نظریات کا جو اہلسنّت والجماعت کے مسلک سے ہٹے ہوئے ہیں، اصول ودلائل کی روشنی میں تجزیہ کرکے ان کا کھرا اور کھوٹا واضح کرسکتا ہو، نیز مخالف تحریرات سے انصاف واعتدال کے ساتھ اخذ کرنے اور اس پر سنجیدہ گرفت کرنے کا سلیقہ رکھتا ہو۔ اور معاندین کے شبہات واعتراضات کا شرعی مواد کی روشنی میں متانت کے ساتھ جواب دینے کی اہلیت رکھتا ہو، ساتھ ہی اکابر دار العلوم کے بتلائے ہوئے اسالیب بیان وعنوانات کلام پر، ان کے ذوق وفکر کی مدح کو محفوظ رکھتے ہوئے، اچھے ڈھنگ سے ان کے مقصود کی ترجمانی کرسکتا ہو، اور اسی کے ساتھ احیاناً دار العلوم کی ضروریات یا بیرونی دعوت پر حسب موقع تقریر وبیان پر بھی قادر ہو۔

اس سلسلہ میں مختلف شخصیتوں کے نام کے ساتھ جناب کا اسم گرامی بھی سامنے آیا، بندہ کا حسن ظن تو ذات سامی کی نسبت جو ہے وہ ہے، اور وہی اس تحریر کا باعث ہوا ہے لیکن درخواست یہ ہے کہ معیار بالا کی رو سے اپنے بارہ میں خود جناب بے تکلف اظہار خیال فرمادیں، کہ ان خدمات مطلوبہ کو جذبات مذکورہ کے ساتھ انجام دے سکیں گے یا نہیں؟ اگر دے سکیں تو مطلع فرمادیں تاکہ میں مجلس انتخاب میں اسم گرامی کو اپنی سفارش کے ساتھ پیش کرسکوں، ساتھ ہی اگر کوئی مقالہ یا رسالہ یا مضمون یا تالیفات میں سے ہو تو اسے بھی ارسال فرمادیں، خواہ مطبوعہ ہو یا مخطوطہ،

امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا والسّلام محمد طیب

مہتمم دار العلوم دیوبند ۷۵-۱۱-۱۵

خاکسار نے اس خط کو بڑی عقیدت ومحبت کی آنکھوں پڑھا دل نے گواہی دی کہ ایک عالم ربانی ایک گمنام ناچیز کی عزت افزائی فرما رہا ہے۔ اور غالباً دو تین مرتبہ پڑھا، یہاں یہ ظاہر کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ ابتک میں تحریر کی جامعیت اور قیود وشرائط میں حکیم الامتہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا قائل تھا، اور رحمہ اللہ اب تک ہوں، مگر اوپر کا خط پڑھ کر حیرت زدہ رہ گیا، اور تحریر بالا کی جامعیت اور شرائط وقیود دیکھ کر دنگ تھا کہ اس میں حکیم الامتہ کی تحریر کی پوری جھلک موجود تھی، اس پہلی تحریر کو اپنے نام اس پاکیزہ لب ولہجہ میں پڑھ کر دلی مسرت ہوئی، اور مری خود اعتمادی کو ٹھیس لگی اور سمجھا کہ ایک گمنام، طالب العلم، اور نو عمر مدرس کو اس طرح خطاب فرمایا گیا، یہ محض رب العالمین کا فضل وکرم ہے، حضرت والا کا وعظ جلسہ میں سن چکا تھا۔ اب قلمی تحریر دیکھی دل ودماغ میں عظمت اور تقدس پیوست ہوگیا اور یقین کرنا پڑا کہ جیسا

سنتا تھا، ویسا ہی اس کے اس سے کچھ زیادہ پایا، پھر قدرت نے مجھے سانحہ سے دیوبند پہونچا دیا اور زندگی
میں بالکل پہلی مرتبہ ۳ صفر ۱۳۷۶ھ کو خدمت میں حاضر ہو کر اطمینان کے ساتھ ملا کریمانہ اخلاق سے ملے
بیان نہیں کر سکتا، پھر تو یہ دستور ہو گیا کہ دن کے کسی حصہ میں حضرت مہتمم صاحبؒ کی مجلس میں پابندی سے چلا
جاتا، اور رات میں حضرت مدنی قدس سرہٗ کے درس بخاری میں حاضری دیتا، سال بھر پوری پابندی کی، اور
اس طرح مدت کی حسرت پوری ہوئی، اور اپنے ان دونوں بزرگوں سے استفادہ کا موقع حصہ میں آیا۔

حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس کے متعلق پورے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس دور
میں ایسی عالمانہ مجلس اور حکیمانہ باتیں ناپید ہیں، اب اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے، مسلسل گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ
طلبہ اور علماء مختلف علمی سوالات کرتے اور حضرت مہتمم صاحبؒ برجستہ ان کا جواب دیتے، اور کتاب و سنت سے
دلائل بھی پیش کرتے جاتے، اور عقلی طور پر ذہنوں میں راسخ کرنے کی سعی فرماتے، نہ کسی پر تنقید و تبصرہ ہوتا
نہ کسی کی غیبت، خالص علمی، دینی مسائل پر مسلسل گفتگو، کسی کا نام آیا تو بڑے ادب کے ساتھ نام لیتے اور اس
کے فضائل و مناقب بھی بیان کرتے، اکابر دارالعلوم سے بہت گہری مناسبت اور دلچسپی تھی، ہر مجلس میں ان کے
دو چار تاریخی حقائق کا تذکرہ ضرور آتا، تاریخ سازی کا انداز ایسا دیکھنے میں نہیں آیا، ایک سال رمضان کی مجلسوں
کی تقریر یا گفتگو کے لئے بعض لوگوں نے ٹیپ ریکارڈ کا انتظام کیا، اور خاکسار نے ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے ان
باتوں کو مرتب کیا جو "حکیم الاسلام اور ان کی مجالس" کے نام سے کتابی شکل میں بہت پہلے چھپ کر شائع ہو چکی ہے
اس کتاب کو پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت مہتمم صاحبؒ کی مجلس میں کتنے اور کیسے علوم ہوا کرتے تھے
اور انداز بیان کس قدر دلچسپ ہوتا تھا، دنیا جانتی ہے کہ حضرت کا دل کینہ کپٹ اور میل کچیل سے بالکلیہ پاک و صاف
تھا، دارالعلوم کے اساتذہ اور دوسرے علماء کا بڑا احترام فرماتے۔
مزاج خالص علمی اور دینی تھا، اہل علم کی بڑی قدر و منزلت فرماتے تھے، میں جس سال نیا نیا یہاں
آیا، سات آٹھ ماہ کے بعد دارالعلوم معینہ سانحہ سے ایک محضر نامہ آیا کہ ہمارے مدرس جو آپ کے یہاں گئے
ہیں ان کو واپس فرما دیں، اس دن مجھے اپنے دولت خانہ پر حضرت نے یاد فرمایا، جب میں حاضر ہو گیا تو اندر سے
تشریف لائے، اور بیٹھ گئے، مزاج پوچھنے کے بعد کہنے لگے کہ آپ کے مدرسہ سے ایک لمبا چوڑا محضر نامہ ملا ہے
اس سلسلہ میں کچھ دریافت کرنا ہے، پہلے دارالعلوم کے فضائل اور حالات پر مختصر روشنی ڈالی، پھر فرمایا کہ
جب آدمی نئی جگہ آتا ہے تو نئے حالات سے سابقہ پڑتا ہے، نئے ماحول میں کچھ افراد موافق ہوتے ہیں،
کچھ مخالف، کوئی تعریف کرتا اور کوئی تنقید، مگر یہ سب عارضی باتیں ہوتی ہیں۔ اور تھوڑے دنوں کے بعد آدمی
کا ایک مقام بن جاتا ہے، پھر یہ سب بیان کر کے فرمایا کہ میں تو آپ سے صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ تو گھبرا
نہیں گئے ہیں؟ میرے جواب کے بعد فرمایا مجھے آپ کا لحاظ و خیال ہے، دارالعلوم میں اہل علم کی تعداد میں اضافہ
کرنا چاہتا ہوں، سیاسی تو بہت سارے علماء ہونے لگے اہل علم کمیاب ہوتے جا رہے ہیں، اس کمی کا مجھے

احساس ہے آپ جانتے ہیں آج کل ذوق علمی نایاب ہے حالانکہ اصل چیز یہی ہے، علم پر تھوڑی دیر بولتے رہے، پھر اصل گفتگو پر آئے آپ نے اپنی دو ضرورتیں بتائی ہیں، یہ دونوں پوری ہوں گی، اور دونوں کا ہی انتظام کردوں گا آپ بالکل مطمئن رہیں میں ابھی آپ کے مدرسہ کو جواب لکھدوں گا آپ کو جو ضرورت ہو مجھ سے آکر بیان کریں۔

حضرت مہتمم صاحبؒ کی ان باتوں سے میں کافی متاثر ہوا اور ابتک جیسا میں نے ان کو سمجھا تھا اس کا تیقن بڑھتا ہی چلا گیا مجھے یاد نہیں کہ اس کے بعد کبھی بھی میں اپنا کوئی مسئلہ ۲۶ سال میں لیکر حضرت کی خدمت میں گیا یا اپنے سلسلہ میں کوئی بات کہی مگر اس کا یقین رہا کہ مہتمم صاحبؒ کی نظر عنایت منعطف ہے، اہتمام کے نام جب کوئی علمی و تحقیقی سوال آتا تو عموماً میرے نام بھجوا دیتے میں جواب لکھ کر دفتر اہتمام کے سپرد کردیتا حضرت نظر ثانی کر کے اسے بھجوا دیتے۔

دو سال بعد دار العلوم معینیہ کے اصرار پر ایک دفعہ مجھے تین ماہ کی رخصت لیکر وہاں جانا پڑا۔ حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس وعدہ پر چھٹی بلا مشاہرہ منظور فرمادی کہ اس تین ماہ کے بعد فوراً حاضر ہو جاؤں گا رخصت پر میرے چلے جانے کے بعد کچھ لوگوں نے یہ پروپیگنڈا کیا کہ میری واپسی نہیں ہوگی، اس لئے میری جگہ دوسرے صاحب کو رکھ لیا جائے یہ باتیں حضرت مہتمم صاحبؒ سے بھی بار بار کہی گئیں اور مختلف لوگوں کے ذریعہ کہوائی گئیں حضرت نے ان کی باتوں پر اعتماد کرنے سے پہلے اپنے قلم سے مجھے باضابطہ ایک خط لکھا اور میری رائے معلوم کی کہ اس کی حقیقت کیا ہے خط یہ تھا۔

حضرت المحترم زید مجدکم السامی

سلام مسنون نیاز مقرون، الحمد للہ بعافیت ہوں، امید ہے آپ بھی بعافیت ہوں گے۔ آپ نے تین ماہ کی رخصت حاصل کی ہے جس کا تقریباً ایک تہائی حصہ پورا ہوچکا ہے مجھے اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا ہے کہ رخصت تو ایک ضابطہ کی چیز ہے وہ اپنی جگہ ہے پوچھنا یہ ہے کہ اس رخصت کے بعد حقیقتاً ارادہ واپسی کا ہے یا نہیں؟ اگر ارادہ ہے تو آپ اوسے قطعیت کے ساتھ تحریر فرمادیں لیکن اگر واپسی کا قصد نہ ہو، یا تردد ہو تو عرض یہ کرنا ہے کہ اس منصب کیلئے جس پر کام کر رہے ہیں ایک موزوں شخصیت مل رہی ہے جو اپنی قابلیت اور وجوہ استحقاق کی بنا پر واجب التوجہ ہے۔ اگر آپ کی تشریف آوری نہ ہو تو اون سے بات چیت کیجاوے اسلئے میں چاہتا ہوں کہ ضابطہ سے الگ ہو کر اپنا حقیقی مشاء واضح فرمادیں آنے کی صورت میں آپ بہر حال مقدم ہیں ساتھ یہ بھی کہ اس رخصت کے بعد کوئی رخصت نہ لیں اور وہ منظور بھی نہ ہو سکے گی اس کے ختم پر جو حقیقی ارادہ ہو اوس سے قطعیت کے ساتھ مطلع فرمادیں۔

امید ہے مزاج گرامی بعافیت ہوگا پرسانِ حال حضرات کی خدمت میں سلام مسنون،

والسلام محمد طیب از دیوبند ۱۸ ؍ ۱۱ ؍ ہجری

یہ ایک اجنبی ملازم کے ساتھ ہمدردی اور انصاف کا عالم تھا خط بار بار پڑھیں کہ ایک طرف آپ پر کس قدر دباؤ ہے، دوسری طرف ایک اہل حق کے حق کی کس قدر پاس داری ہے اور آپ کو یہ معلوم ہو کر حیرت ہوگی کہ حضرت والا نے اپنا یہ خط رجسٹرڈ بھجوایا، معمولی ڈاک سے نہیں بھیجا۔

۷ر ذی الحجہ ۱۳۷۸ھ کو خاکسار نے جواب میں لکھا کہ حاضری کا ارادہ ہے وہاں جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ غلط ہے ان شاء اللہ خاکسار دارالعلوم دیوبند واپس آئے گا۔

حضرت والا کو جب میرا یہ جواب موصول ہو گیا تو پھر اس کا جواب بقلم خود تحریر فرمایا وہ مکتوب گرامی بھی پڑھا جائے۔

حضرت المحترم زید مجدکم السامی

سلام مسنون، نیاز مقرون گرامی نامہ نے مشرف فرمایا، سابقہ عریضہ کا مقصد صرف آمد کا متعین کرانا تھا، سو وہ ہو گیا، اب خواہ ابھی آپ تشریف لے آدیں، یا رخصت پوری کر کے آدیں بعض لوگوں نے وثوق سے چونکہ یہ بیان کیا کہ آپ کا ارادہ واپسی کا نہیں ہے اسلئے عریضہ بھیجنے کی ضرورت پیش آئی، سو الحمد للہ بات صاف ہو گئی...... دعا کا مستدعی ہوں۔

السلام محمد طیب از دیوبند ۲۸/۶ ھ

آپ اندازہ لگائیں حضرت اقدس مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی ذمہ داری اور دوسروں کے حقوق کا کتنا لحاظ و پاس تھا، اور اپنے ماتحت کام کرنے والوں کی دلجوئی کس طرح کیا کرتے تھے، حضرت مہتمم صاحب کی بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ سب پر نظر رکھتے تھے کہ کون کیسا ہے اور کیا کر رہا ہے، جفاکش، محنتی کارکن کو بہت پسند فرماتے تھے یہ درست ہے کہ ایک معمولی مفاد پر بہت طبقہ غلط فہموں کا شکار بنانے کی جد وجہد میں بھی مشغول رہتا تھا جیسا کہ ہر بڑے کے ساتھ ہوا کرتا ہے، مگر حضرت اپنی فطری ذہانت اور سالہا سال کے تجربہ کے بعد ان کی باتوں میں عموماً نہیں آتے تھے اور صحیح نتیجہ تک پہونچنے کی سعی فرماتے تھے اور راہ پا بھی لیتے تھے۔

جن دنوں میری چھٹی ختم ہو رہی تھی اس زمانہ میں حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ ۶ر محرم ۱۳۷۹ھ کو افریقہ روانہ ہو گئے روانہ ہوتے ہوئے دفتر کو تاکید فرما گئے کہ یاددہانی کا ایک خط دارالعلوم دیوبند معینہ سانچہ میرے نام بھیجدیا جائے چنانچہ اس وقت کے نائب مہتمم حضرت مولانا مبارک علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے یہ یاددہانی کا خط موصول ہوا۔

محترمی زید مجدکم

بعد سلام مسنون آنکہ آپ کی رخصت قریب الختم ہے۔ لہٰذا آپ کو جلد پہونچ جانا چاہیے۔ حضرت مہتمم صاحب کے گرامی نامہ سے کیفیت واضح ہو چکی ہے کہ اس کی رو سے مزید رخصت کا قصد نہ فرمائیں اس کے لئے حالات مساعد نہیں ہیں لہٰذا آپ کا دارالعلوم میں واپسی کا قصد ہے تو فوراً تشریف لاکر اپنے کام میں لگ

جائیے، تاخیر نہ فرمائیے حضرت مہتمم صاحب ۶ محرم ۱۳۷۹ھ کو افریقہ تشریف لے جا چکے ہیں امید ہے آپ بعافیت ہوں گے۔ والسلام محمد مبارک علی، نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند ۱۳-۱-۰۹ھ

یہ خط بھی بذریعہ رجسٹری بھجوا دیا گیا، مجھے غالباً ۲۳ محرم سے حاضر ہونا تھا بحمد اللہ میں وقت پر دارالعلوم حاضر ہو گیا اور اپنی مفوضہ خدمت انجام دینا شروع کر دی۔

اسی طرح ایک دفعہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند مدلل مکمل پر بحیثیت مرتب نام کا مسئلہ سامنے آیا تو دفتر نے نہ معلوم کس کے مشورہ سے مرا نام حذف کر دیا اور صرف شعبہ ترتیب فتاویٰ لکھا ہوا رہنے دیا جب یہ مسئلہ مرے سامنے آیا میں نے کہا اس میں مرا کوئی نقصان نہیں، ذمہ داری ہلکی ہو جائے گی مگر یہ بات دوسروں تک پہونچی، بعض ممبران شوریٰ نے یہ بات سنی تو ان کو حیرت ہوئی کہ بغیر نام اس کی غلطیوں کی ذمہ داری کس پر ڈالی جائے گی، انھوں نے دفتر اہتمام کو اس طرف توجہ دلائی بالخصوص امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی مدظلہ نے۔

حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ پاکستان تشریف لیجا چکے تھے مولانا عبد الحق صاحب پیشکار نے مجھے بلایا اور کہا یہ صورت ہے آپ مناسب سمجھیں تو ایک خط حضرت مہتمم صاحبؒ کے نام لکھ دیں میں اس کو اپنے خط کے ساتھ پاکستان بھجوا دوں گا۔ حضرت کے خط آجانے کے بعد بات صاف ہو جائے گی چنانچہ میں نے فتاویٰ دارالعلوم کے ٹائیٹل پر مرتب کے نام لکھے جانے کے سلسلہ میں دریافت کیا کہ حضرت کی رائے کیا ہے۔ چنانچہ حضرت والا نے پاکستان سے جواب میں یہ خط لکھا۔

محترمی
زید مجدکم السامی

سلام مسنون، اخلاص مقرون، گرامی نامہ ملا میں آج ہی سرگودھا پہونچا ہوں، پرسوں لائل پور کے لئے روانگی ہے، جولائی کے پہلے ہفتہ میں دیوبند پہونچ جانے کی توقع ہے انشاء اللہ۔

فتاویٰ دارالعلوم کے سلسلہ میں ٹائٹل پر بحیثیت مرتب فتاویٰ آپ کا اسم گرامی آنا، مرے خیال میں قابل اعتراض نہ ہونا چاہئے، بلکہ حق پسندی کا تقاضا یہی ہے کہ یہ نام آنا آپ کا حق ہے، جب کہ اول سے آخر تک محنت آپ کی ہے احقر کی رائے آپ کے گرامی نامہ کے بعد یہی ہے کہ نام کی تصریح ضرور ہونی چاہیئے۔

امید ہے آپ بعافیت ہوں گے دعا کا خواستگار ہوں، حضرت مفتی صاحب اور دوسرے بزرگوں سے بشرط ملاقات دیاد سلام فرما دیں، مولوی عبد الحق صاحب کا خط مل گیا ہے ان کو سلام فرما دیں والسلام

محمد طیب از سرگودھا مدرسہ سراج العلوم
۹ ہ۲ ۸۲ ہجری یوم چہار شنبہ

یہ مکتوب گرامی براہ راست دارالافتاء کے پتہ پر خاکسار کے نام موصول ہوا، میں اسے لیکر نائب مہتمم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا پیشکار اور نائب صاحب نے مشورہ کے بعد سید محبوب رضوی صاحب مرحوم کو بلا کر فرمایا کہ

اس بلاک میں مرتب کے نیچے اور شعبہ ترتیب کے اوپر محمد ظفر الدین کسی کاتب سے ٹرھوادیں چنانچہ اسی طرح فتاویٰ دارالعلوم پر خاکسار کا نام جو خارج کیا جاچکا تھا ٹائٹل پر لکھا گیا اور وہ برابر چلا آرہا ہے اور بحمد اللہ اس وقت تک فتاویٰ کی بارہ جلدیں چھپ کر شائع ہوچکی ہیں اور ہر سال دو تین جلدوں کے نئے اڈیشن چھپتے ہیں اس سال ایران کے ایک عالم نے فتاویٰ دارالعلوم کو فارسی میں منتقل کرانے کی اجازت بھی حاصل کی ہے، خدا کرے یہ کام کر رہے ہوں۔ فتاویٰ پر نام کے قصے کے بعد ہی اسی سال دو چار ماہ بعد نہ معلوم کس وجہ سے یہ حادثہ پیش آیا کہ مجلس شوریٰ نے مجھے دارالافتاء سے کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں منتقل کر دیا، اور میرے فرائض میں کتب خانہ کی نئی ترتیب و تنظیم داخل فرمائی، گویا میری ذمہ داری یہ طے پائی کہ اوقات مدرسہ میں کتبخانہ کی تنظیم و ترتیب کا فریضہ میں ادا کروں اور خارج اوقات میں ترتیب فتاویٰ دارالعلوم کی خدمت انجام دینے کی جدوجہد کروں۔

بحیثیت ملازم شوریٰ کا یہ حکم ماننا تھا۔ آپ کو یہ معلوم ہو کر تعجب ہوگا کہ فتاویٰ کی پہلی جلد کے سوا بقیہ گیارہ جلدیں خارج اوقات کی ہی مرتب کی ہوئی ہیں اور یہ سارا کام حضرت مہتمم صاحب کی سرپرستی میں انجام پایا ہے کوئی شبہ نہیں کہ یہ تبادلہ میرے لئے تکلیف دہ ثابت ہوا، جب تبادلہ کا یہ حکم آیا میں وہ کاغذ لے کر حضرت مہتمم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا حضرت! یہ کیا ہوا؟ فرمانے لگے سو سال سے زیادہ ہوگیا کتب خانہ کی ترتیب و تنظیم نہیں ہوئی ممبران شوریٰ کو بھی اس کی شکایت ہے اور دوسرے اہل علم کو بھی جب کسی کتاب کی ضرورت ہوتی ہے اس کی تلاش میں کئی کئی دن لگ جاتے ہیں اس جگہ کے خواہشمند دوسرے کئی حضرات تھے کہ ان کو وہاں کر دیا جائے مگر ممبران شوریٰ کی رائے متفقہ طور پر آپ کے لئے ہوئی جس میں خود میں بھی داخل ہوں لہٰذا آپ اسے منظور کر کے کام شروع کر دیں، میں نے عرض کیا حضرت یہ تو میرا تنزل ہوگیا، میری تنخواہ ناظم کتب خانہ سے اس وقت زیادہ ہے پھر کتب خانہ میں ترقی کی کوئی منزل نہیں، یہاں میرے لئے ترقی کے مواقع تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ میری باتوں سے متاثر ہوئے اور آپ کے سمجھ میں یہ بات آگئی، تھوڑی دیر خاموش رہے فرمایا دارالعلوم کی علمی خدمت سمجھ کر یہ کام کریں، انشاء اللہ برکت ہوگی، اور میں آئندہ آپ کا خیال رکھوں گا پھر دارالافتاء میں لے آؤں گا، وہاں دو ایک آدمی اور تھے، انھوں نے مذاقاً کہا کہ تم تبلیغی ہو اور ناظم کتب خانہ بھی سیاسی ہیں، دونوں کو یکجا کر دیا گیا ہے میں نے دیکھا کہ یہ سنتے ہی حضرت چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا فرمانے لگے یہ سب بیہودہ باتیں ہیں، پیش نظر دارالعلوم اور اس کی خدمت ہے اور یہی رہنی چاہیے، پھر تھوڑی دیر دارالعلوم کی برکات پر بولتے رہے اور مجھے مطمئن فرماتے رہے اور کہنا چاہیئے حضرت کی تقریر سے میرے دل کا بوجھ بڑی حد تک ہلکا ہوگیا۔

یہاں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذہن و فکر دارالعلوم اور اس کی خدمت کے گرد کام کرتا تھا اور اپنے ملازم کی دلدہی اپنا اہم فریضہ سمجھتے تھے اور جب کوئی خدمت میں حاضر ہوتا تو اس

کو مطمئن کر کے واپس فرماتے تھے۔

ضمنی طور پر یہاں یہ عرض کرنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ گذشتہ مجلس شوریٰ نے از راہ علم پروری مراتب دلہ پورے بیس سال بعد کتب خانہ سے دارالافتاء میں کر دیا اور میں یکم ربیع الاول ۱۴۰۳ھ سے مستقل افتاء کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں موجودہ مہتمم مولانا مرغوب الرحمٰن اور اراکین شوریٰ کا شکریہ مراخوشگوار فریضہ ہے، جزاہم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء

حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے محاسن اخلاق اور اخلاص و مروت کے پیکر تھے، اللہ تعالیٰ نے ساری سادگی کے باوجود بڑا رعب و وقار عطا کر رکھا تھا، بڑے بڑے عظیم المرتبت انسان آپ کے سامنے آکر مرعوب ہو جاتے تھے، جاہ جلال، رعب و دبدبہ، اور شرافت و مروت چہرہ سے عیاں تھی، یہی نہیں کہ وہ عوام کے سامنے بے جھجھک تقریر فرماتے بلکہ علماء کرام اور صوفیاء عظام کے مجمع میں جب بولتے تو اندازہ ہوتا کہ آپ کا مطالعہ کس قدر وسیع تھا، حافظ قرآن اور قاری تو تھے ہی لیکن اسی کے ساتھ ان احادیث کا بڑا ذخیرہ بر زبان تھا، جن کا تعلق عوام و خواص کے اعمال و اخلاق اور عقاید سے ہے۔

دارالعلوم میں جب تقسیم انعام کا جلسہ ہوتا تو عام طور پر حضرت مہتمم صاحب کی معرکۃ الآرا تقریر ہوتی، سارے علیا کے اساتذہ، تمام شعبہ جات کے نظار مفتیان کرام اور پورے دارالعلوم کے طلبہ موجود ہوتے تقریر کا لب و لہجہ بڑا ہی دلنشیں ہوتا علماء جھوم جاتے تھے اور یہ کہا اٹھتے تھے کہ حضرت مہتمم صاحب کو خطاب کا حق ہے، جیسا مجمع ہوتا اور جہاں جس طرح کا موقع ہوتا اسی انداز کا خطاب بھی ہوتا تھا۔

حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحب صدر المدرسین و شیخ الحدیث دارالعلوم کی وفات کے بعد جب سوال پیدا ہوا کہ بخاری شریف کا درس کون دے، تو تمام اساتذہ اور اراکین شوریٰ نے اس خدمت کے لئے حضرت اقدس کا انتخاب کیا، حالانکہ عرصہ سے درس تدریس کا سلسلہ تقریباً بند سا تھا، مگر باوجود حضرت والا نے تین چار ماہ بخاری شریف کا درس دیا اور مجمع کو طلبہ کو پڑھایا۔ کتابی صلاحیت بھی بہت اچھی تھی، چونکہ جوانی میں مستقل یہ خدمت انجام دے چکے تھے۔ اور مشکوٰۃ شریف کا درس اور اسی طرح حجۃ اللہ البالغہ کا درس تقریباً پوری عمر دیتے رہے، آپ کا ذہن ہر وقت حاضر ہوتا تھا، دماغ بیدار پایا تھا اور فکر صحیح اور دور رس حصہ میں آئی تھی، اللہ تعالیٰ پر پورا اعتماد تھا، دارالعلوم کے اہتمام نے اعتماد کو اور پختہ کر دیا تھا جب کوئی یہ بات ذہن نشیں کر دیتا حضرت یہ کام دارالعلوم میں بہت ضروری ہے، اور مفید بھی اگر یہ بات سمجھ میں آگئی فوراً اس پر عمل کرتے کچھ لوگ کہتے حضرت بڑا خرچ ہے روپے کہاں سے آئیں گے فرماتے یہ خدا کا کام ہے مرا کام ابتدا کر دینا ہے تکمیل وہ کرے گا یہ بھی کہتے زندگی کا تجربہ ہے کہ جو کام دارالعلوم کا شروع کر دیا گیا اللہ تعالیٰ نے پورا کر دیا۔ حضرت مہتمم صاحب کے زمانہ میں بحیثیت صدر جمہوریہ پہلے راجندر پرشاد آئے اور پھر علی احمد فخر الدین دونوں ہی حضرات دارالعلوم اور اس کے مہتمم کے اخلاق سے خوش ہو کر گئے اور زندگی

بھر مہتمم صاحبؒ کے مدح خواں رہے، عرب ممالک کے سیکڑوں وفود مختلف مواقع سے آتے رہتے ہیں۔ مہتمم صاحب سے ملکر بیت خوش ہوتے تھے، اللہ تعالیٰ نے آواز میں بڑی کشش دے رکھی تھی، حکیمانہ انداز بیان کا سبھوں پر ہی کم وبیش اثر پڑتا تھا، رجسٹر معائنہ جات سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔

سرکاری مہمانوں سے کبھی کبھی الجھن محسوس فرماتے تھے اور کہا کرتے تھے ہم فقیروں کے یہاں ان بادشاہوں اور ان کے پیروکاروں کا کیا کام، انھیں دیکھکر کبھی مجھے وحشت ہوتی ہے، حکومت کی امداد سے بانی مدرسہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے روک رکھا تھا اس لئے کبھی دارالعلوم نے سرکاری امداد قبول نہیں کی ہندوستان کی آزادی کے بعد مختلف حلقوں سے کہنا چاہیے دباؤ ڈالا گیا کہ اب حکومت سے امداد قبول کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔ لیکن حضرت مہتمم صاحبؒ قبول کرنے سے ہمیشہ گریز اختیار کیا کرتے اور کسی نہ کسی طرح ٹال جاتے فرماتے تھے جب مسلمان دارالعلوم کی ساری ضرورتیں پوری کر دیتے ہیں پھر حکومت وقت کی امداد کیوں قبول کیجائے۔

طبیعت میں غایت درجہ تواضع تھی، کبھی بھی کبر وغرور کا شائبہ نہیں دیکھا گیا، بارہا دیکھا کہ جب دارالعلوم میں تقریر کیلئے کھڑے ہوئے فرمایا کہ آپ کی ہی طرح ایک ادنیٰ طالب علم ہوں بلا دارالعلوم میں تبولیت مجھے حاصل ہے مجھ میں اگر کچھ اچھی بات پائی جاتی ہے وہ اسی کا اور اس کے اکابر کا صدقہ ہے معمولی سے معمولی آدمی سے بھی بڑے تپاک سے ملتے یہ بھی فرماتے تھے کہ میں جہاں جاتا ہوں دارالعلوم میرے ساتھ ہوتا ہے یہ واقعہ ہے کہ دارالعلوم کو بین الاقوامی ادارہ بنانے میں حضرت کا بڑا ہاتھ ہے یورپ، امریکہ، افریقہ اور عرب ممالک جہاں تشریف لے گئے اولاً تذکرہ دارالعلوم کا فرمایا، دارالعلوم آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا، آپ دارالعلوم کے نشان بن گئے تھے جہاں دارالعلوم کا نام آتا ساتھ ہی آپ کا نام آتا اور جہاں آپ کا نام آتا دارالعلوم نام آتا دونوں نام لازم ملزوم سے ہو گئے تھے،

اللہ تعالیٰ نے زبان میں بڑی تاثیر دے رکھی تھی، جو بات کہتے ایسا معلوم ہوتا کہ دل میں اتر گئی، یہی وجہ ہے کہ سیکڑوں بدعتی خاندان دیوبندی المسلک ہو گئے اور بدعات وخرافات سے توبہ کی پھر علماء دیوبند کے گرویدہ ہو گئے جو فرماتے مثبت انداز میں فرماتے، مناظرہ اور بحث ومباحثہ کی عادت نہیں تھی، برا تو اپنے دشمن تک کو نہیں کہتے تھے، ذہن وفکر تعمیری تھا، تخریب سے ذرا بھی لگاؤ نہیں رکھتے تھے، تخریب کاروں سے متنفر اور دور رہنا پسند کرتے تھے۔

تصوف میں پہلے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن عثمانی، پھر محدث کبیر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری اور اخیر میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے وابستہ ہوئے، اور خرقہ خلافت اسی دربار سے عطا ہوئی، حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی نسبت کی وجہ سے سارے بزرگ آپ سے خصوصی تعلق رکھتے تھے، اور آپ کی طرف متوجہ رہتے تھے جو ذاتی اوصاف وکمالات کے بھی آپ مالک تھے، علم وفضل چہرہ مہرہ سے ظاہر ہوتا تھا۔ ارشاد وبیعت کا شغلہ بھی تھا مگر پہلے دارالعلوم پھر کچھ اور، کھلے عام ارشاد وبیعت کا مشغلہ نہ تھا اگر کسی نے اصرار کیا تو بیعت فرما لیا، اس معاملہ میں

طبیعت میں بے نیازی کی شان تھی یہی وجہ ہے کہ آپ کے مسترشدین میں خواص زیادہ ہیں اور وہ بھی اہل علم اور سنجیدہ ومتین، خاموش مزاج لڑنے جھگڑنے سے گریزاں اور اپنے کام سے کام رکھنے والے، پھر بھی ملک اور بیرون ملک میں آپ کے فیض یافتوں کی کافی تعداد ہے، اس راستہ سے بھی ایک بڑے طبقہ نے آپ سے فائدہ اٹھایا، ایک گرامی نامہ میں لکھتے ہیں۔

محترمی ومکرمی

زید مجدکم

سلام مسنون، نیاز مقرون، گرامی نامہ نے مشرف فرمایا، میں اپنی عدیم الفرصتی کے بارہ میں کیا عرض کروں، چار پانچسو آدمیوں سے سابقہ روزآنہ تعلیم وتلقین اور تقریری کارات ودن کے مختلف حصوں میں رہتا ہے،

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وابستہ لوگوں کی تعداد کم ہونے کے باوجود خاصی ہوا کرتی تھی، لیکن یہ سب خدمت خاموشی کے ساتھ انجام پائی تھی، کیونکہ نہ کوئی مہمان خانہ تھا، نہ خانقاہ تھی، نہ مریدین کا سال کے کسی حصہ میں کہیں اجتماع ہوتا تھا، جب کبھی حضرت کی سوانح مرتب ہوگی تو ممکن ہے اس میں اس کی کچھ تفصیل آئے۔

بڑی خوبی یہ تھی کہ مہتمم صاحب قدس سرہ صاف باطن تھے، قلب میں کہیں کھوٹ نہیں تھا، جس سے جتنا تعلق ہوتا، اس کا لحاظ وپاس تھا، اور موقع پاکر اس کا اظہار بھی فرمادیا کرتے تھے، ایکدفعہ پاکستان تشریف لے گئے، اور قیام لمبا ہوگیا، تو دیوبند سے مختلف لوگوں نے لکھا کہ حضرت والا کا بعد بری طرح محسوس ہو رہا ہے جلد تشریف لے آئیں، اسی زمانہ میں خاکسار کے اس طرح کے ایک خط کے جواب میں تحریر فرمایا۔

سلام مسنون، نیاز مقرون، گرامی نامہ باعث شرف وانبساط ہوا، نامۂ محبت نے دل میں یاد ومحبت میں تموج پیدا کردیا، یہ محبت مٹنے کی چیز ہے نہ مٹائی جاسکتی ہے، انشاء اللہ یہ یاد آخرت تک ساتھ جانیوالی ہے۔ اس لئے باقی ہے اور باقی رہے گی، یہاں کے عزیزوں اور دوستوں نے ڈیڑھ ختم اکتوبر تک بڑھوایا ہوا ہے اور اسی کے تحت پروگرام ہیں، جلسوں کے سلسلہ کی بات آپ جانتے ہیں کہ جلسے والے سب کچھ گوارہ کرلیتے ہیں، لیکن پروگرام کے بارہ میں جان لڑادیتے ہیں، میرٹھ، بمبئی وغیرہ میں بارہا اس کی نوبت آئی کہ مجھے بخار شدت کا چڑھا ہوا ہے لیکن جلسے والوں نے اپنی بدنامی کے تصور پر دوسرے کے آرام کو نثار کردیا، اس لئے یہ پروگرام بہرصورت پورے کرنے پر مجبور ہوگیا ہوں، آپ حضرات کی یاد دل میں کتنی ہے؟ الفاظ میں لانے کی چیز نہیں،

ایسی ہی یادیں کچھ ادھر بھی ابھری ہوئی ہیں وتلک لوذعی من العمقت العجیب یہاں سب اعزہ بعافیت ہیں، ملنے کے لئے دوسرے شہروں سے بھی لوگ آتے رہتے ہیں، وہاں سب پرسان حال حضرات کی خدمات میں سلام مسنون پہونچا دیا جائے والسلام محمد طیب، از کراچی ۱۸ ناظم آباد ۲ مکان زاہد قاسمی ۲-۷-۶۸ء

حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ میں جہاں بے انتہاء مروت تھی وہیں بے پناہ شفقت ومحبت کا بھی جذبہ تھا اپنے چھوٹوں پر مہربان تھے، جب میں پہلے سال دارالعلوم میں آیا، تو مجھ سے جو کام متعلق تھا، وہ تصنیف وتالیف کا تھا "جماعت اسلامی کے دینی رجحانات" مری پہلی کتاب تھی جو دارالعلوم دیوبند سے شائع ہوئی رمضان قریب آیا تو

زندگی بھر کی عادت رمضان گھر گذارنے کی تھی، یہاں معلوم ہوا کہ شعبہ جات دیگر کو رمضان کی چھٹی نہیں ملتی ہے، میں نے خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ رمضان گذارنے کی اجازت وطن میں دیدیں فرمایا ضابطہ میں آپ کے شعبہ کی چھٹی نہیں ہے، میں نے کہا پھر کیا ہوگا میری اداسی دیکھکر فرمانے لگے، تصنیف وتالیف کا کام آپ گھر بھی تو کر سکتے ہیں، میں نے جواب دیا ضرور کر سکتا ہوں گا اس کے بغیر تو وقت ہی نہیں گذرے گا فرمانے لگے اچھا پھر پنسل لیکر کچھ لکھنے لگے وہ کاغذ میری طرف بڑھا کر فرمایا اس مضمون کی درخواست لکھکر پیش کریں میں نے وہ کاغذ لیا وہ باضابطہ درخواست کا مضمون تھا اسے نقل کر کے پیش کار صاحب کے حوالہ کر دیا دوسرے دن پیش کار صاحب نے بتایا کہ آپ کی درخواست منظور ہو گئی ہے۔ جب بھی یہ واقعہ یاد آتا ہے حضرت والا کی شفقت بیتاب کر دیتی ہے، کیا آدمی تھے، واقعی فرشتہ خصلت اور معصوم کردار کے مالک تھے، کبھی کسی معمولی سے معمولی انسان کا بھی دل توڑنا پسند نہیں کیا، انشاء اللہ برزخ و آخرت میں حضرت کی بھی دلجوئی و دلداری ہوگی اور اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ایسی شفقت و محبت کا معاملہ کریں گے جیسی اس کی رافت و رحمت کی شان ہے۔

اخیر بیماری میں دیکھا کہ غم و الم نے خون نچوڑ لیا تھا، ذہنی و فکری اذیت نے نڈھال کر دیا تھا، مگر جب بھی کوئی ملنے حاضر ہوتا چہرہ پر وہی بشاشت ہوتی اور مسکراتے ہوئے مزاج پوچھتے، ڈیڑھ ماہ اس طرح گذرا کہ کھانا بالکل نہیں کھایا مگر چہرہ کی رونق میں کوئی فرق نہیں دیکھا گیا، گفتگو کا وہی انداز رہا جو پہلے تھا، جب قلم لیکر بیٹھتے تو اس کمزوری میں بھی گھنٹوں لکھتے چلے جاتے گفتگو ہمیشہ علمی دینی فرماتے تھے۔

ایک بار فرمانے لگے ایک حدیث ہے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تجلی رکھی ”یبیع کنز بین کتفی حتی وجدت بردا نا ملہ بین ثدیی“ ——— یہ حدیث کہیں آئی ہے کہا ہے؟ میں نے عرض کیا حضرت یہ حدیث مشکوٰۃ شریف میں بھی آئی ہے فرمانے لگے اسے نقل کر کے حوالہ بھیجدیں اسکی ضرورت ہے میں سوچ رہا کہ اتنے دنوں بیمار ہیں کھانا بند کر رکھا ہے خود سے اٹھ بیٹھ نہیں سکتے مگر علم کیسا تھ یہ وابستگی ہے چنانچہ میں نے وہ حدیث نقل کر کے حضرت کے پاس بھیجدی۔ اس لمبی بیماری میں مجھے یاد نہیں کہ خود سے کبھی بیماری یا کمزوری کا شکوہ زبان پر آیا ہو گفتگو ہوتی تو یا کوئی علمی مسئلہ بیان کرتے یا دار العلوم کی تعلیم کے متعلق پوچھتے کہ تعلیم ہو رہی ہے؟ جواب عرض کیا جاتا حضرت تعلیم جاری ہے فرماتے الحمد للہ مقصد تعلیم و تربیت ہی ہے اکابر واسلاف کا جو مسلک و مشرب ہے اس میں فرق نہیں آنے دینا چاہیئے۔

کبھی کبھی بڑی حسرت کیساتھ فرماتے کہ اپنی جماعت میں پھوٹ پڑ گئی اسے ختم ہونا چاہیئے یہ بھی ایک دن فرمایا کہ اختلاف ظاہر ہونے کے بعد تقریر میں نے تقریباً بند کر دی اشرم معلوم ہوتی ہے کہ ان حالات میں دوسرے کو خطاب کروں جب اپنے گھر میں اختلاف جاری ہے ذہن و فکر ہمیشہ بیدار رہا، ایک لمحہ کیلئے بھی غفلت پا یا گیا موت بھی ایسی ہوئی کہ کسی کو خبر نہیں ہوئی، بات بات کرتے کرتے، ذرا سا سانس تیز ہوئی ایک دو منٹ میں اعلیٰ علیین روح پہونچ گئی جنازہ میں اتنا بڑا مجمع ہوا کہ بوڑھے تک یہ کہتے نہیں تھکتے کہ آج سے پہلے کسی جنازہ میں اتنے آدمی نہیں دیکھے گئے اور نہ کبھی دیوبند میں اتنے بڑے مجمع کا تصور ہو سکتا تھا۔

قاری صاحبؒ کا ذوقِ شعر گوئی

مولانا ابوالقاسم صاحب نعمانی بنارس

شاعری اظہار مافی الضمیر اور ترسیل و ابلاغ کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ شعر کی اثر آفرینی اور کارفرمائی کا مشاہدہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ خواہ بزم نوحہ و ماتم کی نوا سنجی ہو یا محفل عیش و نشاط کی زمزمہ خوانی، معرکۂ کارزار کی رزمیہ شاعری ہو یا دربارِ سلاطین کی قصیدہ نگاری۔ ہر موقع ہر شاعری کی ساحرانہ توتوں نے اپنا لوہا منوایا ہے ہر کلام کی طرح شعر بھی اپنے مضامین اور مشمولات کے اعتبار سے خیر اور شر کے زمروں میں تقسیم ہوتا ہے۔ اسی کو زبانِ رسالت نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ الشعر کلام حسنہ حسن و قبحہ قبح یعنی شعر بھی ایک کلام ہے اچھا ہے تو اچھا اور برا ہے تو برا۔ اگر ایک طرف قرآن پاک نے الشعراء یتبعھم الغاوٗن۔ الم تر انھم فی کل واد یھیمون وانھم یقولون ما لا یفعلون۔ کہہ کر شعرا کے بارے میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ یہ صرف خیالی گھوڑے دوڑانے والے اور گفتار کے غازی ہیں۔ ان کی گفتار اور کردار میں یکسانیت نہیں ہے تو دوسری طرف رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان من الشعر حکمۃ کی سند دیکر اچھے اشعار کو ایک مقام عطا فرما دیا ہے۔ شاعرِ رسولؐ حضرت حسان بن ثابت، حضرت علی بن طالب، اور حضرت عبداللہ بن رواحہ کی پاکیزہ شاعری نے اسلامی علوم و معارف کے اندر اپنا ایک منفرد مقام بنایا ہے۔ مولانا روم کی مثنوی، شیخ سعدی کے اخلاقی منظومات، شیخ فریدالدین عطار کا پندنامہ آج بھی وعظ و تذکیر میں اپنا خاص اثر رکھتا ہے۔ مولانا حالی کی مسدس، علامہ اقبال کا شکوہ جواب شکوہ اور مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی سیدھی سادھی نظمیں اپنا خاص اثر رکھتی ہیں۔ ملک کی آزادی میں انقلابی نظموں اور حریت پسندانہ ترانوں نے جو کردار ادا کیا ہے اس کا اعتراف ہر انصاف پسند کو ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہندوستان میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور تجدید دین کے لئے ــــــــ علماء دیوبند کا انتخاب فرمایا تو ان کو علوم اسلامیہ کی گیرائی و گہرائی اور ملکۂ تقریر و تحریر کے ساتھ شعر گوئی کی بھرپور صلاحیت سے بھی نوازا۔ سرخیل جماعت دیوبند حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی۔ قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتویؒ۔ فقیہ الامت مولانا رشید احمد گنگوہی، سراج الملت مولانا سراج احمد رشیدی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب، استاذ العلماء حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی سے لیکر محدثِ عصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری۔ شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب دیوبندی علیہ الرحمۃ والرضوان تک ہیں۔ نادر الکلام، پاکیزہ شعری ذوق کے ماہرین کا ایک تسلسل ملتا ہے۔ مذکورہ بزرگوں نے شعر گوئی کو کبھی مشغلہ نہیں بنایا لیکن جس نے شعری زبان جب بھی لکھا اور جو بھی لکھا وہ اپنی جگہ شاہکار ہے۔

ان بزرگوں کی عربی فارسی اور اردو شاعری فن شعر گوئی کے لئے سرمایۂ افتخار ہے

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ قاسمی بھی جہاں ایک بلند پایہ خطیب اور منفرد انداز نگارش کے حامل وسیع النظر مصنف تھے وہیں ایک قادر الکلام اور زود گو شاعر بھی تھے۔ اگرچہ خطابت اور تحریر کی طرح ان کے اس وصف کو شہرتِ عامہ حاصل نہ تھی۔

حضرت قاری صاحبؒ نے عربی، فارسی، اور اردو تینوں زبانوں میں طبع آزمائی کی ہے۔

ان کے کلام کا بیشتر حصہ عرفان عارف کے نام سے ان کے منجھلے صاحبزادے مولانا محمد اسلم رمزی کی ترتیب و تزئین کے ساتھ مکتبہ قاسمی دیوبند سے شائع ہو چکا ہے۔ اس میں آنکھ کی کہانی کے دونوں حصے بھی شامل ہیں اور حضرت قاری صاحبؒ کا شعری کلام ساز امکانی بھی شامل ہے جو جمادی الاول ۱۳۳۵ھ کا ماہنامہ "القاسم" دیوبند میں شائع ہوا تھا۔ یہ حضرت قاری صاحبؒ کی عمر کا وہ دور تھا جب وہ صاحبزادہ محمد طیب سلمۂ کہے جاتے تھے۔ اس نظم کے مضامین اور انداز نگارش سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ شعر گوئی کا جوہر ان کے اندر عنفوانِ شباب ہی سے تھا۔

یہ مجموعۂ کلام ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا ہے اس لئے اس میں ۱۹۶۷ء تک کا ہی کلام درج ہے۔ آپ کے مجموعۂ کلام میں ہم کو حمدِ الٰہی، نعتِ رسالت، سپاس و تشکر، استقبالیہ نظمیں، مرثیے، تہنیت، اور مختلف علمی موضوعات پر مختصر اور طویل نظمیں ملتی ہیں۔ ساتھ ہی بعض نظمیں فکاہیات سے متعلق ہیں لیکن کوئی کلام بعنوانِ غزل نہیں ملتا اس کی وجہ ان کے مجموعۂ کلام کے مرتب اور ناشر مولانا محمد اسلم صاحب رمزی کے الفاظ میں درج ذیل ہے۔

"آپ کی شاعری شعر گوئی کے بجائے واقعات و حادثات کی ذہنی تاثر، حقیقی جذبات اور تبادر ذہنی پر مبنی ہے ان تمام نظموں کے محرکات جماعت دیوبند یا اپنے خاندان میں پیش آنیوالے اہم واقعات و تقریبات یا حادثات ہیں جن سے متاثر ہو کر جذبات نے جامۂ شعر اختیار کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تمام اشعار میں تصنع اور پرکاری کے بجائے سادگی و سلاست اور خلوص و جذبات ہے۔ یہی ان اشعار کی سب سے بڑی خصوصیت اور دلکشی ہے اور یہی بنیاد حضرت مدظلہٗ کی صنفِ غزل سے عدم دلچسپی کی ہے جس کی تعمیر محض نزاکت تخیل اور ندرتِ اظہار و بیان پر ہے۔ واقعات و حوادث سے متاثر ہو کر سادگی کے ساتھ اپنے جذبات کی عکاسی میں حضرت مدظلہٗ کا کلام نزاکت تخیل کے بجائے متصوفانہ رنگ سے رنگین ہے جس نے عرفان عارف کے بجائے معنوی لحاظ سے بھی اس کا صحیح تر مصداق بنا دیا ہے۔ (پیش لفظ عرفانِ عارف)

صنفِ غزل سے عدم دلچسپی کے باوجود آپ کو اس صنف میں بھی دستگاہ حاصل تھی۔ اس کا اندازہ آپ کے متعدد قصائد کے ابتدائی تشبیبی اشعار سے ہوتا ہے۔

مثلاً اپنے والد ماجد مولانا محمد احمد صاحب مہتمم خاص دارالعلوم دیوبند کی حیدرآباد سے واپسی کے موقعہ پر سپاس تہنیت واختصاص کے نام سے جو نظم لکھی ہے اس کے ابتدائی اشعار یوں ہیں۔

آج میں بزم تصور میں جو فانوسِ خیال | کرکے روشن ہوا نظارگیٔ شاہدِ حال !
دیکھتا کیا ہوں کہ آئینہ خانہ بر انداز چمن | ہمہ تن ناز وکرشمہ ہمہ تن غنج ودلال
زلف اس کی وہ بلا جس سے خطا ہو نادم | چال اس کی وہ غضب جس سے ہوں فتنے پامال
ناز و انداز اس انداز کے جن کا انداز | ہندسے کی بھی ہو میزانِ تصور میں محال
بانکپن وہ کہ کرے کبک دری کو حیران | غمزہ ایسا کہ کرے نرگسِ رعنا کو نڈھال
میں نے جس وقت یہ رنگ اس کا نرالا دیکھا | پوچھا کیا طرز ہے یہ آج تیری حورِ شمال
ہیں ادائیں تری کیوں آج سراسر رنگیں | کیوں انوکھے ہیں ترے ڈھنگ نئی ہے کیوں چال
کس لئے آج پریشاں نہیں زلفیں تیری | آج طرہ کے نہیں تیرے شکستہ کیوں بال
تیری قامت سے ہے کیوں آج ٹپکتی شوخی | چال سے آج لرزتا ہے تری کیوں بھونچال
گلشنِ حسن ہے کیوں آج سراسر دلکش | کس لئے آج ہے دلچسپ گلستانِ جمال
سن کے یہ بات کہا اس نے چڑھا کر چتون | دعویٰ فہم وخرد اور جہالت کا یہ حال
کر بہارِ چمنِ دیں کا نظارہ تو ذرا | تاکہ باقی نہ رہے ایس تجھے کچھ اشکال

غزل کے لئے ندرت، اظہارِ بیان، نزاکتِ خیال، اور دلنشیں استعارات وتشبیہات کی جو جو ترکیبیں مطلوب ہیں وہ ہیں ان تشبیبی اشعار میں ملتی ہیں لیکن تشبیب کے بعد جب اصل مضمون کی طرف گریز ہوتا ہے تو اس میں حضرت قاری صاحب کی طبعی نکتہ آفرینی اور دقیقہ سنجی اس طرح نمایاں ہو جاتی ہے کہ واقعتہً وہ ایک عارف کا کلام محسوس ہوتا ہے۔

قاری صاحب کے کلام میں سب سے طویل اور مسلسل نظم آنکھ کی کہانی ہے۔ یہ نظم دو حصوں پر مشتمل ہے پہلی نظم دائیں آنکھ کے آپریشن کے موقعہ پر جنوری ۱۹۶۳ء میں آئی گاندھی اسپتال علیگڈھ میں بسترِ علالت پر دراز رہتے ہوئے املا کرائی۔ یہ نظم تقریباً ڈھائی سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اور دوسری نظم دوسری آنکھ کے آپریشن کے بعد دسمبر ۱۹۶۴ء میں اس عالم میں نظم کی گئی جو پہلی نظم سے بہت طویل ہے۔ دونوں نظمیں تقریباً سات سو اشعار پر مشتمل ہیں اور آنکھ کی کہانی کے نام سے علٰحدہ کتاب کی شکل میں شائع بھی ہو چکی ہیں۔ کہنے کو تو یہ آنکھ کی کہانی ہے لیکن اپنے مشمولات کے لحاظ سے بلند پایہ علمی اور عرفانی مضامین پر مشتمل ہیں جن کا اندازہ نظم کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ کمال یہ ہے کہ پوری نظم میں ایک ہی قافیہ بندی کی گئی ہے۔

اس نظم پر ہندوستان کے مشہور صاحب طرز ادیب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے اپنے مکتوب میں جن تاثرات کا اظہار فرمایا ہے: "قاری صاحب کے ملکۂ شعرگوئی کے لئے سند کا مقام رکھتی

ہیں۔ موصوف اپنے خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

حضرت محترم! السلام علیکم

"آنکھ کی کہانی" آں محترم کا عطیہ یہاں آتے ہی پڑھ ڈالی۔ سبحان اللہ، ماشاء اللہ مجھے علم نہ تھا کہ آپ کو شعر و نظم پر بھی اس درجہ قدرت حاصل ہے۔ ذالک فضل اللہ

کیا کیا قافیے نکالے ہیں کیسا کیسا مضمون باندھا ہے کہ پیشہ ور شاعروں کے بھی چھکے چھوٹ جائیں۔ نہ اتنی طویل نظم میں کہیں آورد۔ بس آمد ہی آمد۔ خوش دماغ تو بحیثیت ایک سچے قاسم نادہ کے آپ تھے ہی۔ اب معلوم ہوا کہ خوش فکر بھی اسی درجہ میں ہیں (ماشاء اللہ)

دعاگو و دعاجو

عبدالماجد ۱۵ر دسمبر ۱۹۶۴ء

اردو کی طرح آپ کو فارسی کلام میں بھی کامل دستگاہ حاصل تھی۔ آپ کے مجموعۂ کلام میں متعدد فارسی نظمیں اور متفرق اشعار موجود ہیں۔ ان کی نظم "خروش جگر" کا پہلا بند جو درج ذیل ہے فارسی کلام کا ایک بہترین نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ یہ نظم حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری کی وفات پر لکھی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

سراپا سوزشِ عشقم، سراپا چشم گریانم
طلاطمہائے بے پایاں ببیں در موج طوفانم
نہ امیدے بدل دارم بہ فیض ناامیدیہا
نہ حرماں آرزو دارم کہ خود تصویرِ حرمانم
ز ہستی صورتے دارم ہیولائش عدم باشد
بسوز برق تکوینم ز برقِ سوز امکانم!!
کجا دل چوں ز دل ارمانِ دل از دیر بیروں شد
شہ عبدالرحیم رائے پوری بود ارمانم
نہ تنہا رفت آں جانِ جہاں از عالمِ خاکی
رواں شد از پس او حسرت و امید و ارمانم
بہ بیں در بے سر و سامانی من صورتِ ساماں
فغان و گریہ و سوز و گداز و آہ سامانم
بمرآۃ دلم تصویرِ جاناں جلوہ آرا شد
ببیں اعجازِ الفت در دلِ آخر مسیحا شد

اسی طرح فکرِ حزیں کے عنوان سے جو فارسی نظم کہی گئی اس میں دار العلوم دیوبند اور بانیانِ دار العلوم کے بارے میں فرماتے ہیں۔

ہمیں گلشن کنوں کو رشکِ ہند است	ہمیں دار العلوم دیوبند است
برغانِ چمن فضلش ہویدا	چمن اندر چمن یارانش پیدا
بہر ہر مرغ می گوید کہ اُعطی!	فانی قاسمٌ واللّٰہُ یُعطی!!
باہ ہند آمد صنوعِ ایں مہر!	براعدائے چنیں مہرے شود قہر!
بارضِ ہند بیشک آں فلک است	بچشمِ ہند انانش ملک است
بذاتِ بانیس رحمت بیاری	بہ قربِ رحمتِ جانش در آری!
بہر سو دینِ برحق زاں علم شد	حکایتہائے کفر و شرک کم شد
جہاد کردہ دیں را فزودہ	کہ شرک و کفر را عالم ربودہ
ہم ایمان و دیں از بس رسیدند	ز نورش کفر و بے دینی رمیدند
محمد قاسم الخیرات ذی شان	گرفتہ دینِ برحق رونقے زاں

اس نظم کے آخر میں دعائیہ اشعار کے ذیل میں فرماتے ہیں۔

خداوندا بایں مردانِ میدان	کنی انجام من بر خیر واحسان
بکامِ نفسِ خود مشغول ہستم	زیادہ ذگر تو معزول ہستم
زمانہ شد بعیش و کامرانی	ندارم ہیچ زادِ جاودانی
نصیحت گوش کن اے نفسِ دوں کیش	حذر کن بنگر اندر رہ پس و پیش
بیا بشنو کہ دنیا بے ثبات است	جہانے دیگر از بہرِ حیات است
بسا کس اندریں رہ پا نہادہ	باٰخر سر نہادہ یا نہادہ
نگہ کن بر ستانِ آسمانی جاہ	نہ بردند از جہاں جز حسرت و آہ

آپ کے فارسی کلام میں نظم "ہست و نیست" بھی ایک شاہکار نظم ہے جس میں ہر شعر کے آخر میں ہست و نیست کو جمع کر کے جمع بین الاضداد کا ایک حسین مرقع پیش کیا ہے۔

عربی کلام پر بھی آپ کو پوری قدرت حاصل تھی۔ آپ کے مجموعۂ کلام میں عربی نظم نونیۃ الاحاد ایک بہترین نظم ہے جس میں امت کے تمام ممتاز مشاہیر کو جو کسی نہ کسی فن یا صنعت میں یکتا گذرے ہیں جمع کر دئیے گئے ہیں۔ یہ نظم ۱۶۸ اشعار پر مشتمل ہے۔

احادِ امت کا یہ تذکرہ دراصل علامہ جلال الدین سیوطی کی تحریر سے ماخوذ ہے۔ علامہ سیوطی نے علامہ ذہبی کی ایک تحریر سے لیکر اپنی مشہور زمانہ کتاب تاریخ الخلفاء میں درج کیا ہے۔

اس نظم کے علاوہ قاسم العلوم والخیرات کے عنوان سے جو عربی نظم کہی گئی ہے وہ بھی قدیم عربی ادب کی یاد دلادیتی ہے پڑھیے اور لطف لیجئے۔

نفسی الفداء لقاسم الخیرات — ومهجتی افدی لبدر البرکات
فیضانه بالعلم عم عجم بحاره — ما داره عند الله فی الحسنات
اولی الاعاظم رتبة وکرامة — اعلی الاماجد قامع البدعات
سباق غایات المکارم فی الحیا — مؤید من رافع الدرجات
شمس السما کالطود العالی زین الهدیٰ — کهف الوریٰ بکرامة الدرجاتِ
شیخ الائمة مقتدی الاعلام — صدر الاجلة قبلة الحاجات
سلطان اصحابُ الحقائق بالعلیٰ — آیاته فی الکون فی الآیات

ضیافتِ طبع کے لئے آپ کی فکاہیہ عربی نظم کے متفرق اشعار بھی ذیل میں درج کئے جا رہے ہیں یہ اشعار دراصل علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ایک فکاہیہ مصرع کی تضمین ہیں۔ شاہ صاحب کا مصرع تھا۔

شربت شراب الشهد والشیخ جوکس

اس کا قافیہ ہندی ہے بقیہ الفاظ عربی۔ قاری صاحب نے بھی اسی قافیہ بندی کی رعایت میں نظم کہی ہے پوری نظم بہت دلچسپ ہے۔ اس نظم میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں

الا یا صدیقی اترك الدهر کله
فان متاع الدهر لغو و لوکس
الا انما الدنیا قلیل متاعها
ولو جبت ایران و توران ونادس
وما هی الا زینة ذات کدرة
وقشر بلا لب و نصب و لارس
وما هی الا حسرة او ندامة
وان ضاء وجه الارض لندن و پیرس
فلا تسوی الدنیا جناح بعوضة
ومن لم یشفها معنا فهو بے حس

یہ آپ کے شعری کلام کے کچھ حصوں کا ایک سرسری جائزہ ہے جس سے آپ کے ملکۂ شعر گوئی کی کچھ جھلک ملتی ہے۔ کلام کے شائقین کو آپ کی کتاب ”عرفانِ عارف“ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

حضرت قاری صاحبؒ

مولانا قاضی محمد اطہر مبارکپوری

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ علم و فضل، ارشاد و تبلیغ، اخلاق و عادات، درس و تدریس، حلم و صبر، نظم و ضبط، تصنیف و تالیف، حکمت و موعظت، تقویٰ و طہارت، اور دیگر علمی و دینی ذاتی اوصاف و کمالات میں اپنے دور کے فرد واحد تھے۔ عوام و خواص میں مقبولیت و محبوبیت اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے جو مستحقین ہی کو ملتا ہے۔ حضرت قاری صاحب اپنے اوصاف جمیلہ کی وجہ سے اس فضلِ خداوندی کے بہترین مستحق تھے پورے عالم اسلام میں ان کو جو مقبولیت و محبوبیت حاصل تھی اس میں ان کے معاصرین میں کوئی شریک و سہیم نہیں ہے حدیہ ہے کہ ان کے مخالفین بھی ان کے ادب و احترام میں بخل نہیں کرتے تھے۔

وہ علمائے دیوبند کے اصلاحی و علمی و دینی تحریک کے سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی تھے بلکہ اس حلقہ کے آخری ترجمان تھے ان پر اس جماعت کا ایک دور ختم ہوگیا اور اس کی جملہ خصوصیات اب کسی ایک ذات میں باقی نہیں رہیں۔

حضرت قاری صاحب کی عام خدمات اور ان کے ثمرات سے صرفِ نظر کر کے اگر صرف دارالعلوم دیوبند کی کم و بیش ۵۰ سالہ خدمات ہی سامنے رکھی جائے تو دینی و علمی خدمت کا ایک طویل سلسلہ نظر آئے گا جس کے نتیجہ میں دارالعلوم واقعی ازہر ہند بن گیا اور مسلمانانِ عالم کی قدیم و مشہور درسگاہوں جامع زیتونہ، جامع قرویین، جامعہ ازہر، وغیرہ میں اس کا بھی شمار ہونے لگا۔ انھوں نے "مدرسہ عربیہ دیوبند" کو زندگی کا مقصد قرار دیکر دارالعلوم واقعی معنیٰ میں بنایا۔ ان کا یہ کارنامہ علمی دنیا میں عظیم کارنامہ ہے جو ان کی عظمت کے لئے کافی ہے۔

حضرت قاری صاحب کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور بہت کچھ لکھنا باقی ہے مجھے اس وقت دو ایک واقعہ بیان کرنا ہے۔ میری ان کی آخری ملاقات فتنہ کے عین شباب میں بمبئی میں حضرت قاری صاحب کے خادمِ خاص ماسٹر چودھری عزیز الحق صاحب آسامی کے مکان پر ہوئی اس زمانہ میں حضرت قاری صاحب افکار و صدمات کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ نقاہت و ناتوانی کے ساتھ شدت کا بخار تھا۔ اس وقت ان سے ملنا جلنا ایسے بھی مناسب نہیں تھا۔ پھر اس دورِ ابتلا و فتن میں ان سے ملنا اپنے کو مشتبہ کرنا تھا۔ میرے دل و دماغ پر برادرِ عزیز قاضی حیات النبی متوفی جمعہ ۲۰ رصفر ۱۴۰۲ھ رحمۃ اللہ علیہ کی جدائی کا بے حد اثر تھا اور میں نیم دیوانگی کے عالم میں اپنے بزرگ سے ملکر مرحوم کے حق میں دعائے مغفرت کی درخواست کر کے تسلی کے کلمات سننا تھا جس سے میرا غم ہلکا ہوتا تھا چنانچہ اسی لئے میں حضرت قاری صاحبؒ کی خدمت میں بھی پہنچا اور اپنی بات کہہ کر دعائے

مغفرت کی درخواست کی۔ حضرت قاری صاحب اپنی وضع کے مطابق نہایت خلوص سے اٹھ کر بیٹھے اور دیر تک دعا کرنے کے بعد تسلی دیتے رہے۔ قرآن و حدیث اور بزرگوں کے واقعات بیان کرتے رہے۔ میں ان کا حالِ زار دیکھ کر بار بار اٹھنا چاہتا تھا مگر وہ ہر بار مجھے بٹھاتے تھے آخر کار مجھے ان کی محبت اور اپنی عقیدت دونوں پر جبر کرنا پڑا۔

کہا جاتا ہے کہ آدمی کا اصل روپ سفر میں کھلتا ہے۔ ایک مرتبہ مجھے حضرت قاری صاحب کی معیت و صحبت دو دنوں تک پونہ کے سفر میں حاصل رہی۔ ان کے حلقۂ ارادت سے میرا بھی دینی و علمی تعلق تھا میرے دوست اور قاری صاحب کے بے تکلف خادم جناب سجاد حسین صدیقی نے میری کتاب "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں" حضرت قاری صاحب کو سفر میں وقت گذاری کیلئے دیدی تھی۔

ہمارے کئی بزرگ اپنے حلقۂ ارادت و مشیخت میں دوسروں کی پذیرائی اور موجودگی کو اپنے حق میں مضر سمجھتے ہیں اور ڈرتے ہیں کہ ان کی وجہ سے کہیں ہمارے حلقہ میں دراڑ نہ پڑ جائے اس لئے وہ ہر وقت اسی فکر میں رہ کر اپنے خوردوں سے ایک گونہ بے اعتنائی برتتے ہیں اور کوئی ایسی بات نہیں کرتے جس سے خورد نوازی ظاہر ہو مگر حضرت قاری صاحب کے اپنے ذہن و مزاج اور اخلاق کے اعتبار سے اتنا بلند تھے کہ خورد نوازی کو اپنے لئے مضر نہیں سمجھتے تھے اور ان کے ساتھ بڑے انبساط و انشراح سے پیش آتے تھے حتیٰ کہ بعض اوقات ان کے اخلاق کریمانہ سے شرم محسوس ہونے لگتی۔ کھانے اور ناشتے کے وقت اپنے پاس بٹھاتے تھے۔ سامنے کے خاص خاص کھانے میری طرف بڑھاتے تھے اور اصرار کر کے کھلاتے تھے خود تو عمر کے تقاضے اور مرض قند پرہیز کی وجہ سے کم خوری پر مجبور تھے۔ اور مجھ کو بسیار خوری پر مجبور کرتے پچاسوں مریدوں اور معتقدوں سے بھرے دسترخوان پر اس قسم کا مظاہرہ خورد نوازی کے ساتھ وسعتِ ظرفی اخلاقی برتری اور حوصلہ مندی کی بات ہے۔

بات پر بات یاد آتی ہے۔ مجھے بعض ایسے بزرگوں کے ساتھ کھانے اور ناشتے کا اتفاق ہوا ہے جو بھرے دسترخوان پر انڈوں کی زردی کھاچ کھاچ کر خود اڑاتے تھے اور سفیدی دوسروں کی طرف بڑھاتے تھے اور رکابیوں پر غائرانہ نظر ڈالتے تھے کہ لذائذ شاہی کھانے کسی اور رکابی میں تو نہیں ہیں۔

ان دونوں واقعات میں مقابلے کے نتیجہ میں میرے نزدیک حضرت قاری صاحب کی عظمت بڑھ جاتی ہے اسی سفر میں حضرت قاری صاحب کا وعظ ہوا۔ ظاہر ہے ان کے نام پر کتنا زبردست مجمع ہوا ہوگا۔ آپ نے مجھے پہلے تقریر کا حکم دیا۔ عام طور سے مصنف و صحافی تقریر و خطابت میں کوں ہی سے ہوتے ہیں جس طرح مقرر و خطیب کے لئے چند سطریں سلیقے سے لکھنا "کارے دارد" ہوتا ہے ویسے بھی میں تقریر کے میدان سے دور رہتا ہوں۔ مگر حضرت قاری صاحب کی ان کے الفاظ میں گذارش پر انکار نہ کر سکا اور تھوڑی دیر کچھ بیان کیا اس کے بعد آپ نے خطبۂ مسنونہ پڑھ کر اپنے وعظ کی ابتدا میرے بیان کی تعریف و توصیف سے فرمائی اور

اور کہا کہ اس جامع تقریر کے بعد مزید کی ضرورت نہیں ہے اس لئے اسی متن کی شرح کروں گا چنانچہ شروع سے آخر تک اسی کا حوالہ دیتے رہے اور پورے وعظ کا موضوع یا متن اسی کو قرار دیا۔ اب ایسے لوگ کہاں ملیں گے؟

پھر بات پر بات آگئی۔ ایک جلسہ میں کئی علماء و مقررین مدعو تھے جن میں میں بھی شامل تھا۔ میں نے ایک خاص موضوع پر اپنی تقریر میں زور دیا۔ میرے بعد ایک بزرگ نے تقریر فرمائی جس کی ابتدا میری تقریر کی مخالفت سے تھی اور وہ کہتے رہے کہ آج مسلمانوں کو اس کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس بات کی ضرورت ہے اور میں سوچتا رہا کہ حضرت اپنی بڑائی کا مظاہرہ اس انداز میں نہ فرماتے تو ان کے حق میں اچھا ہی رہتا۔

اسی پونہ کے سفر میں دو دن تک حضرت قاری صاحبؒ کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا جس میں میں نے ان کی خلوت جلوت کے معلومات اور عادات و اطوار قریب سے دیکھے۔ ان کی شخصیت قریب سے بڑی پرکشش معلوم ہوئی جس طرح سے دور سے بڑی پرکشش معلوم ہوتی تھی۔ اگر شخصیت کے دیکھنے اور پرکھنے میں دور ونزدیک کی مسافت حائل نہ ہو تو اس کے اصلی خد و خال نظر آتے ہیں۔

قاری محمد طیب رح سے چند یادیں

از عزیز الحسن صدیقی

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب سابق مہتمم دار العلوم دیوبند اللہ کو پیارے ہو چکے۔ اب صرف ان کی یاد رہ گئی ہے۔ اللہ نے ان کو نصف صدی تک دار العلوم کی خدمت کا موقعہ دیا۔ یہ ان پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام تھا بہت بڑی سعادت تھی۔ دار العلوم کو دوسرے اداروں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا اس کی بات ہی نرالی ہے۔ آج تو ہر روز مدرسے کھلتے ہیں مگر دار العلوم اس وقت قائم ہوا جب آزاد دینی مدارس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کی بنیادوں کی نشاندہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی اس لئے اس کو "الہامی مدرسہ" کہا جا سکتا ہے۔

دیوبند کی ہندوستان ہی میں نہیں پوری دنیا میں وہی حیثیت ہے جو روم میں ویٹیکن سٹی کو حاصل ہے دار العلوم اور اس کے کھدر پوش اور بوریہ نشین علماء کیا تھے؟ یہ انگریز جانتا تھا۔ انگریز قوم علم دوست تھی اس لئے اس نے کبھی دار العلوم کی عظمت سے کھلواڑ نہیں کیا۔ اور اس کی حیثیت کو ہمیشہ تسلیم کیا۔

قاری صاحب نے نصف صدی تک دار العلوم کو جس طرح کلیجے سے لگائے رکھا۔ اس کی آبیاری کی اس کی ایک بھی تاریخ ہے۔ اس عرصہ میں انھوں نے دار العلوم کو بہت کچھ دیا۔ علمی ترقی، عمارتی توسیع، حلقہ منتسبین دار العلوم کا پھیلاؤ۔ یہ سب انھیں کے عہد میں ہوا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ تقریبا یہی زمانہ حضرت شیخ الاسلام کا بھی تھا۔ قاری صاحب اپنی انتظامی ذمہ داریوں اور طبعی تقاضوں کی وجہ سے تحریکِ آزادی میں حصہ نہ لے سکے جبکہ شیخ مدنی پوری طرح تحریکات میں حصہ لیتے رہے اس کے باوجود دونوں بزرگوں کا آپسی تعلق برابر قائم رہا یہ وہ چیز ہے جو دوسروں کے یہاں نہیں ملتی۔

اب قاری صاحب کی خدمات کے سلسلے موقوف اور تمام رشتے منقطع ہو چکے ہیں۔ مگر ان کا تذکرہ باقی ہے اور مدتوں انھیں یاد رکھا جائے گا۔ حضرت مولانا قاسم نانوتوی کی اولاد ہونے کے ناطے وہ پوری دیوبندی برادری کے چشم و چراغ تھے اور ملک ہی نہیں ملک کے باہر بھی ہمیشہ ان کے ساتھ عزت و احترام کا معاملہ کیا گیا۔ بلاشبہ ان کا اعزاز و اکرام ایک بڑا عالم دین ہونے کی وجہ سے کیا جاتا تھا مگر اس میں اس نسبت کو بھی دخل تھا جو حضرت نانوتوی کی اولاد ہونے کی وجہ سے انھیں حاصل تھی۔ اس اعتبار سے ملک کی بڑی سے بڑی شخصیت ان کا لگا نہیں کھا سکتی۔

تقسیم ہند کے بعد قاری صاحب ترکِ سکونت کر کے پاکستان چلے گئے اور جب انھوں نے وہاں علم و علماء کی توقیر میں کمی دیکھی تو ہندوستان آنے کا قصد کیا۔ ظاہر ہے یہ کام مشکل ہی نہیں ناممکن

بھی تھا، شہریت کی تبدیلی کا سوال تھا مگر حضرت شیخ الاسلامؒ نے وزیر اعظم ہند پنڈت نہرو سے کہا، کہ دار العلوم کیلئے قاری محمد طیبؒ کی ہندوستان واپسی بیحد ضروری ہے۔ نہرو جی نے کچھ عذر کیا تو شیخ نے فرمایا مہتمم تو دار العلوم کو بہت مل جائیں گے مگر مولانا نانوتویؒ کی اولاد ہم کہاں سے لائیں" پھر دنیا نے دیکھا کہ حضرت قاریؒ صاحب کو دار العلوم کی مسند اہتمام بھی ملی اور ہندوستان کی شہریت بھی، برسبیل تذکرہ یہ کہنے میں کیا حرج ہے کہ پنڈت جی کی ہی یہ خصوصیت تھی کہ علمار کی عزت و توقیر کیا کرتے تھے ان کی اولاد کو یہ سعادت کہاں سے نصیب؟ آزادی سے ذرا پہلے آل انڈیا کانگریس کا اجلاس متونانھ بھنجن میں ہو رہا تھا، بڑے بڑے قومی رہنما اس اجلاس میں شریک تھے۔ پنڈت جی غازی پور ہوتے ہوئے متو پہنچے اور سب سے پہلے مولانا مدنیؒ کی قیام گاہ (جو جلسہ گاہ کے ایک حصہ میں تھی) پر حاضری اور شیخ کے سامنے دیر تک دو زانو بیٹھے رہے۔

قاری صاحب کی خدمات نصف صدی پر پھیلی ہوئی ہیں اور اس دور کی تاریخ انقلابات سے پُر ہے، تحریک آزادی نے اسی زمانہ میں زور پکڑا، انقلاب زندہ باد کے نعروں سے ہندوستان گونج رہا تھا جیلوں کے آہنی دروازے بار بار کھلتے اور بند ہوتے رہے، ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی جھنکاریں سنائی دیتی رہیں، مکمل آزادی کا ریزولیوشن پاس ہوا، کوئٹ انڈیا کا ریزولیوشن پاس ہوا ہندوستانیوں کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا۔ انگریزو! ہندوستان چھوڑو ــــ ظاہر ہے کہ دیوبند جو تحریک آزادی کا ایک اہم ترین مرکز اور آزادی کے سپاہیوں کی زبردست چھاؤنی تھا کیسے شہر خموشاں بنا رہتا۔ وہ تو سوتوں کو جگانے والا تھا پھر خود کیسے سوتا رہتا۔ دیوبند کی بستی جاگی اور خوابیدہ ہندوستان کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا، آزادی کی جوت جگائی ظاہر ہے کہ دیوبند کا مدرسہ جب برطانوی حکومت کو بیخ وبُن سے اکھاڑنے کیلئے کھڑا ہو گیا تو حکومت اس کو کیسے معاف کر دیتی، اس نے بھی اپنی پوری طاقت اس تحریک کو دبانے کے لئے صرف کر دی مگر علمار دیوبند بدستور اپنے موقف پر قائم رہے۔ قاری صاحب اگرچہ عملی طور پر تحریک میں شامل نہیں تھے مگر اصولی طور پر ملک کی آزادی کو ضروری اور خود کو آزادی خواہ جماعت کا ایک فرد سمجھتے تھے جیسا کہ اُن کے مختلف خطبات سے ظاہر ہوتا ہے۔ انہوں نے جا بجا اپنی تقریروں تحریروں میں ان قربانیوں پر فخر کا اظہار کیا ہے اور ان کو دیوبند تحریک کا نتیجہ اور اکابر دیوبند کا کارنامہ قرار دیا ہے جو استخلاص وطن کے سلسلہ میں علمار دیوبند نے پیش کی تھی۔ بہرحال علمار و اساتذہ دار العلوم تعلیمی جد وجہد کے ساتھ ساتھ تحریک آزادی میں بھی سرگرمی کے ساتھ شریک رہے، تحریک بھی چلتی رہی اور دار العلوم بھی چلتا رہا اور قاری صاحب الگ تھلگ رہ کر دار العلوم کا نظام چلاتے رہے ــــ حکومت بدلی، نظریات تبدیل ہوئے، سیاسی حالات کچھ سے کچھ ہو گئے مگر وہ اپنے کام لگے رہے۔

ان کا ایک ہی کام تھا۔ اور وہ تھا دارالعلوم کی خدمت۔ ان کا مسلک و مشرب اگر کچھ تھا تو دارالعلوم تھا۔ ان کا میدان عمل ایک تھا اور وہ تھا دارالعلوم ان کی اگر کوئی سیاست تھی تو وہ دارالعلوم تھی الغرض انکا اوڑھنا بچھونا دارالعلوم ہی تھا۔ وہ جہاں گئے دارالعلوم ہمیشہ ان کے ساتھ رہا، وہ کبھی اس سے الگ نہیں رہے گویا کہ ان کی ذات اور دارالعلوم لازم و ملزوم بن گئے تھے یا یوں کہیے کہ ایک چیز کے دو نام لوگوں نے رکھ لیتے تھے۔

دنیاوی اداروں میں تو یہ رسم ہے کہ کوئی ذمہ دار جب ریٹائر ہوتا ہے تو اس کا تعلق ادارے سے ختم ہو جاتا ہے مگر دینی اداروں کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ قاری صاحب اپنی زندگی کے آخری دور میں دارالعلوم کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو چکے تھے مگر پھر بھی وہ دارالعلوم کی فکر سے اپنے ذہن کو فارغ نہ کر سکے۔ بلاشبہ کسی ادارے کے منتظم اور ایڈمنسٹریٹر کو جتنا سخت ہونا چاہیے وہ اتنے سخت نہیں تھے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ بالکل سخت نہیں تھے۔ طبیعت بیحد نرم پائی تھی عفو و درگذر سے ہمیشہ کام لیتے رہے، سب کو جوڑنے کا مزاج رکھتے تھے، سب کو خوش رکھنا چاہتے تھے، تواضع و انکسار خاندانی طریقہ تھا اختلافات سے بچکر نکل جانا خوب جانتے تھے۔ ایمرجنسی کے زمانے میں خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں جب ان کی رائے معلوم کی گئی تو انہوں نے بالکل وہی انداز اختیار کیا جو مولانا قاسم نانوتوی رح نے انگریزوں کے زمانہ میں ایک موقعہ پر اختیار کیا تھا۔ ایک بار برطانوی حکومت کے سپاہی مولانا نانوتوی رح کو گرفتار کرنے کی نیت سے مسجد کے اندر داخل ہو گئے اور مولانا ہی سے پوچھ بیٹھے کی مولانا نانوتوی یہاں تھے، مولانا نے برجستہ جواب دیا "ابھی تو یہیں تھے" قصہ یہ تھا کہ جس وقت سپاہی مسجد میں داخل ہو رہے تھے اسی وقت مولانا دو قدم پیچھے ہٹکر کھڑے ہو گئے تھے، اس حکمت عملی کا مقصد اپنی جان بچانا نہیں تھا بلکہ انگریزوں کی گرفت سے محفوظ رہ کر اپنے مشن کو جاری رکھنا تھا۔

آزادی کے بعد سے لگاتار اس ملک پر کانگریس کا راج چلا آتا ہے۔ درمیان میں چند مہینوں کے لئے بھارت کی جنتا نے "جنتا پارٹی" کو حکومت کی باگ ڈور تھما دی تھی مگر اس نے نااہلی کا ثبوت دیا اور خود اپنے پاؤں میں کلہاڑی مار لی جلد ہی اس کے اقتدار کا سورج ڈوب گیا اور پھر کانگریس نے اپنی پوزیشن سنبھال لی۔ کانگریس وہ جماعت ہے جس پر گاندھی جی کے فلسفہ عدم تشدد کا ہمیشہ غلبہ رہا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ "اہنسا پرمودھرمو" کا اصول اس ملک میں ہمیشہ تسلیم کیا گیا مگر اندرا سرکار کے ایمرجنسی پیریڈ میں اہنسا کی جگہ "ہنسا" اور عدم تشدد کی جگہ تشدد کا راج رہا، زبانوں پر تالے لگا دیئے گئے اظہار رائے کی آزادی چھین لی گئی، جبری نسبندی کا سلسلہ شروع کر دیا گیا نسبندی کے دوران کتنے ہی مظلوم انسانوں کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا، مخالفین کو جیلوں میں ٹھونس دیا گیا اور کہا یہ گیا کہ ملک کو خطرہ درپیش تھا اس لئے ایمرجنسی نافذ کی گئی

پڑی حالانکہ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ الٰہ آباد ہائیکورٹ کے ایک فیصلہ نے اندرا جی کی حکومت کو متزلزل کر دیا تھا اس لئے ان کو ایمرجنسی کا سہارا لینا پڑا۔

قاری صاحب نے خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں نرم الفاظ میں یہ کہہ کر وہ احقر نے دارالعلوم کے مفتیان کرام سے بھی درخواست کی ہے کہ وہ مسئلہ کی جزئیات جمع کر کے اس (فیملی پلاننگ) پر غور فرمائیں" حکومت کو تھپکیاں دے کر سلا دیا اور وہ دارالعلوم سے کوئی انتقام نہ لے سکی، پنچھو شرمی کے زمانہ میں محض ایک اشتہار کو بنیاد بنا کر دارالعلوم کی تلاشی لی گئی تو ایمرجنسی میں کیا کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا شاید اسی لئے قاری صاحب نے نرم رویہ اختیار کیا۔ یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ ہم جیسے جذباتی انسان اس پر مطمئن نہ تھے مگر آج یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ قاری طیب صاحب جیسے ۸۰ سال کے معمر اور سرد و گرم چشیدہ بزرگ نے حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے محض دارالعلوم کی خاطر نرم رویہ اختیار کیا اور دارالعلوم کو CONTROVERSY سے بچا لیا آخر کار وہ دن بھی آ گیا کہ ایمرجنسی کا ہولناک زمانہ ختم ہوا۔ عوام نے اطمینان کا سانس لیا، حکومت کے کل پرزے بکھر گئے پھر جنتا سرکار آئی مگر جلد ہی وہ بھی اپنے کیفر کردار کو پہونچ گئی اور اب پھر اس ملک پر اندرا راج کا پھریرا لہرا رہا ہے۔ یہ سب ہوتا رہا اور آئندہ بھی سیاسی انقلابات آتے رہیں گے مگر دارالعلوم اسی طرح چلتا رہے گا۔ نہ کل اس کے نظریات میں فرق آیا نہ آئندہ آئے گا، افکار و نظریات ٹکراتے ہیں اختلاف بھی ہوتے ہیں دارالعلوم میں پہلے بھی اختلاف ہوا اور آج بھی ہوا مگر دارالعلوم کی حرکت عمل میں اس سے کوئی فرق نہیں آیا۔ معتقدین و مخالفین کو رنج ہوگا کہ دارالعلوم پھر تازہ دم ہو گیا۔ اب انہیں مدتوں رونا پڑے گا کیوں کہ دارالعلوم کے بارے میں جو آپسی اختلاف تھا ختم ہو چکا ہے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا قول کہ "میری امت کا اختلاف رحمت ہے" کتنا سچا ہے، کتنا صحیح ہے، اختلاف رائے کی بھٹی ہے "دارالعلوم" "کندن" بن کے نکل آیا افسوس کہ قاری صاحب عمر نے زمانہ کی ورنہ وہ بھی ان ترقیات کو جو ادھر چند مہینوں میں ہوئی ہیں دیکھ کر خوش ہوتے۔ آخر وہ بھی تو دارالعلوم ہی کے بیٹے تھے، اسی کی گود میں کھیلے تھے۔ اپنے سینہ میں دل رکھتے تھے اور دل بھی ایسا جس میں دین کا درد تھا، تڑپ تھی، کسک تھی، دل کی کیفیات کون جان سکتا ہے؟ ماحول کے اثرات کبھی کبھی انسانوں کو مجبور کر دیا کرتے ہیں اور خارجی دباؤ کے تحت کچھ فیصلے ہو جاتے ہیں۔ وقت بہترین مرہم ہے، ماحول کی تلخیاں کم ہو رہی ہیں تاریخ کا عمل جاری ہے اور کچھ ہی دنوں کے بعد کانوں میں یہ بات سنائی دے گی کہ قاری صاحب کا دور بہترین دور تھا۔ بڑا کام ہوا اس دور میں ـــــ ہائے وہ صورتیں کہاں چھپ گئیں، کیسے لوگ تھے جو ایسے ایسے کام کر گئے۔ احسان دانش کا قول "کیسے تھے وہ لوگ جو بنے تو وہاں (دارالعلوم کی عمارات کی طرف اشارہ کر کے) بنا گئے اور خود یہاں (قبرستان قاسمی) میں پڑے ہوئے ہیں" بار بار یاد آئیگا۔ آٹھ آٹھ آنسو رلائے گا

قاری صاحب سے اس دنیائے آب و گل میں ملاقات ممکن نہیں رہی نہ ان کی زبان سے اب کچھ سنا جا سکتا ہے مگر یہ شعر سن لینے میں کیا ہرج ہے۔ ہو سکتا ہے اس میں ان کی کچھ ترجمانی ہو جائے۔

جان کر منجملۂ خاصان میخانہ مجھے !!
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

اگر قاری صاحب زندہ ہوتے اور مجھے ملجاتے تو میں ان سے کہتا کہ آپ دیوبند کیلئے دیوبند چھوڑیئے کسی نئے "بن باس" کیلئے نہیں بلکہ دیوبندی مکتب فکر کی بقاء کیلئے ملک کے طول و عرض میں آپ کے اور دارالعلوم کے ماننے والے لاکھوں نہیں کروڑوں لوگ بستے ہیں۔ آسام ہو یا گجرات، مہاراشٹر ہو یا مدھیہ پردیش، یوپی ہو یا بنگال ہندوستان کے ہر صوبہ میں اور ہر ضلع میں دیوبند کے پڑھے ہوئے علماء موجود ہیں۔ گاؤں گاؤں ہمارے مدرسے ہیں۔ ان سب مدرسوں کا سلسلۂ نسب دارالعلوم سے جا ملتا ہے۔ آپ ان کو جا کر دیکھئے، پہلے آپ سہارنپور جائیے جہاں آپ کے اسلاف کی نشانی مظاہر علوم موجود ہے اور یہ وہ مدرسہ ہے جو دیوبند کے بعد ہندوستان میں سب سے پہلا مدرسہ ہے جو دیوبند کے طرز پر قائم ہوا پھر مراد آباد جا کر شاہی مدرسہ کو دیکھئے اور وہاں بھی "پیام قاسمی" سنائیے، اسی طرح آپ پورے ملک کا دورہ کیجئے، مدرسوں کی کھیتی آج پیاسی ہے اس کو سوکھنے سے بچانا ضروری ہے مدرسوں کی طرف نگاہیں اٹھ رہی ہیں اُن کو بہلا پھسلا کر "گرانٹ اِن ایڈ" کی طلائی زنجیروں میں جکڑا جا چکا ہے جنھوں نے اس کا مزہ نہیں چکھا ہے وہ اس "نارنج" کے خوبصورت پھل کو نارنگی سمجھ کر کھا لینے کیلئے بیتاب نظر آ رہے ہیں آپ ان کے سر پر ہاتھ کیوں نہیں رکھتے اور ان سے کیوں نہیں کہتے کہ دارالعلوم نے کبھی سرکاری امداد پر بھروسہ نہیں کیا۔ بہوگنا جیسے شاد دماغ اور علماء کا احترام کرنیوالے وزیر اعلیٰ نے دارالعلوم کو تعلیمی بجٹ سے ڈیڑھ لاکھ کی امداد دینے کا فیصلہ کیا تو ہم نے شکریہ کیساتھ لوٹا دیا اور یہی جواب دیا کہ یہ ہمارے اسلاف کے طریقہ کے خلاف ہے پھر اے مدرسے چلانیوالو تم کیوں سرکاری پیسوں پر للچائی ہوئی نگاہ ڈالتے ہو۔

افسوس صد افسوس کہ اب قاری صاحب ہمارے بیچ کبھی نہیں آئیں گے اس لئے ان کو مخاطب کرنے کی بجائے ہمیں اپنے ضمیر سے خطاب کرنا چاہیئے۔ اپنا احتساب خود کرنا چاہیئے اور ماضی کی یاد سے اپنے قلب و دماغ کو بوجھل کرنے کی بجائے مستقبل کی فکر کرنا چاہیئے۔

دارالعلوم کے طرز پر چلنے والے مدرسوں کا ایک وفاقی نظام بننا چاہیئے۔ ایک ایسی کتاب شائع ہونی چاہیئے جسمیں ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہزاروں مدارس کے مختصر حالات درج ہوں۔ دارالعلوم کی جانب سے ہر سال ان مدارس کے منتظمین کا ایک اجتماع بلانا چاہیئے۔ ایک دوسرے کو سمجھنے کی ضرورت ہے، قریب آنے اور مل بیٹھنے کا وقت ہے دارالعلوم کے مسلک کی ترویج کیلئے ہر صوبہ کے صدر مقام پر "دارالعلوم کانفرنس" کے نام سے بڑے بڑے اجتماعات کئے جائیں۔

راقم سطور کو قاری صاحبؒ کے قریب رہنے کا موقعہ نہیں ملا لیکن چند واقعات اس کے سامنے ایسے ضرور گذرے ہیں اور کچھ باتیں کانوں میں پڑی ہیں جن سے ان کے مزاج و طبیعت کو سمجھنے میں مدد ملی بس ان ہی کے تذکرہ پر یہ مضمون ختم ہو رہا ہے۔

ایک واقعہ

مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ اکثر یاد آتا ہے۔ سنہ ۴۴ھ کی بات ہے مدرسہ دینیہ کا سالانہ جلسہ ہو رہا تھا، شیخ الاسلام مولانا عبد الحق مدنی اور بہت سے بزرگ شریک جلسہ تھے۔ قاری محمد طیب صاحبؒ بھی تشریف لائے ہوئے تھے، ان کو ہمارے مکان کے ایک ایسے کمرہ میں ٹھہرایا گیا جو باہر پڑتا تھا اور جلسہ کے انتظامات کے سلسلہ میں جلسہ سے قبل دفتر کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ قاری صاحب کے اس کمرہ میں ٹھہرائے جانے کا علم خادم کو نہ تھا۔ میں نے جب دیکھا کہ کمرہ بند ہے تو زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا کیا دیکھتا ہوں کہ اندر سے ایک بزرگ نے دروازہ کھولا اور سامنے کھڑے ہو گئے، میں چپکے سے وہاں سے کھسک آیا اور کسی سے پوچھا کہ کون بزرگ کمرہ میں آرام فرما ہیں۔ معلوم ہوا کہ قاری صاحبؒ ہیں۔ مجھے اپنی حماقت پر افسوس ہوا اور کئی دن تک شرمندگی کا احساس رہا کہ میری حرکت سے ایک بزرگ کو تکلیف پہنچی۔ اصل بات جو کہنی تھی وہ رہی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ دروازہ کھلنے کے بعد جو شخصیت میرے سامنے آئی وہ عجیب تھی، میری حرکت پر احتجاج یا تنبیہ کا کوئی کلمہ اس کی زبان پر نہیں تھا۔ بس اتنا دیکھا کہ دروازہ کھلا اور پھر فوراً ہی بند ہو گیا۔ تحمل اور بردباری کے علاوہ اور کوئی لفظ موزوں ہو سکتا ہو تو بتایئے۔

تمرینی جماعت

ایک بار قاری صاحبؒ مسجد عبد النبی میں تشریف لائے۔ وحید الدین خاں صاحب جو ہفت روزہ الجمعیۃ سے وابستہ تھے، نے قاری صاحبؒ کے سامنے تبلیغی جماعت کا ذکر چھیڑ دیا۔ قاری صاحبؒ نے ارشاد فرمایا "تبلیغ کا حق صحیح معنوں میں جمعیۃ علماء کو پہنچتا ہے۔ تبلیغی جماعت تو فی الاصل تمرینی جماعت ہے۔"

پوچھو مت کئے جاؤ

ایک بار قاری صاحبؒ مدرسہ دینیہ کے جلسہ میں شرکت کے لئے غازی پور تشریف لائے۔ شہر کے ایک دیندار بزرگ نے اپنے یہاں قاری صاحبؒ کو شام کی چائے پر مدعو کیا۔ وہاں ایک صاحب نے قاری صاحبؒ سے سوال کر دیا کہ مسلمانوں کا کو آپریٹو سوسائٹیاں قائم کرنا اور حکومت سے قرض لیکر اقتصادی توانائی حاصل کرنا کیسا ہے۔ حضرت قاری صاحبؒ نے فرمایا "پوچھو مت کئے جاؤ" غالباً قاری صاحبؒ کے ذہن میں یہی نکتہ رہا ہوگا کہ حکومت آج زبردستی ملازمین کا بیمہ کرا رہی ہے اور طرح طرح سے پابند کر رہی ہے پھر مسلمانوں کو ملازمتیں بھی نہیں مل رہی ہیں، ایسی صورت میں مسلمانوں کو کاروباری ترقی کے مواقع سے محروم کر دینا مناسب نہیں ہوگا۔ مولانا محمد میاںؒ نے بھی یہی لکھا ہے کہ بینک سے قرض لینا تقوی کے خلاف ہے مگر موجودہ نظام میں کون کہہ سکتا ہے کہ ہم محفوظ ہیں۔

پورا معاشی ڈھانچہ بینکنگ کی زد میں ہے کھاد، بیج، آلات زراعت کی سرکاری طور خرید و فروخت اور درآمد وغیرہ سب کی بنیاد ایک ہے۔ قاری صاحبؒ کا یہ مختصر سا فقرہ بتلاتا ہے کہ وہ ملک کے حالات اور مسلمانوں کی اقتصادی پوزیشن پر گہری نظر رکھتے تھے اور نپی تلی بات کہنے کے عادی تھے۔

شکریہ یا شکوہ

مدتوں کی کوششوں کے بعد قاری صاحبؒ مدرسہ دینیہ کی دعوت پر غازیپور تشریف لائے کارکنوں نے وعدہ کیا تھا کہ قاری صاحبؒ کو طویل تقریر کی زحمت نہیں دیں گے صرف ایک مجمع عام میں سپاسنامہ پیش کرنے کی اسکیم تھی۔ حضرت قاری صاحبؒ جلسہ گاہ میں تشریف لائے عربی اور اردو میں سپاسنامہ پڑھا گیا اس کے بعد موصوف نے بیٹھے ہی بیٹھے خطبہ پڑھا اور فرمایا کہ سپاسنامون پر شکریہ ادا کروں یا شکوہ اور اس مضمون کو اتنی تفصیل سے بیان کیا کہ حاضرین کو اور خود قاری صاحبؒ کو پتہ ہی نہیں چلا کہ کتنا وقت گذر گیا۔ ڈیڑھ گھنٹہ تک شکریہ اور شکوہ پر بولتے رہے اور جب تقریر ختم ہوئی تو محسوس یہ کیا گیا کہ علم کا ایک دریا اچانک بہتے بہتے تھم گیا ہے۔

قاری صاحب کے علم و فضل کو خراجِ عقیدت

مولانا عبد القدوس حماد قاسمی

مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ظاہری طور پر عالم اسباب سے ۶ر شوال ۱۴۰۳ھ کو عالم برزخ کی جانب سے منتقل ہو گئے لیکن آپ کی حیات طیبہ کا اثاثہ اور باقیات صالحات کا جو سرمایہ ہے وہ انشاء اللہ بطور صدقہ جاریہ قائم و دائم رہ کر آپ کی روح گرامی کو نفع دیتا رہے گا۔ آپ کے دینی لٹریچر مختلف اسلامی ادارے اور علمی سلسلے سے امت مسلمہ مستفیض ہوتی رہے گی۔

دار العلوم دیوبند کے مہتمم واستاذ اور اس کی دینی تحریک و دعوت کے سربراہ کے منصب پر سرفراز ہو کر آپ نے اسلامی تاریخ و ثقافت کے اقدار و قیم کی بسوط اور حکیمانہ ترجمانی کی اور اسلام کے بین الاقوامی نظام اور آفاقی طرز حیات کی تفہیم و تشریح کے فرائض کو سرانجام دیا۔

نسبی خصوصیت! شرافت و نجابت کا اصل معیار تو علم و تقویٰ ہے جس کے اندر علم دین کا جس قدر کامل رسوخ ہوگا اسی قدر خشیت الٰہی کا رنگ غالب ہوگا، یہ صفت و خصوصیت حضرت مرحوم کے اندر بدرجہ کمال موجود تھی۔ ارشاد قرآنی ہے۔

قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون یعنی اے نبیؐ آپ اعلان کر دیجئے کہ کیا عالم اور غیر عالم برابر ہیں۔ آیت مذکورہ میں علم سے مراد علم دین ہے کیوں کہ اس کی تفسیر دوسری آیت یوں کر رہی ہے یعلمون ظاہرا من الحیوۃ الدنیا وھم عن الاخرۃ غافلون، یعنی دنیا کا ظاہر تو جانتے ہیں مگر زندگی کے مغز و روح سے بیخبر ہیں۔ تو دنیا کے علم کو علم نہیں کہا جا سکتا پھر ظاہری علم کے باوجود خدا نے لا یعلمون کہکر بتلا دیا کہ اللہ کی نظر میں علم کا مفہوم متعین ہے کہ دین ہی کی حقیقت کا علم اللہ کی نظر میں علم ہے۔

حضرت مرحوم کے اندر علم دین کے رسوخ کی جو کیفیت تھی وہ مقام کے درجہ تک پہونچ چکی تھی۔ جسے احسان کہتے ہیں۔ یہی فضیلت کیا کم ہے اگر اس کے ساتھ نسبی عزت و کرامت بھی حاصل ہو جائے تو سبحان اللہ سونے پر سہاگہ ہے۔ چنانچہ آپ کریم ابن کریم ابن کریم کے طغرائے امتیاز کے حامل تھے یعنی بقیۃ السلف حضرت مولانا الحافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند گرامی تھے۔ جنہوں نے چالیس برس تک دار العلوم دیوبند کے منصب اہتمام پر فائز ہو کر دین و ملت کی خدمت سرانجام دی ہے اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے نبیرہ تھے جو دار العلوم کے بانی اور اس کے نظام تعلیم و تربیت اور اصول ہشتگانہ کے مؤسس تھے۔ اور ملی اتحاد و یکجہتی اور اسلامی اجتماعیت و تنظیم کی تشکیل اور شرعی نظام کی تنفیذ

اور حریت وطن کے نصب العین کی حامل تحریک جہاد کے روح رواں تھے۔ ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی کے میر کارواں آپ ہی تھے۔ اس نسبی خصوصیت سے آپ کے تعارف میں چار چاند لگ گیا۔ یوں آپ کی بلند پایہ علمی روحانی شخصیت تعارف وتعریف سے بے نیاز ہے دنیا کے گوشہ گوشہ میں آپ کی دینی قیادت اور علمی سیادت کے کارناموں کا چرچا ہے۔

اکابر دارالعلوم کے رنگوں کی جامعیت

حضرت مرحوم کے شمائل وخصائص کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ آپ کی ذات گرامی اکابر دارالعلوم کے تمام متوارث ذوق اور جملہ رنگوں کی جامع تھی، یہ صفت اسلاف میں کمیاب اور اخلاف میں نایاب ہے بقیۃ السلف مولانا الحافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ کے واسطے سے آپ کے اندر حجۃ الاسلام حضرت مولینا حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی فکر وحکمت اور بالواسطہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ فقیہ الاسلام حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت وارشاد کا رنگ غالب تھا، یعنی حضرت گنگوہی نے سنت وبدعت کے درمیان جو حد فاصل کھینچکر ان کے امتیازات کو نمایاں کیا ہے ان کی تشریح وتوضیح آپ نے حضرت نانوتوی کی فکر وحکمت کے اصول پر فرمائی اور اس دین حنیف کی دعوت اس کی اصل فطرت کے مطابق دی جو قرون اولی یعنی عہد نبوت وزمانہ خلافت راشدہ اور قرن صحابہ وتابعین سے تاریخی تواتر اور صحیح سندوں کے ساتھ [illegible] کے مراحل طے کرتا چلا آرہا ہے تجدیدات واصلاحات کے فرائض کو امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے انجام دیا اور ان تجدیدات واصلاحات کو علمی تحقیقی اور فنی اعتبار سے امام انقلاب حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے مرتب ومنظم کیا اور ان کی تالیف وتدوین میں بے حد دماغ سوزی کی، چنانچہ اسلامی نظام کی تنقید کے سلسلے میں حضرت شاہ ولی اللہ کا لٹریچر مشعل راہ بن سکتا ہے۔ جس نے اسلامی تاریخ وثقافت اور نظام فکر القرآن کی تفصیلات وحقائق کو مدلل اور مستند طریقہ سے واضح کیا ہے یہی مدلل اور مستند طریقہ فکر ولی اللہی ہے جس کے ترجمان حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب نور اللہ مرقدہٗ تھے یہی ترجمانی جملہ اکابر دارالعلوم کا شعار تھا جس کے رنگ وانداز الگ تھے اور حضرت تمام رنگوں کے جامع تھے شیخ الہند مولانا محمود حسن کے مرید باصفا اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے خلیفہ ارشد تھے، اسی طرح آپ حضرت مولانا الحافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ کے بھی خلیفہ تھے جو قطب الارشاد امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے خلیفہ ارشد تھے پس آپ کی خلافت دو آتشہ تھی، ایک میں بالواسطہ حضرت امام الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی نسبت خاصہ اور معرفت کاملہ منتقل ہوئی اور دوسری خلافت بالواسطہ حضرت قطب الارشاد مولانا گنگوہی کے مقام احسان واستقامت سے مستنیر تھی۔

علوم وتحقیقات میں امام العصر حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ رشید اور دیوبندیات

میں امام المنطق والحدیث حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ کے مایہ ناز شاگرد تھے، دارالعلوم کے نظم ونسق اور اہتمام کی ذمہ داریوں میں فخرالاسلام حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی تربیت وسرپرستی اور رہنمائی حاصل تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ کے والد نے چالیس برس تک اہتمام کی خدمت انجام دی تو آپ نے تقریباً چھپن برس تک مسلسل اپنے فرائض منصبی کو انجام دیا...... اور تقریر وخطابت میں شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی رہنمائی کا شرف حاصل تھا۔ اکابر دارالعلوم میں حضرت علامہ عثمانی کے طرز وانداز میں آپ ہی کو خطابت وتقریر کا شرف حاصل تھا اور یہ طرز وانداز بالکل منفرد اور مجتہدانہ تھا سامعین پر سکوت طاری ہو جاتا اور قلوب کے اندر سمع وطاعت کا جذبہ بیدار ہوتا کٹر سے کٹر مخالفین اور اکابر دارالعلوم کے اعداء ومنکرین بھی آپ کے خطاب سے محظوظ ہوتے۔ آپ کے خطاب میں شیخ جیلانی کے ناصحانہ وقار اور ابن جوزی کے خطیبانہ کردار کی جواہر ریزی ہوتی اور مجدد سرہندی کی تجدید واصلاح اور ان کی دعوت وعزیمت کی چاشنی ہوتی اور شاہ ولی اللہ کے افکار واقدار کی روشنی ہوتی۔

آپکے اندر سب سے بڑا وصف تواضع وانکسار تھا جو حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی رفاقت صادقہ کے اثرات تھے اکابر کا احترام اور اصاغر سے محبت اور ان کی حوصلہ افزائی آپ کا خصوصی رنگ تھا۔

شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کا فرمان!

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ صدر المدرسین شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

"مت گھبرایئے اور صبر واستقلال اور عالی ہمتی اور خوشدلی کے ساتھ اس باغ محمدی علیہ السلام کو سرسبز وشاداب کیجئے۔ فیوض قاسمیہ کو چار دانگ عالم میں منتشر کیجئے...... زمانے کی تیز وتند ہوائیں چلیں گی، سمندروں کی موجیں تھپیڑے ماریں گی، خواہشات کے زلزلے آئینگے، اصحاب واغراض جھڑ جھڑائیں گے مگر آپ کو ہمالہ بننا چاہیئے، برداشت کیجئے اور ہمیشہ میں مردانہ وار کامزنی کرتے رہے حضرت قاسم قدس سرہٗ العزیز نے اگر لوگوں کی چلنیں بھر بھر کر اور پاؤں دبا دبا کر ان کو راہ پر لانے کا شیوہ اختیار کیا تو ان کے اخلاف صدق کو اس میں عار نہ آنا چاہیئے اور نہ گھبرانا چاہیئے اور ہمت بلند رہنی چاہیئے ہم ناکارہ بدنام کنندۂ نکونامان آپ کے ساتھ ہیں۔

(از مکتوبات شیخ الاسلام جلد دوم)

مذکرہ بالا فرمان گرامی کے ایک ایک جملہ پر غور وفکر کیجئے حضرت شیخ الاسلام نے حضرت حکیم الاسلام پر کیسے گہرے اعتماد کا اظہار کیا ہے اور اپنی فہم وفراست سے کتنا گہرا اور مبصرانہ تجزیہ کر کے صحیح صورت حال کا عکس سامنے کر دیا ہے، واقعی حضرت حکیم الاسلام نے فیوض قاسمیہ کو چار دانگ عالم میں فروغ دیا اور اپنی خداداد

صلاحیت واستعداد سے تحریک دارالعلوم کو بین الاقوامی پیمانے پر مقبول کیا۔ یہ عظیم کارنامہ خالص الہامی ہے۔ کسی تنظیم اور سوسائٹی اور سوسائٹی کے بس سے باہر ہے، کیوں کہ حکیم الاسلام خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشان تھے، تمام اکابر کی دعاؤں کا ثمرہ تھے۔ تمام اکابر اپنی باطنی توجہات سے حضرت حکیم الاسلام کی کی تقویت وتائید اور نصرت کا سامان مہیا کرتے تھے۔

تقسیم ہند کے فوراً بعد پاکستان گئے تو حضرت شیخ الاسلام بے چین ہو گئے بڑے تاثر سے یوں فرماتے تھے کہ ہم یتیم ہو گئے، دارالعلوم آپ کے بغیر سونا ہو گیا، اسی تمام کے بعد جب حضرت حکیم الاسلامؒ واپس تشریف لائے تو دارالحدیث میں خیر مقدمی جلسہ ہوا حضرت شیخ الاسلام نے حضرت حکیم الاسلامؒ کے محاسن مناقب بیان فرمائے اور آپ کی آمد پر اللہ کا شکر ادا کیا۔

حضرت شیخ الاسلام دور اندیشی اور فراست قلبیہ کی داد دیجئے وہ خوب سمجھ رہے تھے کہ آزادی وطن کے بعد دارالعلوم کی تقدیر حضرت حکیم الاسلامؒ کے باوقار ہاتھ میں ہے، چنانچہ حضرت حکیم الاسلامؒ کے عہد گرامی میں تحریک دارالعلوم نے جس فلک پیما ترقی کا امتیاز حاصل کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے، برصغیر ہند وپاک سے نکل کر عرب وعجم اور اقصائے عالم تک دارالعلوم کا آوازہ پہونچا جس کی قوت تسخیر نے پوری دنیا کو متاثر کیا اس کی انقلابی حیثیت اور اس کے آہنی کردار کو علوم وخواص نے تسلیم کیا علمی ودینی لحاظ سے اس نے اعتماد واستناد کا درجہ حاصل کیا ہے اور اس کا علمی دائرہ غیر معمولی طریقہ پر وسعت پذیر ہو گیا اور یہ پھیلاؤ اور یہ جہتی فروغ دراصل اکابر دارالعلوم کی دعائے نیم شبی اور آہ سحر گاہی کا ثمرہ اور اکابر دارالعلوم کے رنگوں کی جامع ترین ذات حکیم الاسلامؒ کی حکیمانہ ادارت اور حکمت عملی اور آپ کی پرکشش اور جاذب توجہ شخصیت کا فیضان ہے۔ آج دیوبند سے امریکہ کے طویل فاصلوں تک اور افریقہ، ایشیا اور یورپ کے دور دراز ملکوں تک دارالعلوم کو اگر جاننے والے ملتے ہیں تو یہ حکیم الاسلامؒ کے طویل ومسلسل علمی اور تبلیغی دوروں اور اسفار ہی کا نتیجہ ہے جہاں بھی آپ گئے دارالعلوم کا تعارف اس کے نصب العین، مشرب اور اس کے تاریخی کردار اور مسلک کا اظہار اور اس کے اکابر ومشائخ کا تذکرہ ایسے دل آویز اور سحر آگیں لب ولہجہ میں فرمایا کہ دارالعلوم کی حقیقی تصویر لوگوں کے سامنے آگئی اور قلوب میں دارالعلوم کے احترام واعتماد اور عزت ووقار کے نقوش ثبت ہو گئے۔

حضرت حکیم الاسلام فرمایا کرتے تھے کہ میں جہاں جاتا ہوں دارالعلوم میرے ساتھ ہوتا ہے جس کی آسان تعبیر یہ ہے کہ حضرت حکیم الاسلام اپنی ذات میں ایک چلتا پھرتا دارالعلوم ہیں دیکھنے والے حضرت کے جمال باطنی اور حسن ظاہری میں دارالعلوم ہی کا مشاہدہ کرتے ہیں، دارالعلوم عمارت ومکان کا نام نہیں ہے بلکہ خصوصی طرز فکر کا نام ہے دینی تعلیم وتربیت کے خصوصی نظام کا نام ہے تاکہ اسلام اپنی حقیقی شکل وصورت کے ساتھ غالب ہو اور ہر قسم کی تحریف تاویل اور خرافات سے پاک وصاف ہو جس اسلام کو صحابہ کرام نے پیش کیا اس کے تحفظ کا نام دارالعلوم ہے۔

حضرت حکیم الاسلام اسلاف کی آخری نشانی !

حضرت حکیم الاسلامؒ کی تعلیم و تربیت اور ذہنی و فکری

نشو و نما ایسی مقدس ہستیوں کے زیر سایہ ہوا جو اخیار امت اور شریعت و طریقت کے حقیقہ جامع اور سلف صالحین کے سچے پیرو تھے اور علم و عمل میں اصول صحابہ کے پابند تھے، زہد و تقویٰ اور اتباع احکام میں ان کے قدم بقدم تھے، اسی بابرکت صحبت و تربیت کا اثر تھا کہ حضرت حکیم الاسلام کی مقدس ہستی تواضع و انکسار کی پیکر تھی اور اخلاق حسنہ اور علوم الٰہیہ کی خزینہ تھی۔ مصائب پر صبر و سماحت اور انعامات پر شکر و امتنان کا جذبہ آپ کی فطرت میں داخل تھا اور آپ کے اندر فکر و عقیدہ اور اسلامیت کی روح پورے طور پر حلول کر گئی تھی اور ایمان و عمل میں کیفیت احسان درجہ مقام تک پہونچ گئی جو سلوک و معرفت کا آخری مقام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اسلاف کی آخری نشانی تھے اور اسلاف کے علوم و معارف کے امین تھے۔

حضرت حکیم الاسلام کی جبین سعادت عہد طالب علمی ہی سے چمک دمک رہی تھی اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب نور اللہ مرقدہ کا ایک قلمی تبرک بطور شہادت کے شریک مضمون کر دیا جائے، جس میں خاندان قاسمی کا مختصر تذکرہ بھی ہے، اور حضرت حکیم الاسلام کے متعلق شہادت بھی ملجائے گی کہ وہ صغر سنی ہی میں علم و فضل کی سندیں حاصل کر چکے تھے،

جس کا منظر یہ ہے کہ بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد نور اللہ مرقدہ کی اولاد باحیات نہونے سے اکابر دار العلوم کو بڑی فکر دامنگیر ہو گئی تھی کہ نسل قاسمی منقطع نہ ہو جائے لیکن الہامی طور پر حضرت شیخ الہند نے ایک مستجاب الدعوات بزرگ سے دعا کرانے کیلئے نمائندہ ارسال فرمایا ترینہ اسی طرح حضرت حکیم الاسلام کی کوئی اولاد ابھی نہیں ہوئی تھی آپ کی صرف دو لڑکیاں تھیں، اکابر دار العلوم کی دیرینہ خواہش تھی کہ حضرت حکیم الاسلام کو بھی فرزند پیدا ہو، چنانچہ حضرت الاستاذ مولانا محمد سالم صاحب مدظلہ العالی کی پیدائش ہوئی تو اکابر دار العلوم کے حلقہ میں زبردست خوشی محسوس کی گئی اور ہدیہ تبریک پیش کرنے کے لئے ایک وفد حضرت مولانا محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا جسے القاسم میں حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مژدہ جانفزا کے عنوان سے تحریر فرمایا جو اب ایک یادگار ہو گئی جو مندرجہ ذیل پیش ہے

مژدۂ جانفزا !

ہندوستان میں اہلسنت والجماعت کا بڑا طبقہ جس کو صحیح معنیٰ میں شریعت مصطفویہ علی صاحبہا الف الف صلوٰۃ و تحیہ کا حامی اور ہادی کہا جا سکتا ہے دیوبندی جماعت ہے اس جماعت کے قائد رئیس الاتقیاء حضرت مولانا الحاج المولوی محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہٗ تھے اس فقیرانہ زندگی بسر کرنیوالے نے اگر ایک طرف جنید و شبلی (و اولو الشان رحمۃ اللہ علیہم) کے تصوف کیطرف رہنمائی کی تو دوسری طرف ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کی فقہ کو فرمان الٰہی و ارشادات

نبویہ کا مظہر بنایا۔ اپنے بندوں کے حالات، ان کی نیتیں، ان کے قلوب سے علامۃ الغیوب ہی خوب واقف ہے وہی جانتا ہے کہ اس کے مخلص قلب پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اخلاص کا اثر کس طرح پڑ گیا کہ دار العلوم نے جو کہ اس کے ہاتھوں قائم کیا گیا تھا تھوڑی عرصہ میں اپنے فیض یافتہ حضرات سے مشارق و مغارب کو بھر دیا فی الحقیقت اس میں بہت کم مبالغہ ہے کہ منتسبینِ دار العلوم دنیا کے ہر ہر گوشہ میں موجود ہیں۔

مجھ کو اس وقت شمس ارض کے صفات و مناقب بیان کرنے مقصود نہیں ہیں اور فی الحقیقت میری وسعت و ہمت سے خارج ہے مجھ کو صرف ایک خبر سنا کر ان صاحبوں کو مسرور کرنا ہے جو دیوبند اور دار العلوم دیوبند کی مسرت افزا خبر کو سنکر خوش ہوتے ہیں۔ بانیٔ دار العلوم کے صاحب زادے اور میرے محسن و شفیق استاد حضرت مولانا الحاج الحافظ المولوی محمد احمد صاحب حال مہتمم دار العلوم دیوبند۔ سابق مفتی عدالتِ عالیہ عثمانیہ اپنے والد (قدس سرہ) کی اس دینی ودیعت کی حفاظت فرما رہے ہیں۔ آپ کے دو صاحبزادے اور ایک صاحب زادی ہیں۔ بڑے صاحبزادے مولانا مولوی قاری محمد طیب صاحب اور چھوٹے صاحبزادے مولانا قاری محمد طاہر صاحب ہیں۔ اگر کوئی شخص ان دونوں کو اس وقت دیکھتا جب کہ یہ دونوں اپنی صغر سنی کی حالت میں دار العلوم سے اپنے فضل و کمال کی سند حاصل کر چکے تھے تو یقیناً متعجب ہوتا لیکن جن لوگوں نے ان کے علمی شغف کو دیکھا ہے یا اس سے واقف ہیں کہ یہ قاسم الخیرات کے جگر گوشہ ہیں ان کے نزدیک ان کا اس قدر جلد ترقی پر پہونچ جانا نہ لائق تعجب نہ لائق حیرت۔

ان دونوں نونہالوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ چھوٹے صاحبزادے کا ایک دلبند ہے جو اپنے فضائل و عادات میں زائد از حد اشبہ بالاب ہے۔ بڑے صاحبزادے کی دو لڑکیاں ہیں۔ منتسبین دار العلوم دیوبند عموماً اور خدام دار العلوم اور اکابرِ دار العلوم خصوصاً فطری طور پر متمنی تھے کہ اس نونہال کو خداوند عالم فرزند عطا فرمائے خدا کا شکر ہے کہ بتاریخ ۲۳ رجمادی الثانی ۱۳۴۴ھ صبح صادق یہ تمنا پوری ہوئی۔ جمعہ کا دن تھا یہ خبر دار العلوم میں پہونچی اسی وقت ملازمین و مدرسین کا ایک وفد حضرت مہتمم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کاتب سطور بھی اس وفد میں شریک تھا۔

حضرت ممدوح عرصہ سے علیل ہیں اور حد سے زیادہ ضعیف ہو گئے ہیں جب آپ کو اطلاع پہونچی کہ وفد بغرض مبارکباد حاضر ہوا ہے تو آپ بنفسِ نفیس خود تشریف لائے آپ کے چہرہ پر آثار خوشی ظاہر تھے آپ نے اپنی اسی موروثی خندہ پیشانی اور انبساط کے ساتھ کلمات مسرت سے وفد کو مشرف فرمایا جو آپ کو حضرت قاسم الخیرات قدس سرہ سے بطور وراثت ملی ہے۔ دار العلوم کے تمام طلبا اور مدرسین و ملازمین میں یہ خبر پھیل رہی اور ہر شخص کی زبان سے دعائے درازیٔ عمر اور حصول شرفِ دارین نکل رہی تھی۔

کاتب سطور اپنی اور تمام خدام دار العلوم کی طرف سے حضرت استاد مولانا الحاج الحافظ المولوی محمد احمد صاحب کی مبارکباد اور متوسلان دار العلوم کی خدمت میں بشارت مسرت افزا پیش کرتا ہے

فقط (محمد اعزاز علی) منقول از القاسم رجب ۱۳۴۴ھ

متذکرہ بالا نقل کردہ مضمون سے خاندانِ قاسمی کی عظمت و اہمیت کا نقوش و آثار کی ترجمانی ہو رہی ہے اور تاریخی تسلسل کا ثبوت بھی فراہم ہو رہا ہے وہ یہ کہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے علمی و روحانی جانشین آپ کے صاحبزادے بقیۃ السلف مولانا الحافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے صاحبزادے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعد آپ کے صاحبزادہ مفکر اسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب مدظلہٗ علمی و روحانی نیابت کے منصب پر فائز المرام ہوئے حضرت حکیم الاسلام ہی سے بیعت ہیں اور قدوۃ الصلحاء حضرت مولانا عبدالقادر نور اللہ مرقدہٗ کے الہامی اشارے سے حضرت حکیم الاسلام نے آپ کو بیعت و ارشاد کا مجاز کیا۔ اللہ عزوجل آپ کو حضرت حکیم الاسلام کے علوم و معارف اور سلوک و تصوف کے نشر و اشاعت اور تعمیر و تربیت کے مستند ذریعہ کے طور پر قبول فرمائے

(آمین)

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

معصوم سراپا کے دل آویز خطوط !!!!

مولانا شاہین جمالی

تیس برس پہلے مظفر نگر میں میں نے ایک ایسے بزرگ کا جلوہ دیکھا تھا جو اخلاق و کردار سے لیکر رفتار و گفتار تک "فرشتوں کی دنیا کا انسان" یا "انسانوں کی دنیا کا فرشتہ" معلوم ہوتا تھا۔ حضرت اقدس مولانا مفتی عبدالرحیم صاحبؒ تلمیذ رشید حضرت شیخ الہندؒ کے پاس مہینے دو مہینے میں وہ ضرور رونق افروز ہوتے تھے اور جب بھی تشریف لاتے انجانے طور پر دل مسرتوں سے لبریز ہو جاتا۔ آنکھوں میں جیسے ...... کچھ چمک سی آجاتی اور طالب علمانہ حرکت و سکنات میں شوخی و شرارت کی جگہ متانت و سنجیدگی پیدا ہو جاتی اور دل چاہنے لگتا کہ انھیں چپکے چپکے پہروں دیکھتا رہوں اور حقیقت یہ ہے کہ گھنٹوں ان کا شرفِ دیدار حاصل رہتا پھر بھی دل و نظر کے سیر ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا یہاں تک کہ وہ واپس تشریف لے جاتے اور میں جگر کے اس شعر کی صداقت آزمانے کیلئے تنہا رہ جاتا۔

وہ کب کے آئے اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آرہے ہیں وہ جا رہے ہیں

ملکوتی جمال کا یہ پیکر اتنا دلکش، اتنا پاکیزہ اور اتنا زیب نظر تھا کہ بعد وصال بھی اس کے بزرگانہ خدو خال کا قلمی خاکہ اور اس معصوم سراپا کا عکسِ جمیل کاغذ کے صفحہ پر نکہت و نور اور قوسِ قزح بن کر بکھر جانا چاہتا ہے۔

گداز دودھیا بدن حسنِ یوسفؑ کی طرح جلوہ فگن، متوسط قد و قامت جسمانی و روحانی حسن و وقار کی علامت، پاک و صاف سینہ علم و فضل کا سفینہ، بڑی سیاہ آنکھیں، حکمت و دانش کی دو گہری جھیلیں آنکھوں کے حلقوں پر سیاہ سفید بھوؤں کی کمان، تیرگیٔ شام میں نمودِ سحر کا اعلان۔ چوڑی تابناک پیشانی خدا کے حضور سربسجود رہنے کی نشانی۔ روشن چہرہ بدر و ہلال نہیں آفتاب و ماہتاب۔ چہرے کے دائرے پر مشرع سفید داڑھی۔ آئینۂ جمال پر بزرگانہ جلال کی مینا کاری۔ سر پر عالمانہ ہیئت کے کٹے ہوئے سفید بال اور اس پر اونچی دیوار کی دو پلی طیب کیپ گویا ولہ الجوار المنشئٰت فی البحر کالاعلام۔ بدن پر موسم کے مطابق سرد و گرم فسٹ کلر کی شیروانی، نزاکت و نفاست کی کہانی۔ بیش قیمت کپڑے کا لمبا کرتہ اور گول مہری

کا پاجامہ، تراش وخراش اور لباس میں بزرگی کا خبر نامہ، اس قلمی خاکے کی عظیم شخصیت کو دیوبند کے عوام وخواص مہتمم صاحب اور باہر کی دنیا میں لوگ " حکیم الاسلام " کے بلند لقب سے پکارتے تھے وہ منہ کھولتے تو لب گل سے پھول جھڑتے اور جب نہیں بولتے تو صدف میں موتی پلتے تھے۔ ان کے لہجے کا ترنم، شملہ کی پہاڑی ندیوں کا جلترنگ اور کشمیر کے آبشاروں کی موسیقی تھی اور بول بول کی مٹھاس قند وشکر جیسی تھی۔ ان کی تقریر علم وفن کی خشک زمین کے لئے برسات اور تحریر قاری کے دلِ پژمردہ کے واسطے آبِ حیات تھی۔ لفظ لفظ میں علم وحکمت کا گہر اور جملے جملے میں معرفت کا سمندر پوشیدہ ہوتا تھا۔ دو تین گھنٹے کی تقریر دلپذیر، اسرارِ شریعت کی حکیمانہ تعبیر وتفسیر اور کمال یہ کہ ہر ایک کے لئے پر اثر و بے نظیر ہوتی تھی۔ ہر بات میں حکمت اور ہر حکمت میں کوئی بات پیدا کر لینے کی گرانمایہ دولت صرف آپ ہی کے لئے عطیۂ قدرت تھا اور دوسروں کے لئے تو فقط قابلِ رشک وحسرت ہے۔ پنڈت دیانند جی سرسوتی نے حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کی تقریر سنکر کہا تھا کہ ان کی زبان پر سرسوتی (علم کی دیوی) بولتی ہے اور اگر وہ ان کے پوتے حکیم الاسلام کی بات سنتے تو ضرور یہ کہتے کہ ان کے شبد شبد میں سرسوتی رس گھولتی ہے۔

حکیم الاسلام جسمانی روگ کے طبیب نہیں بلکہ لاعلاج روحانی مرضوں کے خاندانی حکیم تھے۔ آپ کے حکیمانہ کلمات نے سیکڑوں دلوں میں ایمان ویقین کا بیج بویا اور ایمان واسلام کے ہزاروں نازک پودوں کو آبِ حکمت سے سیراب کر کے آپ نے تناور درخت بنایا۔ عقلی ونقلی شکوک وشبہات کی ہزاروں گرہیں آپ کے ناخنِ علم وحکمت نے آن کی آن میں کھول دی تھیں۔ حکمتِ قاسمی کی بلندیوں تک آپ کی رسائی اور ان کے علوم ومعارف پر آپ کو عبور اور دسترس حاصل تھی۔ سننے والے جب آپ کی بات سنتے تو سر دھنتے اور مجلس سے اپنی تنگ دامانی کا گلہ لیکر اٹھتے تھے اس لئے کہ ؎

دامانِ نگہ تنگ وگلِ حسنِ تو بسیار
گلچیں بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے ماڈرن ماحول میں آپ کی "سائنس اور اسلام" اور "ڈاروِن کے نظریۂ ارتقا کی جگہ انسانی عظمت کا مسئلہ اور نئی تہذیب وتمدن کی چکاچوند میں" آفتابِ اسلام " کا جلوہ بالکل ہمیشہ نمایاں دکھائی دیتا رہے گا۔

مجھے کچھ معتمد اہلِ علم نے بتلایا کہ ۲۵، ۳۰ برس پہلے میرٹھ شہر کے اندر حکیم الاسلام کی ایک ہفتے کی تقریر سے عوام میں اتنا شدید اسلامی تاثر پیدا ہو گیا کہ ان کی تقریر پر امتناعی حکم لاگو کرنا پڑا۔

حکیم الاسلام کے اندازِ خطاب۔ ان کے اسلوبِ بیان۔ اور تقریر کے لب ولہجہ کو نہ الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے نہ دوسرے کی زبان میں نقل کیا جا سکتا ہے۔ وہ تمام عالم میں اپنے طرز کے منفرد خطیب اور شرعی اسرار وحکم بیان کرنے میں حکیم لبیب تھے۔

مذہبی گروپ اور جماعتی عصبیت سے ان کا مزاج بالکل جوڑ نہیں کھاتا تھا۔ وہ سیاسی پلیٹ فارم پر کسی زمانے میں مسلم لیگ کے حامی ضرور رہے لیکن اس میدان میں بھی تعصب سے دامن بچا لینا ان کی زندہ کرامت ہے۔ اسلامی فرقوں کے درمیان ان کی ذات اتنی معتدل، اتنی متوازن اور اتنی غیر جانب دار رہی کہ دوست دشمن سب ان کی عظمت و بلندی کے معترف تھے۔ جماعتِ اسلامی پر علماء دیوبند کی نکیر بلکہ سیاسی محاذ آرائی کی وجہ سے شدید تنقید و تحریر کے طویل دور میں حضرت مہتمم صاحب کی شخصیت افراط و تفریط سے کبھی آلودہ نہیں رہی اور یکساں طور پر ہر حلقے میں قابلِ احترام بزرگ کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے رہے۔

سیاسی ذہن و شعور کو خدا ہدایت دے کہ اس نے انسانوں کو اتنے مختلف خانوں میں بانٹ دیا ہے کہ ان کا ایک انسانی شرافت اور صالح قدروں کے پیکر میں سمٹ آنا ایک مشکل اور دشوار کام بن گیا ہے۔ تاہم حضرت مہتمم صاحب کی شخصیت مستثنیات میں سے ہے کہ سیاسی دائرہ بندیوں میں بھی آپ اپنی علیحدہ شان اپنا منفرد وقار قائم رکھنے میں کامیاب رہے اور کسی سیاسی جماعت کو آپ کے قول و فعل سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔

جون ۱۹۷۵ء تا ۱۹۷۷ء ایمرجنسی کے تاریک دور میں فیملی پلاننگ کے مسئلے نے جہاں عوام کو جھنجھوڑ رکھا تھا وہیں علماء اس کے جواز و عدم جواز میں دو انتہائی رخ پہ جا رہے تھے عین اس وقت آپ نے اس مسئلہ کو اجتہادی مسئلہ قرار دیکر اہلِ علم و دانش کے لئے غور و فکر کی راہ کھول دی تھی اور اب آئندہ جب بھی اس مسئلہ پر قطعی فیصلہ ہوگا اس میں مہتمم صاحبؒ کے فکر و خیال کی روشنی ضرور پائی جائے گی۔

حضرت مہتمم صاحبؒ کے گنگا جمنی مزاج نے دارالعلوم دیوبند کے مسلکِ اعتدال اور ساری دنیا میں اس کے بزرگوں کی قابلِ تقلید مثال کو استحکام بخشا ہے اور دلوں کی گہرائیوں میں اس کے واسطے جگہ بنائی ہے۔ اب آپ ہی کی شخصیت پندرہویں صدی کے آغاز اور چودہویں صدی کے خاتمہ پر عالمِ اسلام کے لئے فکری قیادت فراہم کر رہی تھی۔ کاش اس تاریخ ساز شخصیت کو سارے عالمِ انسانی کی عمریں لگ جاتیں اور وہ صدی در صدی رہنمائی کے ہر موڑ پر روشنی بکھیرنے کے لئے موجود رہتے۔

حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے صرف مہتمم ہی نہیں بلکہ فتنوں کے سیلاب میں ایک ایسی مضبوط چٹان تھے جس سے ٹکرا کر تمام دھارے خود ہی اپنا رخ پھیر لینے پر مجبور تھے۔ لیکن جس دن سے یہ پہاڑ ٹل گیا ہے سیلاب کا زور تصورات کے بہت سے محلوں کو تنکوں کی طرح بہائے لئے جا رہا ہے۔

ہمیں اردو ادب کی تاریخ سے شکایت ہے کہ کم و بیش ڈیڑھ سو کتابوں کا یہ عظیم مصنف آج بھی ادب کی دنیا میں غیر معروف اور تاریخ ادب کے صفحات میں گمنام ہے حالانکہ اس عظیم صاحبِ قلم اور صاحبِ طرز ادیب کو اس کی خدمات پر اردو ادب کا بلند مقام ملنا چاہئے تھا۔ ہم یہ تو مان سکتے ہیں کہ مولانا طیب صاحب کے قلم میں شبلی کا زورِ بیان اور ابوالکلام آزاد کی شوکتِ الفاظ یا عبدالماجد دریا آبادی کی زبان نہیں مگر ہم یہ تسلیم

نہیں کر سکتے کہ اردو ادب کیلئے ان کی خدمات کسی دوسرے مصنف سے کسی درجہ میں کم ہیں۔ ان کی "آنکھ کی کہانی" خود ان کی زبانی اردو شعر و ادب کا نقش لاثانی ہے۔

میرے نزدیک دارالعلوم دیوبند اور حضرت مہتمم صاحبؒ ایک دوسرے کا صحیح تعارف ہیں۔ اگر کوئی مہتمم صاحب کو جاننا چاہے تو بس اس کے سامنے دارالعلوم کا آئینہ رکھدیجئے، مہتمم صاحب کی علمی، سیاسی، فکری اور عملی اخلاقی زندگی کا ہر ہر گوشہ چمک اٹھے گا اور اگر کسی کو دارالعلوم کے بارے میں معلومات حاصل کرنی ہوں تو اسے مہتمم صاحب کا آئینہ دکھائیے کہ اس میں دارالعلوم کے علم و فن کی پوری کائنات تابناک نظر آئے گی۔

مہتمم صاحب اپنی نرم پالیسی اور شانِ صدیقی کی بنا پر دارالعلوم کے دل کی دھڑکن تھے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ انھوں نے آج تک اپنے قلم سے کسی ادنیٰ ملازم کو بھی برخاست نہیں کیا۔ ان کی اسی ادا پر طلبہ، اساتذہ اور عملہ سب فریفتہ و گرویدہ تھے اور یہی چیز پوری دنیا میں دارالعلوم کو بحیثیت ادارہ ایک مثالی مہتمم کی ناقابلِ فراموش خدمات سے ممتاز کرتی ہے جس کی دوسری کوئی مثال مشکل ہی سے کہیں مل پا دے گی۔

میں نے حضرت مہتمم صاحبؒ سے مشکوٰۃ شریف پڑھی ہے اور مجھے ذاتی طور پر تجربہ ہے کہ مہتمم صاحب چھوٹوں پر شفقت اور ہر ایک کے لئے رافت و رحمت کا مجسمہ تھے۔ ابھی کوئی چار سال پہلے کی بات ہے کہ میں نے اپنے لڑکے محمود الرحمٰن سلمہٗ کی پیدائش کی ایک تقریب میں حضرت کی شرکت کو ضروری سمجھ کر خدمت میں حاضری دی مدعا عرض کیا منظوری عطا ہوگئی پھر کسی ضروری سفر کی مجبوری سے شرکت غیر یقینی ہوگئی تو آپ نے مدرسہ اصغریہ میں مجھے اس کی اطلاع کرائی پھر سفر سے واپسی پر مجھے طلب فرمایا اور خود ایک تاریخ دیکر پچھلے وعدے کی مکمل تلافی فرمادی۔

حضرت مولانا عبدالرحیم کے ساتھ میں دارالعلوم میں داخل ہونے سے بہت پہلے بارہا حاضر ہوا۔ اور طیب منزل کے ملاقاتی کمرے میں جس کی چاروں دیواروں پر آویزاں ملکی و غیر ملکی سیکڑوں سپاس ناموں کی فریم حضرت مہتمم صاحب کی عالمی مقبولیت کا پتہ دیتی تھی۔ گھنٹوں ان سے شرف ملاقات حاصل رہا پھر بھی نگاہ کبھی آسودہ نہیں ہوئی اور دل اندر سے یہ کہتا رہا کہ حضرت مہتمم صاحبؒ کی شخصیت سپاس ناموں کے فریم میں نہیں دل کے آئینہ خانے میں سجانے کے لائق ہے۔

حضرت مہتمم صاحبؒ حیات کی ۸۸ منزلیں طے کر چکے تھے لیکن ضعفِ پیری اور نقاہتِ جسمانی کے باوجود تسلسلِ سفر کا یہ عالم تھا کہ دیوبند میں قیام کا وقفہ ہمیشہ سفر سے مختصر ہی رہتا تھا۔

زندگی خود ایک سفر ہے لیکن اس کی منزل اسلام اور دارالعلوم کے عشق کی معراج تھی اور یقین ہے کہ اس کے صلے میں ان کو جو زندگی ملی ہے وہ موت کے ہاتھوں محفوظ ہے۔ عارفِ شیرازی نے سچ کہا ہے۔

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور

راہِ تصوف

حضرت مولانا حکیم محمد اسلام صاحب ——————— مہتمم جامعہ عربیہ نور الاسلام
خلیفہ حضرت حکیم الاسلام صاحبؒ ——————— شہر میرٹھ

بعض ہستیاں ایسی ہوتی ہیں کہ جو اس دنیائے فانی سے رحلت کے بعد ملک میں ایسا خلا پیدا کر جاتی ہیں جس کا پُر کرنا دشوار و کٹھن ہی نہیں بلکہ ناممکن سا ہو جاتا ہے۔ ایسی ہستیاں عام طور پر ہمہ گیر ہوتی ہیں اور فکر و نظر اور عمل دونوں میں بھی انقلاب آفریں۔ کون نہیں جانتا کہ علم و عمل کی دنیا میں ”خانوادۂ قاسمی“ کا اہلِ زمین پر جو ایک بھاری احسان ہے۔ اس خاندان کے علمی سوتے قصبہ ”دیوبند“ سے پھوٹے اور تمام دنیا میں ہند و پاک، اور بنگلہ دیش، افریقہ، ثمرقند و بخارا، ایران و عرب میں بڑی تیزی کے ساتھ پھیل گئے۔

۱۸۵۷ء میں جب کہ سلطنتِ مغلیہ دم توڑ چکی تھی اور یورپ کا جادو اسلام و ایمان کے لئے خطرہ بن چکا تھا۔ امانت و دیانت، اخلاق و متانت قعر مذلت میں جا پڑی تھی اور انسانیت کس مپرسی کے عالم میں مبتلا تھی ٹھیک ایسے وقت میں اسلام کے نبض شناس حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نور اللہ مرقدہ نے کروٹ لی اور دار العلوم دیوبند کا سنگ بنیاد رکھا اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس ادارہ نے غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل کی جو اظہر من الشمس ہے۔

سیدی و مرشدی و مولائی حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا بھی تعلق اسی خانوادۂ قاسمیؒ سے ہے۔ آپ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ سابق مہتمم دار العلوم دیوبند کے صاحبزادے اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دار العلوم دیوبند کے پوتے تھے۔ آپ آفتاب و ماہتاب بنکر تمام ہندوستان اور بلکہ ایشیا و افریقہ کے اندر چمکے اور اپنے علمی و روحانی تصرفات سے لوگوں کو مستفید کیا۔ آپ کے متوسلین کی بڑی تعداد جنوبی ہند میں ہے۔ بمبئی، مدراس، بنگلور، گجرات، میسور اور مہاراشٹر کے شہروں میں آپ سے بیعت ہونے والوں کی کافی تعداد پائی جاتی ہے حتیٰ کہ یہ سلسلہ ہندوستان تک ہی محدود نہیں بلکہ غیر ممالک میں بھی پھیلا ہوا ہے سعودی عرب، افریقہ، بنگلہ دیش، پاکستان، انگلستان، برما اور ایران کے بکثرت لوگ داخلِ سلسلہ ہیں اور بہت سے حضرات آپ کے مجاز بھی ہیں جن کو آپ سے اجازتِ بیعت حاصل ہے۔

بزرگانِ دین کے میدان خدمتِ دین کے سلسلے میں جدا جدا رہے لیکن حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ ہر میدان کے ہیرو تھے۔ ناظرین پر اگر میرا یہ جملہ بارگذرے تو ذرا وہ تعصب کی عینک اتار کر دیکھیں کہ سیدی و مولائی حکیم الاسلام

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کو اپنی زندگی میں کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے۔ ان کا تعلق ایک مخصوص حلقہ تک محدود نہیں تھا اگر ایک طرف وہ کامیاب واعظ و مقرر تھے تو دوسری طرف وہ بلند پایہ محدث و مدرس بھی تھے۔ نثر نگاری میں ان کو مہارتِ تامہ حاصل تھی تو شعر گوئی سے بھی بسا اوقات وہ دریغ نہ کرتے تھے۔ وہ درویشی و ولایت کا اگر مکمل نمونہ تھے تو وہ اکابر دیوبند کی نشانی بھی تھے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے۔ نبوت توجہ الی الحق و توجہ الی الخلق کی صفت کمال کا نام ہے اور یہی تصوف کی اصطلاح ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ نبی وہ ذات ہے جو ہر وقت حق کی جانب متوجہ رہے اور خلقِ خدا پر بھی نظر رکھے۔ اسی نکتہ میں نبوت کے سارے کمالات و فضائل شامل ہیں تو ظاہر ہے کہ ولایت کو بھی اسی معیار پر پرکھنا پڑے گا تو اب بات صاف ہوگئی کہ ولایت یہ ہے کہ اللہ اللہ بھی ہو اور عوام کی خدمت بھی۔ خدا کی محبت بھی ہو اور بندگانِ الٰہی کا درد بھی۔ آخرت کی فکر بھی سوار ہے اور قوم کا خیال بھی تو آیئے ہم حکیم الاسلام کو اس معیار پر پرکھیں۔ ظاہر ہے وہ ہر میدان میں کامیاب ثابت ہوئے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ حکیم الاسلامؒ صرف ایک عالم ہی نہیں تھے بلکہ وہ درویشی و ولایت کے درجہ پر بھی فائز تھے۔

اس موقع پر اگر میں یہ کہہ دوں تو بیجا نہ ہوگا کہ سیدنا و مرشدنا حضرت حکیم الاسلامؒ علم و فضل میں اس دور کے بخاری و رازی تھے۔ عبادت و ریاضت میں جنید و شبلی تھے اور سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ بیحد متواضع اور خاکسار تھے۔

آپ کے ظاہر و باطن صورت و سیرت اور حسین نورانی چہرہ کو دیکھ کر اللہ یاد آتا تھا۔ عربی کے کسی شاعر نے غالباً آپ ہی کے لئے کہا تھا

کل بیت انت ساکنہ	این محتاج الی السراج
وجہک المامول حجتنا	یوم تاتی الناس بالحجج

تزکیۂ قلب حکیم الاسلام حضرت قاری صاحبؒ نے جب دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی تو تزکیۂ قلب کا خیال دامنگیر ہوا چونکہ اس دور میں سب سے بڑے عالم جماعت دیوبند میں حضرت شیخ الہندؒ تھے لیکن موصوف اس وقت اسیری کی زندگی مالٹا میں گذار رہے تھے۔

۱۳۳۹ھ میں جب آپ ہندوستان تشریف لائے اور دیوبند پہونچے تو حکیم الاسلام حضرت شیخ الہندؒ رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہو گئے اور تقریباً نصف گھنٹے تک حضرت شیخ و مرشد نے کچھ نصائح بیان فرمائیں۔ اس بیعت میں آپ کے ہمراہ آپ کے برادر خورد حضرت مولانا طاہر صاحب بھی شریک تھے مگر اس کے بعد شیخ الہندؒ زیادہ عرصہ تک حیات نہ رہے بلکہ تقریباً چھ ماہ بعد آپ کا وصال ہو گیا۔

اس کے بعد آپ نے اپنا یہ رشتہ اپنے استاد محدث العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے جوڑا۔ شاہ صاحبؒ نے باضابطہ بیعت تو نہیں فرمایا مگر تعلیم دیتے رہے اور یہ سلسلہ کافی دنوں تک قائم رہا۔ لیکن حضرت شاہ صاحبؒ دیوبند چھوڑ کر ڈابھیل تشریف لے گئے تو انقطاع ہو گیا اور حاضری کا مسئلہ پیچیدہ بن گیا۔

حکیم الاسلام حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں

اسی اثناء میں حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی نے بمشورہ حضرت مولانا سعید الدین صاحبؒ بھوپالی ممبر شوریٰ دارالعلوم دیوبند و حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ (والد ماجد حضرت حکیم الاسلامؒ) حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی خدمت میں ایک مکتوب لکھا جس میں غیر مبہم الفاظ میں یہ تحریر تھا۔

"کہ ہماری خواہش ہے کہ مولوی محمد طیب کو آپ کے سپرد کر دیں اور آپ اس کی اصلاح فرمائیں"

اس کے بعد جو حضرت تھانویؒ نے جواب مرحمت فرمایا اس کو ملاحظہ کیجئے۔

"وہ میری اولاد ہے جب چاہے آجائے لیکن اصول یہ ہے کہ وہ اپنے بارے میں خود لکھے۔

چنانچہ خود حضرت حکیم الاسلام کا بیان ہے۔

"جب ان حضرات کا ایما ہوا تو میں نے حضرت والا کی خدمت میں ایک خط لکھا اور اس میں وابستگی کی درخواست کی حضرت والا نے جواب میں تحریر فرمایا۔

"کسی کی سفارش کی ضرورت نہیں جب بھی فرصت ہو فوراً آجاؤ"

ادھر رمضان شریف کا مہینہ آگیا۔ اخیر عشرہ تھا کہ میں حضرت تھانویؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دس یوم میں تراویح کے اندر قرآن شریف پورا کیا اور حضرت تھانویؒ نے تعلیم و تربیت شروع فرمادی تو پھر میرا تعلق حضرت سے مضبوط ہوتا چلا گیا۔ کئی سال بعد میں نے ظاہر فرمایا کہ حضرت بیعت بھی فرمالیں تو فرمایا۔ "کہ ضرورت تو ہے نہیں" مگر پھر بیعت بھی فرمالیا۔

خرقۂ خلافت

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی تعلیم و تربیت رنگ لائی اور آپ کی روحانیت کا حکیم الاسلام حضرت مہتمم صاحبؒ پر وہ اثر ہوا کہ آپ روحانیت کے اعلیٰ مقام پر پہنچے چنانچہ بارہا اس راقم نے حکیم الاسلامؒ کی زبانی سنا۔

"کہ حضرت تھانویؒ کی برکت اور ان کے روحانی فیض سے متعدد بار جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو خواب میں دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔

اس طرح آپ کی روحانیت کی تکمیل حاصل ہوئی اور آپ کو بیعت کرنے کی اجازت بھی تحریری طور پر حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے مرحمت فرمادی۔ چنانچہ ہند و پاک اور دیگر ممالک میں بکثرت علماء و صلحاء آپ سے سلسلۂ بیعت رکھتے ہیں۔ حضرت حکیم الاسلامؒ نے ایک موقعہ پر فرمایا۔

"کہ اصل چیز تو علوم ہیں جن پر عمل کر کے آدمی آگے پہونچتا ہے اس کے بعد حضرت نے ارشاد فرمایا کہ تصوف کی راہ میں ایک مبتدی ہوتا ہے اور دوسرا منتہی۔ مبتدی کا کام تو یدور مع الحق ہے یعنی جس طرف حق ہو وہ اسی طرف چلے اور منتہی کا کام یہ ہے کہ جدھر یہ چلے ادھر حق چلے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جدھر

عمر چلتے ہیں ادھر حق چلتا ہے تو یہ انتہائی مقام ہے۔

تو اس پر کسی صاحب نے سوال کیا کہ علم تو خود تزکیہ کرتا ہے پھر بیعت کی کیا ضرورت ہے کہ حضرت سیدی و مرشدی حکیم الاسلام نے جواب میں ارشاد فرمایا۔

مدکہ علم خود تزکیہ نہیں کرتا وہ صرف راستہ دکھلاتا ہے تزکیہ تو دوسری چیز ہے جیسے علم طب تو اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ ادویہ کی خاصیتیں معلوم ہوں گی اور ایک ہے مطب۔ ظاہر ہے کہ جب تک طبیب نبض نہ دیکھے اور مزاج کو نہ پہچانے، موسم کا لحاظ نہ کرے اس وقت تک وہ نسخہ تجویز نہیں کر سکتا۔ تو تعلیم طب اور چیز ہے مطب اور چیز۔ تعلیم میں تو صرف علم سامنے آتا ہے اور تربیت میں اتباع کی ضرورت پڑتی ہے۔

چنانچہ حضرت تھانوی کا قول ہے کہ طالب علم کا کام یہ ہے کہ خوب چون وچرا کرے یعنی یہ مسئلہ کیسے ہے اور کیوں جب تک مسئلہ نہ سمجھ لے استاد کو چلنے نہ دے اور تزکیہ نفس میں چون وچرا کی گنجائش نہیں جو شیخ کہدے وہ طالب کو کرنا پڑے گا۔ خواہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے چنانچہ میرے شیخ حکیم الاسلام مریدین کو ہدایت کرتے تھے۔

اخلاق کاملہ پیدا کرو، اعمال صالحہ اختیار کرو۔ عقائد حقہ کے عادی بنو، حق راستہ یہی ہے کہ قرآن وسنت کا دامن ہاتھ میں رہے اور اہل اللہ کا دامن بھی ہاتھ میں ہو یہی اعتدال کا راستہ ہے۔ اور اسی میں ہدایت ہے۔

عارف ربانی حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ نے ایک جگہ ارشاد فرمایا۔

،، کہ ہمارے اکابر کے یہاں رشد وہدایت کے طریقے مختلف رہے چنانچہ مشائخ کا طریقہ اور تھا علماء کا اور محققین کا طرز اور تھا فقہاء کا اور صرف انداز کا فرق تھا۔ ان حضرات نے اپنے اپنے حال کے مطابق ڈھنگ متعین کرلئے اور قوم وملت کی خدمات میں مصروف ہوگئے تو ظاہر ہے ان کو اسی لحاظ سے پرکھا بھی جائے مثلاً تبلیغی جماعت نے ایک ڈھنگ متعین کیا تو آپ انھیں پرکھیں۔ اس لحاظ سے وہ اس میں پورے اتر رہے ہیں یا نہیں؟ اگر آپ ان کو دوسرے معیار سے پرکھیں گے جو ان کے موضوع میں داخل نہیں تو یہ آپ کی غلطی ہوگی مثلاً سنار کو پرکھا جائے اس اعتبار سے کہ وہ سونا کیسے گھڑتا ہے زیور کیسے بناتا ہے تو درست ہے اور اگر آپ اس کو لوہار کے معیار پر جانچنے لگیں تو یہ آپ کی بھاری غلطی ہوگی ایسے ہی لوہار کو اس کے معیار پر پرکھا جائے نہ کہ سنار کے معیار پر بعینہ اسی طرح مدارس بھی ہیں انھیں جانچا جائے تعلیم کے معیار سے۔ کیا تعلیم ہو رہی ہے نصاب پورا ہوتا ہے یا نہیں، طلبہ استاد کی تقریر سمجھتے ہیں یا نہیں، اساتذہ اپنے حقوق کی ادائیگی کر رہے ہیں یا نہیں، نہ کہ اس معیار سے کہ انھوں نے کتنے گشت کیے، کتنے چلے دئیے کیونکہ یہ ان کا موضوع ہی نہیں۔

تو حضرت حکیم الاسلام کا جذبہ یہ تھا کہ ہر آدمی دین کی خدمت میں لگ جائے۔ طبیب اپنے طب کے ذریعہ اس خدمت کو انجام دے کیونکہ مریض اس سے متاثر ہوں گے۔ تاجر اپنی تجارت کے ذریعہ دین کی خدمت کو اپنا اصول بنائے اور لوگوں کو بتلائے کہ یہ بیع فاسد ہے اور یہ بیع باطل۔ جب یہ جذبہ عام ہو جائے گا تو ظاہر

رہے لوگوں میں دینداری بھی عام ہوگی اور اعمال صالحہ بھی پیدا ہوں گے۔

آپ کا مزاج تھا کہ احکام دین کو عقلیت و نقلیت کے رنگ میں پیش کرتے تھے اور فرماتے تھے۔ کہ جب تک دین کو عقلی و نقلی دونوں رنگ میں پیش نہ کیا جائے تو اس وقت تک لوگوں کا مزاج اس کو قبول نہیں کرتا۔ چنانچہ آپ کی تحریر و تقریر میں بھی یہی رنگ نظر آتا ہے اور اسی انداز سے آپ اصلاح فرماتے تھے۔ یہ تھا آپ کا تصوف اور یہی طریق اصلاح تھا حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا جیسا کہ حجۃ اللہ البالغہ میں تصریح موجود ہے۔

سیدی و مرشدی حضرت حکیم الاسلامؒ کا فرمان ہے۔

کہ عالم بے عمل بدقسمت، عالم باعمل غیر مخلص بدقسمت، اور جو شخص صالحین کی صحبت میں بیٹھا اور ادب نہ سیکھا وہ بدقسمت ہے۔

افسوس ہے کہ جمادی الثانی ۱۳۱۵ھ میں جو آفتاب علم و عرفان طلوع ہوا تھا وہ ۸۸ سال بعد ۱۴۰۳ھ میں ہمیشہ کیلئے غروب ہوگیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حقیقت یہ ہے کہ حکیم الاسلامؒ کی موت سے شریعت و طریقت کی عظمت مٹ گئی۔ علماء دیوبند کی ساکھ کو بھاری دھکا لگا۔ مسلک دیوبند پر خزاں آگئی علم و عرفان کی بزم سونی ہوگئی۔ دارالعلوم دیوبند اپنے ساٹھ سالہ خادم سے محروم ہوگیا سلوک و تصوف کی خانقاہ اجڑ کر رہ گئی۔

بہت دشوار ہے مسلم کو قومی رہنما بننا ۔۔۔ بباطن خود گھٹنا اور بظاہر رہنما بننا

کیا تاریخ اس حقیقت کو فراموش کرسکتی ہے؟ یہ حکیم الاسلامؒ کی جامع شخصیت کے چند نقوش ہیں۔ جب کوئی اللہ کا نیک بندہ اس ولی کامل اور عالم ربانی کے حالات پر کچھ لکھنے بیٹھے گا تو وہ صحیح معنیٰ میں بتائے گا کہ

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ کون تھے؟

حق تعالیٰ حضرت کو اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے اور ہم ناکاروں کو آپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

حکیم الاسلام کی حکیمانہ باتیں!

جناب مولانا عبدالعزیز صاحب قاسمی استاد حدیث جامعہ عربیہ نور الاسلام شہر میرٹھ

ملت اسلام کا تھا تو درخشاں آفتاب
غیر ممکن ہے کہ اب پیدا ہو تیرا پھر جواب

فخر الاماثل، حکیم الاسلام، شیخ المشائخ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہٗ علم وعمل، اخلاق وصداقت کے ایک بہترین اور نادر نمونہ تھے۔ حضرت سلطان الاولیاء خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ سے لیکر قطب العالم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نور اللہ مرقدہٗ کی ذاتِ اقدس تک جو سلسلہ چلا آرہا تھا جس کو فقیہ زماں، حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی صاحب برد اللہ مضجعہٗ نے جوں کا توں لیکر کتاب و سنت کی روشنی میں منشاء الٰہی کے مطابق اس کو ایک حسین وجمیل صورت عطا فرمائی اور اس کا صحیح مجسمہ حضرت اقدس حکیم الاسلام رحؒ کی ذاتِ اقدس تھی۔

اس فقدان الرجال کے دور میں صبر وضبط اور حلم وتحمل کا یہ عالم تھا کہ اپنے تو اپنے اغیار بھی معاملہ پیش آنے کے بعد معترف ومعتقد ہوئے بغیر نہیں رہ سکے اور یہی وجہ تھی کہ صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم بھی ان کی شرافت نفس کے قائل تھے۔

؎ یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار ورسن کہاں

استاذ المحترم حضرت حکیم الاسلامؒ نے شرافت ودیانت قسام ازل سے غایت درجہ پائی تھی نظریاتی اختلاف کو ہنسی خوشی برداشت کر لیتے۔ دل میں اپنے حریف کی جانب سے ذرا بھی میل نہ لاتے بلکہ اپنے معاند یا سب وشتم کرنے والوں کی طرف سے بھی کبھی دل تنگ نہ ہوتا اور موقعہ میسر آئے تو ہمدردی اور مروت، رواداری برابر اس کے ساتھ کرتے رہتے۔ اس قدر عالی ظرفی اور تحمل کا مادہ ہر ایک انسان کے بس کا کام نہیں۔ "ان ذالک لمن عزم الامور"

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ "دیوبند" کے ایک مقامی اخبار نے کچھ حضرت رحمۃ اللہ کے خلاف لکھ دیا، اخبار کا اڈیٹر اغیار کے ہاتھوں بری طرح بک گیا تھا اور کچھ وہ اپنی عادت سے بھی مجبور تھا۔ "جبل گردد جبلت نہ گردد" اسکا اثر ہوا یہ کہ دیوبند کی عوام بگڑ گئی اور عمائدین شہر اور علماء کی ایک خاص جماعت حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اجازت چاہی کہ اخبار کے ایڈیٹر کو کوئی ایذا پہونچائی جائے یا اس کے پریس کو خرد برد کیا جائے تو حضرت نے بڑی سنجیدگی اور متانت کے لہجہ میں فرمایا! "مجھے برا بھلا کہنے میں یا لکھ دینے سے اگر

کسی کی رو ٹیاں سیدھی ہو رہی ہوں تو تمہارا کیا حرج ہے۔

حاضرین آپ کا یہ جملہ سنکر انگشت بدنداں رہ گئے اور آگے کچھ کہنے کی جرأت بھی نہ ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ آپکے یہاں غیبت اور بغض و عناد نام کا بھی نہیں تھا اور یہی وجہ ہے کہ ان کے متوسلین بھی صالح اور راسخ العقیدہ ـــــ نظر آتے ہیں اور آپ کا یہ دلی اللہی رنگ آپ کے خلفاء اور معتقدین میں بھی ملتا ہے اور اس کی زندہ جاوید مثال میرے کرم فرما سیدی و مولائی حضرت مولانا حکیم محمد اسلام صاحب دامت برکاتہم جو حضرت کے خلیفہ اور جامعہ عربیہ نور الاسلام میرٹھ کے سربراہ اور مہتمم ہیں۔ ان کی عالی ظرفی اور حلم و بردباری سے کون انکار کر سکتا ہے جن لوگوں نے حکیم صاحب کو دیکھا ہے وہ میری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ موجودہ دور میں حکیم صاحب اسلاف کی نشانی، تواضع عجز و انکساری اور رافت قلبی کا ایک بہترین نمونہ ہے کبھی کبھی اپنی مجالس میں فرماتے ہیں:

"ہمارے پاس کچھ نہیں ہے جو کچھ ہے وہ حضرت مہتمم صاحب کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔

کون نہیں جانتا کہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی علمی و روحانی شعاعیں عرب و عجم اور ہند و پاک کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی پھیلی ہوئی ہیں اور آپ کے مستفیضین کی تعداد شمار و حساب سے خارج ہے یہ اگر آپ کی زندہ کرامت نہیں تو اور کیا ہے؟

وہ جنید دورِ حاضر وہ طریقت کا امام وہ زمانہ کا غزالی فخر رازی، نیک نام

آپ کے یہاں آیات کتاب اللہ و احادیث نبویہ کی تشریحات دلائل اور دلنشیں انداز میں اور شرعی مسائل و احکام کی علتیں بکثرت ملتی ہیں۔

گذشتہ سال حضرت رحمۃ اللہ علیہ میرٹھ تشریف لائے "خیر نگر" میں حکیم محمد ادریس صاحب کے یہاں قیام تھا معلوم ہونے پر یہ راقم بھی حاضر خدمت ہوا۔ حضرت ایک رسالہ کے مطالعہ میں مشغول تھے۔ سلام و مصافحہ کے بعد برابر کی چارپائی پر بیٹھ گیا اور یہ فکر سوار ہوا کہ آغازِ سخن کس طرح کر سکوں تاکہ کچھ استفادہ ہو سکے۔ تھوڑی دیر کے وقفہ کے بعد میں نے حضرت کی جانب میں نے حضرتؒ کی جانب پان بڑھایا تو حضرت نے پان قبول کرتے ہوئے فرمایا

"پان مفرح قلب ہے اور حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے تو اس کو کھانے کی مسواک کہا ہے۔

اور مجھے تو پان بھی کھانا نہیں آتا تھا حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے سکھا دیا"

اس پر سلسلۂ سخن دراز کرتے ہوئے میں نے دبے الفاظ میں عرض کیا کہ سنا گیا ہے کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ تو آپ کا بیحد احترام فرماتے تھے۔ جواباً ارشاد فرمایا۔

جی ہاں بظاہر تو کوئی خوبی اس وقت نہ تھی اور نہ اب ہے ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ حضرت شاہ صاحب علامہ انور شاہ کشمیری اور حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمہما اللہ کی تربیت میری والدہ نے کی ہے اور یہی وجہ تھی کہ یہ دونوں بزرگ میرے اہل خانہ کا بہت احترام کرتے اور حضرت مدنی نے تو بارہا عجز و انکساری کے لہجے میں ارشاد فرمایا کہ میں اس در کا کتا ہوں اور وہ مجھ سے بہت محبت و شفقت کا معاملہ کرتے چنانچہ پاکستان

جب میں دوبارہ دارالعلوم میں حاضر ہوا تو مولانا مدنیؒ نے بیساختہ مجھ سے فرمایا، "کہ آپ دارالعلوم کے محتاج نہیں ہیں دارالعلوم آپ کا محتاج ہے۔

تو ظاہر ہے یہ سب ان کی شفقت اور رحمت ہی تھیں۔

تبدیل موضوع اختیار کرتے ہوئے دوسرا میرا سوال یہ تھا کہ حضرت کافرین کو دنیا میں راحت و آرام اور مومنین کے لئے سوائے مصائب و آلام کے کچھ نہیں اس کی کیا وجہ ہے؟

تو آپ مسکراتے ہوئے فرمانے لگے اس میں کیا حرج ہے۔ بظاہر تو اس میں کوئی نقصان ہے نہیں۔ حق تعالیٰ کی حکمت اسی میں ہے اور اسی میں بندہ کو راضی رہنا چاہئے۔ پھر اپنے مخصوص حکیمانہ انداز میں فرمایا۔

"کہ دراصل صورت ایسی ہے کہ انسان کو حق تعالیٰ نے دو قسموں میں بانٹ دیا ہے۔ ایک کافر، دوسرے مومن اور زندگی بھی حق تعالیٰ نے دو ہی رکھی ہے ایک دنیا کی اور دوسرے آخرت کی۔ تو دنیا کی راحتیں کافر کو عطا کیں اور آخرت کی مومنین کو۔ اگر کافر کو دنیا کی نعمتیں نہ دی جاتیں تو وہ بیچارہ محروم رہتا آخرکار وہ بھی تو اللہ کی مخلوق ہے اور آخرت کی نعمتوں سے اس کو محروم رکھا جائے گا بخلاف مومنین کے کہ ان کو آخرت کی نعمتوں سے سرفراز کیا جائے گا۔

گذشتہ سال ہی کا واقعہ ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ دہلی کے "پنتھ ہسپتال" میں زیر علاج تھے۔ میرٹھ کے ایک وفد حضرت حکیم محمد اسلام صاحب کی قیادت میں دہلی پہنچا جس میں حکیم محمد الیاس صاحب کھوروی کے علاوہ مولانا عبدالستار صاحب مدرس مدرسہ نورالاسلام اور دیگر احباب بھی شریک تھے اور یہ بندہ بھی۔ آپ کافی لاغر اور کمزور ہو چکے تھے۔ ڈاکٹروں نے بولنے پر پابندی عائد کر دی تھی۔ ڈاکٹروں کے حکم سے آپ کے کمرے کے دروازے پر بھی ہسپتال کی جانب سے لکھ دیا گیا تھا "گفتگو کرنا منع ہے"۔

بہرحال اس وفد نے ـــــــ حضرت کی عیادت فرمائی۔ حکیم صاحب سے کچھ مختصر گفتگو بھی ہوئی۔ اسی اثنا میں آپ کی پوتی اور حضرت مولانا محمد سالم صاحب مدظلہ کی صاحبزادی آگئیں تو حضرت ان سے گفتگو کرنے لگے کہ اتنے میں ایک "نرس" آئی اور اس کا منشا یہ تھا "کہ آپ گفتگو نہ کریں" اور حضرت کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

"کہ آپ کے روم پر بھی لکھا ہوا ہے کہ بات کرنا منع ہے"۔

اس پر حضرت مہتمم صاحب نے برجستہ کہا

"کہ وہ میرے لئے نہیں بلکہ آنیوالوں کے لئے ہے"۔

آپ شادی میں ہوتے یا غمی میں تکلیف میں ہوتے یا راحت میں مگر زائرین کو کبھی احساس نہ ہونے دیتے بلکہ اپنی طویل گفتگو اور حکیمانہ باتوں سے ان کی دلجوئی فرماتے۔ تفکرات کا آپ پر کتنا ہی ہجوم ہوتا۔ ہموم و غموم کی کتنی ہی یورش ہوتی مگر عالم یہ تھا کہ تبسم زیر لب۔ غالباً اردو کے کسی شاعر نے آپ ہی کے بارے میں کہا تھا۔

کانٹوں میں ہے گھرا ہوا ہے چاروں طرف سے پھول ‌ ‌ ‌ پھر بھی کھلا ہی پڑتا ہے کیا خوش مزاج ہے

سن تو مجھے یاد نہیں ہاں البتہ مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند میں وہ زمانہ طالب علمی تھا کہ حضرت حکیم الاسلام حج بیت اللہ سے تشریف لائے۔ آپ کی زیر صدارت تحتانی دارالحدیث میں "جمعیۃ الطلبہ" کی جانب سے ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں آپ نے تقریر فرمائی اور اپنے سفر حج کے حالات بتلائے۔ منجملہ ان واقعات کے آپ نے فرمایا۔

کہ ایک روز میں مسجد حرام میں بیٹھا ہوا اپنے معمولات میں مشغول تھا اور کثیر تعداد میں زائرین حج تشریف فرما تھے کہ اچانک ایک سائل آیا اور عاجزی و انکساری کے لہجے میں سوال کرنے لگا اور پھر وہ غائب ہو گیا تو میں نے عرض کیا

ہم سب کو اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیے حق تعالیٰ نے اس شخص کو بھیجکر ہم کو متنبہ کیا ہے کہ یہاں جس قدر بھی عاجزی و انکساری اختیار کروگے اسی قدر ملے گا، خاموش رہنے سے کوئی اپنی مراد کو نہیں پہونچتا ہے سائل جب تک سوال نہیں کرتا تو اس وقت تک اس کی جھولی میں بھیک نہیں ڈالی جاتی تو ظاہر ہے ایسے ہی جب تک اللہ کے سامنے عاجزی و انکساری کا اظہار نہیں ہوگا اس سے مانگا نہ جائے گا تو عنایات ربانی کا نزول کیسے ہوگا۔

اللہ اکبر۔ کیا شان تھی اس ذات ستودہ کی جس کے قدم قدم میں عبرت ہر لمحہ غور و فکر سے معمور ہر بات حکمت و معرفت سے منور ۱۴۰۲ھ اوائل شعبان میں حضرت مولانا حکیم محمد اسلام صاحب مہتمم جامعہ عربیہ نورالاسلام میرٹھ کی دعوت پر ختم بخاری شریف کے جلسہ میں آپ تشریف لائے اور بخاری شریف کی آخری حدیث "کلمتان حبیبتان" پر محققانہ کلام فرمایا، ابتدا میں بیٹھتے ہی خطبہ مسنونہ کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا۔

"کہ آج تو میں ہی بخاری ہوں"

سامعین حیران کہ یہ جملہ کیسے استعمال فرمایا۔ لیکن پھر ارشاد فرمایا کہ اس میں "ہی" لسبتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ میں دو تین یوم سے بخار میں مبتلا ہوں صرف وعدہ کی بنا پر حاضری ہو گئی ہے اور چونکہ میں بخار میں ہوں۔

"لہٰذا بخاری آج میں ہی ہوں"

اس کے بعد خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی المیزان کو حسی مثال دیکر سمجھایا کہ دو کلمے زبان پر ہلکے پھلکے لیکن میزان عمل کے اندر وزنی اور بھاری ہوں گے جیسے "باپوڑ کے پاپڑ" یہ دیکھنے میں انتہائی درجہ کے خفیف اور ہلکے ہیں لیکن معدہ جاکر یہ ثقیل اور غیر معمولی وزنی اور بھاری ہو جاتے ہیں۔

آپ کی عارفانہ اور حکیمانہ باتوں میں آپ کے جد امجد حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ و حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ کا رنگ غالب تھا یہ آپ کے اس خاص پہلو کی مختصر روئیداد تھی۔ ع

کوتہ نتوان کرد کہ ایں قصہ دراز ست

کل تک ہم جس ذاتِ گرامی سے آیات قرآنی کی تفسیر و احادیث نبویہ کی تشریح حکیمانہ انداز میں سنتے تھے افسوس کہ آج وہ زیر زمین محو خواب ہے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ جس بزرگان دین کی امانت کو اور حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ جس خزانۂ علم کو اور حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ جس مرشد کامل کو ہمارے سپرد کر گئے تھے ہم نے اپنے ہاتھوں اُسے زیر زمین دفن کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اللھم اغفرہٗ وارحمہٗ واسکنہٗ فی اعلی الجنان
آمین یارب العلمین

مکتبہ اثریہ کے آئندہ کے چند منصوبے

(۱) ایک ٹریڈل ٹائپ پریس کا قیام۔
(۲) مکتبہ اثریہ کے لئے مستقل عمارت کی تعمیر۔
(۳) ایک عربی اور ایک اردو رسالہ کی اشاعت۔
(۴) اسلاف کی منتخب تصانیف کا مختلف زبانوں میں ترجمہ۔
(۵) مکتبہ اثریہ کی مطبوعات کو عالمی زبانوں میں شائع کرنا۔
(۶) ایک مستقل جائزہ کمیٹی کا قیام جو عصری جدید مسائل کا غائر نظر سے مطالعہ کرے۔
۷ اور ان مسائل کا حل پیش کرے۔
(۸) عربیہ کیلئے ایک تربیت گاہ کا قیام جس میں فضلاء کرام کو دعوت و تبلیغ
کیا جا سکے۔
کے نام سے ایک عربی درسگاہ کا قیام جسمیں عربی زبان ذریعہ

قاری صاحبؒ کا وصفِ خطابت

مولانا قاری امیر احمد صاحب مظاہری مہتمم مدرسہ مظہر العلوم میرٹھ

خطابت اور تقریر انسان کا اعلیٰ جوہر ہے اس کا منتہائے کمال یہ ہے کہ سامعین مسحور ہو کر رہ جائیں جیسا کہ حدیث میں آتا ہے ان من البیان لسحرا یعنی بعض بیان سحر و جادو کا حکم رکھتے ہیں۔ یہ کمال کم ہی کسی کو حاصل ہوتا ہے۔ حضرت حکیم الاسلام کو قدرت کی طرف سے یہ کمال بھی انتہائی درجہ میں عطا فرمایا گیا تھا۔ ہزاروں اور لاکھوں کے مجمع میں گھنٹوں آپ کا بیان ہوتا تھا لیکن خوبی یہ کہ نہ آپ تکان محسوس کرتے اور نہ مجمع تھکتا نہ اکتاتا پورا مجمع گوش بر آواز اور تصویرِ حیرت بن کر متوجہ رہتا اور کانّھم علی رؤسھم الطیور کا منظر ہوتا پھر مضامین ہر قسم کے، ہر ذوق اور ہر مسلک کے لوگوں کیلئے وجہ تسلی اور موجب تشفی،

مجھے یاد آتا ہے کہ سنہ ۱۹۴۸ء میں جب امریکا اور برطانیہ کی سازش سے حکومت اسرائیل قائم ہوئی اور تمام دنیائے اسلام نے اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ہڑتال اور جلسے کر کے اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا تو میرٹھ میں بھی سخت احتجاجی جلسہ ہوا اور جلوس نکلا شہر کی وسیع جامع مسجد میں نماز جمعہ کے بعد جلسہ ہوا جس میں بے پناہ مجمع تھا، حضرت حکیم الاسلامؒ نے اس جلسہ میں تقریر فرمائی اور اس وقت کے مناسب حال عجیب و غریب تقریر فرمائی کہ جس سے سامعین پر کبھی وجد و حال کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور کبھی جوش و خروش میں مجمع بے قابو ہو جاتا تھا۔ بعد نماز جمعہ جو تقریر شروع ہوئی تو عصر کی اذان پر آپ نے تقریر ختم کرنا چاہا مگر مضمون کی آمد اور تسلسل نے سامعین پر اس قدر محویت اور دلچسپی پیدا کر دی تھی کہ مجمع مضمون کی تکمیل کیلئے بے تاب تھا، چنانچہ آپ نے مجمع کے جذبات کی رعایت کرتے ہوئے بعد نماز عصر پھر تقریر شروع فرما دی یہاں تک کہ مغرب کی نماز کا وقت آگیا اور پھر بھی مضامین کی آمد جاری تھی آپ نے تقریر ختم کرنا چاہا تو پھر مجمع بے قابو ہو گیا اور مزید بیان کی خواہش ظاہر کی۔ آپ نے فرمایا کہ چونکہ مجھے اسی گاڑی سے دیوبند جانا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کسی موقعہ پر اہل میرٹھ کی خواہش پوری کروں گا تب مجمع مطمئن ہوا۔

مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کا سالانہ جلسہ سنہ ۱۹۴۷ء سے قبل بڑی شان و شوکت سے ہوتا تھا۔ غالباً سنہ ۱۳۵۰ھ میں جو راقم سطور کی طالب علمی کا زمانہ تھا اسی شان کے ساتھ جلسہ ہوا، آخری نشست میں شہر کی جامع مسجد میں جلسہ کا منعقد ہوا وقت کے تمام اکابر اور علماء موجود تھے۔ جن میں حضرت مولانا مدنیؒ، حضرت مولانا الیاس صاحبؒ حضرت رائے پوری، حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحبؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اس مجمع میں حضرت حکیم الاسلامؒ

موجودہ علماء میں سب سے صغیر السن تھے معمول کے مطابق حضرت اسعد اللہ صاحبؒ نے تحریک صدارت کرتے ہوئے قرعۂ فال حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دار العلوم دیوبند کے نام پر ڈالا، چاروں طرف سے تائید و مزید تائید ہوئی، چنانچہ آپ اسٹیج پر تشریف لائے جلسہ کی کارروائی سے پہلے آپ نے صدارت کی تحریک و تائید پر معذرت کرتے ہوئے نہایت عاجزانہ انداز میں تقریر فرمائی جسمیں خاص طور پر اس تاریخی واقعہ کا ذکر کیا کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں پیش آیا تھا جسمیں اہل شام عیسائیوں نے اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے قلعہ کی کنجیاں حوالہ کرنے کیلئے یہ شرط لگائی تھی کہ امیر المومنین خود بنفس نفیس آئیں چنانچہ حضرت عمرؓ خود ایک غلام کو ہمراہ لیکر اور اونٹ پر سوار کر شام پہونچے اور راستہ میں باری باری ایک منزل پر خود اونٹ پر سوار ہوتے تھے اور غلام اونٹ کی مہار پکڑ کر آگے چلتا تھا اور دوسری منزل غلام اونٹ پر سوار ہوتا تھا اور آپ اونٹ کی مہار پکڑ کر آگے آگے چلتے تھے اور پھر ملک شام پہونچنے کے وقت غلام کی باری اونٹ پر بیٹھنے اور امیر المومنین کی باری اونٹ کی مہار پکڑنے کی تھی غلام کے اصرار کے باوجود بھی حضرت عمرؓ اس کیخلاف کرنے پر راضی نہ ہوئے آپ نے فرمایا یہی صورت موجودہ علماء کی موجودگی میں میری صدارت کی ہے اس واقعہ کو آپ نے ایسے دل نشیں اور موثر انداز میں فرمایا کہ چاروں طرف سے سبحان اللہ کی آوازیں داد و تحسین کی صورت میں بلند ہو رہی تھی اور مجمع پر محویت کی کیفیت طاری تھی۔

ایک مرتبہ آپ علیگڈھ یونیورسٹی میں تشریف لیگئے وہاں آپکی تقریر کا پروگرام تھا تقریر کا موضوع فلسفہ اور سائنس تھا یونیورسٹی کے بڑے بڑے سائنسداں، پروفیسر اور لکچرار حضرات کا مجمع تھا آپنے سائنس کے حقائق اس کے فوائد، اور نقائص پر ایسی بے نظیر تقریر فرمائی کہ ان لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں اور بے ساختہ بول اٹھے کہ یہ باتیں تو ہمارے وہم و گمان اور حاشیہ خیال میں بھی نہیں آئی تھی آپ کی تقریر کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ قصبہ شاہجہانپور ضلع میرٹھ میں بابو الہام اللہ صاحبؒ نے آپکو آموں کی دعوت کیلئے مدعو کیا آپکی آمد پر مجمع کافی ہو گیا مجمع کی خواہش ہوئی کہ حضرت مختصر تقریر فرمادیں آپ نے لفظ "الہام" پر تقریر فرمائی جسمیں علوم و معارف کے دریا بہادیئے اور مجمع انگشت بدنداں ہو کر رہ گیا۔

ایک مرتبہ مدرسہ بیت العلوم اکلر خانپور ضلع میرٹھ کے جلسہ میں تشریف لائے طبیعت ناساز تھی معذرت کرتے ہوئے چند منٹ فضائل علوم پر تقریر فرمائی وہ ایسی عجیب و غریب تھی کہ آج تک اس کی لطافت اور شیرینی محسوس ہوتی ہے۔

کئی سال گذرے حضرت والا ہمارے مدرسہ مظہر العلوم شونددت کے سالانہ جلسے میں تشریف لائے مہمانان جلسہ میں ایک شاعر کوثر قریشی بھی میرٹھ سے تشریف لائے تھے کوثر صاحب نے نہایت جوش الحانی کے ساتھ ایک نعت پڑھی حضرت والا اس نظم سے اس قدر متاثر ہوئے کہ آپ نے اسی نظم کو موضوع بنا کر کئی گھنٹے تک پر بہترین تقریر فرمائی الغرض خطابت کا کمال صانع قدرت نے آپکو ایسا عطا فرمایا تھا کہ اس کی مثال موجودہ دور میں دور دور تک نظر نہیں آتی یہ اللہ کی دین ہے۔ سچ کہا ہے۔ ے

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

فاتح بمبئی اس سلسلہ میں ایک واقعہ بہت ہی عجیب یاد آیا اسکو بیان کر کے اس موضوع کو ختم کرتا ہوں۔
بمبئی قدیم سے اہل بدعت کا مرکز رہا ہے علماء دیوبند سے اہل بدعت نے وہاں کے مسلمانوں کو اس قدر بدظن اور متنفر کر رکھا تھا کہ نہ صرف یہ کہ انکی تقریر سننا گوارا نہ کرتے تھے۔ بلکہ اگر کوئی دیوبندی عالم وہاں کی مسجد میں پہونچ جاتا تو مسجد کو دھلواتے تھے اور اگر کسی نے بھولکر کسی دیوبندی عالم سے مصافحہ کرلیا تو ہاتھوں کو صابن سے دھوتے تھے بہت سے اکابر علماء دیوبند کی وہاں توہین و تذلیل بھی ہوئی یہ بدترین عمل وہاں کے مسلمانوں کا ایک مدت تک رہا اسی دوران اور انہی حالات میں ایک مرتبہ حضرت حکیم الاسلامؒ وہاں تشریف لیگئے اور وہاں آپکی تقریر کا اعلان ہوا تو اہل بدعت نے آپکے خلاف ایک قدآدم پوسٹر شائع کیا جسمیں لکھا تھا کہ کفار دیوبند میں یہ شخص اکفر الکفار ہے کیونکہ دیوبند کے تمام بڑے بڑے کفار سے اسکو نسبت حاصل ہے حضرت شیخ الہند کا مرید ہے، حضرت تھانویؒ کا مجاز ہے، حضرت علامہ کشمیریؒ کا مشہور شاگرد ہے اور حضرت نانوتویؒ کا سگا پوتا ہے، اس لئے اسمیں ساری نسبت کفریہ جمع ہیں سنی بھائیوں کو چاہیئے کہ اسکی صورت بھی نہ دیکھیں ورنہ ایمان کے سلب ہو جانیکا خطرہ ہے عجیب اتفاق کہ یہ پوسٹر ہی اس جلسہ میں (جس میں آپکی تقریر ہونیوالی تھی) لوگوں کی غیر معمولی حاضری کا سبب بن گیا لوگوں نے کہا کہ دیکھنا تو چاہیئے کہ اتنے بڑے کافر کی شکل وصورت کیسی ہوگی اور وہ کیا کیا کفریہ باتیں لوگوں سے کریگا اس وعظ میں اتنا بڑا مجمع ہوا کہ بمبئی کی تاریخ میں اتنا بڑا (لوگوں کا بیان ہے) دیکھنے میں نہیں آیا پرانے قبرستان کے میدان میں جلسہ تھا تاحد نظر پورا میدان انسانوں سے بھرا ہوا تھا لوگوں کا محتاط اندازہ ہے کہ تیس چالیس ہزار کا مجمع تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا بمبئی ٹوٹ پڑا ہے اس روز آپکا وعظ تقریباً تین گھنٹے ہوا۔ مجمع پر سکون طاری تھا آپ حسب دستور مثبت انداز میں تقریر فرمارہے تھے آیات قرآنی احادیث نبوی کے حوالے، اکابر اولیاء اللہ کے واقعات اور اپنے اسلاف و اکابر کی خدمات کا تذکرہ بڑے موثر انداز میں بیان فرمارہے تھے سامعین نے غیر معمولی اثر لیا اور پورے بمبئی میں مشہور ہوگیا کہ اگر علماء دیوبند ایسے ہوتے ہیں تو پھر ان سے بہتر کوئی ہو ہی نہیں سکتا اور نتیجہ یہ نکلا کہ ان محلوں سے تقریر کی دعوتیں آنی شروع ہوگئیں جو خالص مخالفین علماء دیوبند کہلاتے تھے پھر انتیس دن تک مدوزانہ آپکی تقریریں بمبئی کے مختلف محلوں میں ہوتی رہیں جنمیں عوام وخواص کا بڑا مجمع رہتا تھا اس پر علامہ حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند نے حضرت حکیم الاسلامؒ کو فاتح بمبئی کا خطاب عطا فرمایا۔

آپکی تقریر کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ حالات کتنے ہی ناساز گار اور ماحول کتنا ہی ناخوشگوار ہو کوئی دل آزار کلمہ زبان سے نہیں نکالتے تھے، چنانچہ پچھلے سال ۱۹۸۲ء کی بات ہے کہ آپ ہمارے یہاں مدرسہ کے جلسہ سالانہ میں تشریف لائے حالانکہ یہ وقت تھا کہ جب ایک گروہ نے دارالعلوم پر قبضہ کرلیا تھا آپنے دوران تقریر میں کوئی لفظ اس گروہ کے حق میں اپنی زبان سے نہ نکالا بلکہ صرف یہ فرمایا کہ دارالعلوم دیوبند بیمار ہے جسطرح انسان کو بیماری لاحق ہوتی ہے اداروں کو بھی مرض لاحق ہو جاتا ہے اور جسطرح جب کوئی انسان بیمار ہوتا ہے تو اس کے حق میں دعائے صحت کی جاتی ہے آپ بھی دارالعلوم کی صحت کے لئے دعا کیجئے"

یہ ہے انسانی شرافت اور عالی ظرفی کا بہترین نمونہ اور تسلیم ورضا و سلامتی کا اعلیٰ مقام جو اہل اللہ ہی کا حصہ ہے

خدمات و کارنامے

مولانا سید طاہر حسین صاحب گیاوی

قاری صاحب کے دور میں دار العلوم کی رفتارِ ترقی!!

قاری صاحب اور منصب اہتمام

۱۳۳۹ھ کے اواخر میں مجلس شوریٰ نے نائب مہتمم دوم کا عہدہ تجویز کیا اس کیلئے قاری محمد طیب صاحب نامزد کئے گئے اس وقت صدر مہتمم حافظ محمد احمد صاحب اور نائب مہتمم مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی تھے ان دونوں بزرگوں کو اپنی پیرانہ سالی کے باعث کسی مناسب جوان عمر مہتمم کا تعاون درکار تھا جس کی وجہ سے مجلس شوریٰ نے قاری طیب صاحبؒ کو تجویز کیا چونکہ یہ کام قاری صاحبؒ کے علمی اور تدریسی ذوق کے مناسب نہ تھا اس لئے آپ نے تدریسی خدمات میں لگنا چاہا اور ذمہ داری سے علیحدہ ہو گئے مگر بزرگوں کی فہمائش اور تقاضہ سے مجبور ہونا پڑا اور نیابت اہتمام کو قبول کر کے اس کی ذمہ داریوں میں مصروف ہو گئے مجلس شوریٰ کی مذکورہ بالا تجویز کی رو سے قاری صاحبؒ ۱۳۴۱ھ تا اوائل ۱۳۴۸ھ اس عہدہ پر فائز رہے تاریخ دار العلوم صفحہ ۲۰۸

اسی درمیان مہتمم دار العلوم حافظ محمد احمد صاحب کا انتقال ۱۳۴۷ھ ۳ رجمادی الاول کو ہو گیا اور اس کے ٹھیک چودہ ماہ کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن صاحب بھی ۴ رجب ۱۳۴۸ھ کو رحلت فرما گئے رحمہما اللہ رحمۃ واسعۃ علامہ شبیر احمد عثمانی جو ۱۳۴۶ھ میں دار العلوم سے ڈابھیل چلے گئے تھے تو مولانا تھانوی اور دوسرے اکابر کے ارشاد پر ۱۳۵۴ھ میں دار العلوم دیوبند تشریف لائے اور ۱۳۶۲ھ تک صدر مہتمم کے عہدہ پر فائز رہے اگرچہ اس دوران علامہ عثمانی کا تعلق جامعہ ڈابھیل سے بھی قائم رہا بلکہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں علامہ عثمانی کا قیام زیادہ رہتا تھا جس کی وجہ سے دار العلوم کے معاملات کی انجام دہی میں دشواریاں پیش آتی تھیں اس کے پیش نظر قاری صاحب کی طرف مہتمم کے جملہ اختیارات منتقل کرنے پڑے اور ۱۳۶۲ھ میں علامہ عثمانی مستعفی ہو گئے اس کے بعد سے ۱۴۰۱ھ تک باضابطہ منصب اہتمام قاری صاحبؒ کی ذات خاص کے ساتھ وابستہ رہا اس طرح نیابت اہتمام کا زمانہ الگ کر دینے کے بعد بھی قاری صاحب تریپن سال کی طویل مدت تک دار العلوم دیوبند کے باقاعدہ مہتمم رہے اس نصف صدی کے طویل زمانۂ اہتمام میں نیابت اہتمام کے سات سال بھی شمار کر لئے جائیں تو پھر قاری صاحب کے اہتمام کی مدت تقریباً ساٹھ سال ہو جاتی ہے اس لئے دار العلوم کی عمر کی نصف سے زائد مدت کی تاریخ قاری صاحب کے اہتمام سے وابستہ ہے جس کا انکار تاریخ دار العلوم کے نصف حصہ کے انکار کے مرادف ہوگا قاری صاحبؒ کے اہتمام کا زمانہ دار العلوم کے سب سے زیادہ دراز اور طویل المیعاد اہتمام کا زمانہ ہونے کے ساتھ ہی ساتھ دار العلوم کی ہمہ جہتی ترقی

شہرت اور عروج کا زمانہ بھی ہے اس لئے دارالعلوم کی تاریخ قاری صاحب کی خدمات کو کسی طرح فراموش نہیں کر سکتی۔

قاری صاحب کے دورِ اہتمام کے سرپرست دارالعلوم

دارالعلوم دینی درسگاہ ہونے کے علاوہ ایک تربیتی ادارہ بھی ہے اس لئے قیام دارالعلوم کے بعد سے ہی مجلس شوریٰ کے علاوہ جماعت کے روحانی پیشوا کی سرپرستی بھی اس کو ہمیشہ حاصل رہی ہے اسی قدیم روایت کے تحت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ جو اس وقت جماعت کے پیشوا تھے وہ دارالعلوم کے سرپرست بھی تھے قاری صاحب کے دورِ اہتمام کے ابتدائی سالوں میں ہی ایک قابل ذکر تبدیلی یہ ہوئی کہ حضرت تھانویؒ نے دارالعلوم کی سرپرستی سے استعفا پیش کر دیا اور مجلس شوریٰ نے اس کو منظوری دے دی اس کے بعد سے دارالعلوم آج تک جماعت کے کسی روحانی پیشوا کی سرپرستی سے محروم ہے لیکن اس حادثہ کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ مجلس شوریٰ کے اختیارات میں اضافہ ہوا اور اس کو بلا شرکت غیرے

قاری صاحب کا اہتمام اور مجلس شوریٰ کی بالادستی

دارالعلوم کے خود مختار سرپرست کی حیثیت حاصل ہو گئی اس طرح قاری صاحبؒ کے دورِ اہتمام کی پہلی ترقی کا ثمرہ مجلس شوریٰ کے ہاتھ آیا اس لئے کہ اس تبدیلی کی بنیادی وجہ مجلس شوریٰ کے حدود اختیار کی توسیع اور اس کی بالادستی ہی کو قرار دیا گیا ہے جیسا کہ تاریخ دارالعلوم جلد اول ص ۲۸۶ کے درج ذیل الفاظ میں اس امر کی صراحت کی گئی ہے سرپرست کے اختیارات کا حاصل یہ تھا کہ ممبران میں اختلاف رائے کی صورت میں سرپرست کی رائے کے مطابق فیصلہ ہوتا تھا اس میں خواہ سرپرست کی رائے ثلث ہی کی جانب کیوں نہ ہو البتہ اگر ممبران متفقہ طور پر کسی چیز کو پاس کرتے اور سرپرست کو اس سے اختلاف ہوتا تو وہ وجوہ اختلاف کو مدلل تحریر کر کے مجلس میں دوبارہ غور و خوض کیلئے بھیج دیتے تھے اس صورت میں اگر مجلس اپنی سابقہ رائے سے رجوع نہ کرتی تو البتہ مجلس ہی کی رائے برقرار رہتی تھی اور بغیر رضائے سرپرست اس کا نفاذ ہو جاتا تھا۔

۱۳۴۵ھ میں جب انتظامی امور کے لئے قوانین مدون ہوئے تو مندرجہ بالا طریق کو باضابطہ بنا دیا گیا مگر ۱۳۴۹ھ میں کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ اس بارے میں مجلس شوریٰ کے اندر اختلاف رائے پیدا ہو گیا ایک جماعت کی رائے تو اس طریق عمل کی حمایت میں تھی اور دوسری جماعت اس کو مجلس شوریٰ کی بے کسی اور عدم ضرورت سے تعبیر کرتی تھی اور فیصلہ کا مدار کثرت رائے پر رکھنا چاہتی تھی چنانچہ مجلس شوریٰ کے متعدد اجلاسوں میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جو ۱۳۳۴ھ سے دارالعلوم کے سرپرست تھے از خود مصلحتاً سرپرستی سے مستعفی ہو گئے رجب ۱۳۵۴ھ میں مجلس شوریٰ نے حسب ذیل الفاظ میں یہ استعفا منظور کر لیا مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس پورے غور و فکر اور احترام و تقدیس اور عظمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضرت مولانا تھانوی مدظلہ کے استعفیٰ کو نہایت افسوس کے ساتھ منظور کرتا ہے اور حضرت ممدوح سے درخواست کرتا ہے کہ اپنی دعوات

صالح اور توجہات عالیہ سے دارالعلوم پر ہمیشہ ظل گستر رہیں گے۔ تاریخ دارالعلوم جلد ۱ ص ۲۸۶

قاری صاحبؒ کا اہتمام اور دارالعلوم کا دستوری مسلک

دارالعلوم دیوبند کا ایک مرکزی دینی درسگاہ ہونے کی حیثیت سے صرف تقلیدی اور جامد نظریات کا حامل ادارہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک مستقل مکتب فکر ہے روز اول سے اس کے فضلاء میں ایک قسم کا مجتہدانہ ذہن اور ایک خاص فکر پایا جاتا ہے فقہی لحاظ سے حنفی ہونے کے باوجود اکابر علمائے دیوبند کا مشرب ولی اللہی قاسمی اور رشیدی تھا اور دارالعلوم کے تمام فضلاء کے اندر عملاً ان نسبتوں کے آثار و خصائص پورے طور سے موجود تھے لیکن دارالعلوم کے آئین کے اندر اس کی کوئی قانونی حیثیت تھی اور نہ ہی اس کی تنقیح و توضیح ہو پائی تھی اور نہ عام طور سے فضلاء اپنی تحریروں میں اپنے نام کے ساتھ اس کا اظہار ہی کیا کرتے تھے قاری صاحبؒ کے دور اہتمام کا بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس میں دارالعلوم کا آئینی مسلک و مشرب منقح ہو کر تفصیل و تشریح کے حدود میں داخل ہوا اور عموماً تمام فضلاء نے اپنی اس نسبت خاصہ کا لفظ قاسمی سے اظہار کرنا شروع کیا قاری صاحبؒ کے دور اہتمام کے پہلے اس درجہ مسلک دارالعلوم کی تنقیح و توضیح یا اس کا واضح طریقہ سے اظہار فضلائے دارالعلوم کے اندر خاص لفظ قاسمی کے ذریعہ اس کثرت کے ساتھ تحریروں میں نہیں ملتا ہے چنانچہ پہلی مرتبہ شعبان ۱۳۶۸ھ میں دستور اساسی دارالعلوم دیوبند جس کے مطابق آج تک دارالعلوم کا سارا نظام چلتا ہے اس میں ان الفاظ میں مسلک کی منظوری دی گئی ہے۔

دارالعلوم دیوبند کا مسلک اہل سنت والجماعت حنفی مذہب اور اس کے مقدس بانیوں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہما کے مشرب کے موافق ہوگا دستور اساسی دارالعلوم دیوبند ص ۴ دفعہ ۴

دارالعلوم کا یہ مسلک اس درجہ ضروری قرار پایا کہ ارکان شوریٰ سے لیکر ادنیٰ ملازم اور طالب علم تک کیلئے اس کی حفاظت و پابندی ضروری قرار دے دی گئی چنانچہ دستور اساسی میں اس امر کو ان الفاظ میں واضح کر دیا گیا ہے۔

دارالعلوم کے مسلک کی حفاظت تمام ارکان و متعلقین دارالعلوم کا فرض ہوگا کسی ملازم دارالعلوم یا طالب علم کو اجازت نہ ہوگی کہ وہ کسی ایسی انجمن یا ادارے یا جلسے میں شرکت کرے جس کی شرکت دارالعلوم کے مسلک یا مفاد کیلئے مضر رساں ہو دستور اساسی دارالعلوم دیوبند ص ۶ دفعہ ۷

دارالعلوم کے اسی آئینی و دستوری مسلک کی تعیین و تنقیح کا سہرا بھی قاری صاحبؒ اور ان کے دور اہتمام کے سر ہے اس لئے کہ ان کے پہلے یا ان کے ہم عصر بزرگوں میں سے کسی کی تحریر میں بالاستقلال اس کی تشریح و تنقیح پر اتنا مواد یا اتنی توجہ نہیں پائی جاتی تھی کہ قاری صاحبؒ کی تحریروں میں مسلک دارالعلوم کو منقح اور واضح کیا گیا ہے قاری صاحبؒ کے الفاظ میں اسی مسلک کے سات بنیادی اصول ہیں جن سے یہ مسلک مرکب ہے (۱) علم شریعت (۲) پیروی طریقت (۳) اتباع سنت (۴) فقہی حنفیت (۵) کلامی ماتریدیت (۶) دفاع زیغ و ضلالات (۷) ذوق قاسمیت و رشیدیت۔

مسلک دارالعلوم کے ان سات اجزاء ترکیبی کی تشریح و توضیح قاری صاحب کی مختلف تحریروں میں دیکھی جا سکتی ہے

قاری صاحب کا اہتمام اور دارالعلوم کی تعمیری ترقی

اس وقت دارالعلوم کی جو عمارتیں موجود ہیں ان کی دو قسمیں ہیں ایک وہ عمارتیں ہیں جنکی تعمیر خود دارالعلوم نے کی ہے اور دوسری وہ عمارتیں ہیں جو کسی صاحب خیر کی طرف سے تعمیر شدہ حالات میں وقف کی گئی ہیں دارالعلوم کی صرف وہ عمارتیں جو عام مسلمانوں کے تعاون سے خود دارالعلوم نے تیار کی ہیں اگرچہ یہ سب کی سب ایک ہی احاطہ میں واقع نہیں ہیں لیکن ان کا مجموعی رقبہ ۹۲ (بانوے ہزار مربع فٹ) سے بھی بہت زیادہ نکلتا ہے ان عمارتوں کی اجمالی فہرست یہ ہے۔

(۱) نودرہ (۲) دارالطلبہ قدیم (۳) مسجد دارالعلوم (۴) کتب خانہ (۵) دارالحدیث تحتانی (۶) فارسی خانہ (۷) دار جدید احاطہ مولسری (۸) احاطہ دفتر اہتمام (۹) احاطہ باغ (۱۰) دارالتفسیر (۱۱) دارالحدیث فوقانی (۱۲) دارالافتاء (۱۳) احاطہ مطبخ (۱۴) مہمان خانہ (۱۵) دارالاساتذہ (۱۶) باب الظاہر (۱۷) جامعہ طبیہ (۱۸) افریقی منزل قدیم (۱۹) افریقی منزل جدید (۲۰) عقب دارالعلوم (۲۱) عقب دارالتربیۃ (۲۲) دارالشفا یا دارالعلوم پریس (۲۳) رواق خالد

اس فہرست میں سے آخر الذکر عمارت موجودہ مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کے اہتمام میں تیار ہوئی ہے اسی طرح بالا فہرست میں سے قاری صاحب کے اہتمام سے پہلے صرف پہلی دو عمارتیں موجودہ صورت میں مکمل تھیں اس فہرست کی اول الذکر چھ عمارتیں قاری صاحب کے اہتمام سے پہلے وجود میں آچکی تھیں اگرچہ بیشتر عمارتیں ناقص و ناتمام تھے جیسا کہ مختصر تفصیل کے ذریعہ اس کی وضاحت کی جائیگی ان عمارتوں کے علاوہ باقی تمام عمارتیں قاری صاحب کے دور اہتمام کی یادگار ہیں اگر دارالعلوم کی کل تعمیر کو ایک روپیہ فرض کر کے تقسیم کیا جائے تو بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ چودہ آنے سے بھی کچھ زائد تعمیر قاری صاحب کے دور اہتمام کا حصہ قرار پائے گی۔

قاری صاحب کے اہتمام سے قبل کی جو تعمیریں ہیں ان کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

(۱) نودرہ۔ یہ دارالعلوم کی سب سے پہلی عمارت ہے جس کی بنیاد ۲ر ذی الحجہ سنہ ۱۲۹۲ھ کو حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے دست مبارک سے ڈالی گئی اور جس کی بنیاد میں ایک ایک اینٹ حضرت نانوتوی حضرت گنگوہیؒ حاجی عابد حسین اور میاں جی منے شاہ نے بھی اپنے ہاتھوں سے رکھی تھی لیکن اس کی تعمیر کا سلسلہ سنہ ۱۲۹۳ھ سے شروع کیا گیا اس لئے مادۂ تاریخ اشرف عمارات سنہ ۱۲۹۳ھ نکلتا ہے نودرہ کے ساتھ اس احاطہ میں دارالعلوم کا تاریخی کنواں بھی اسی وقت تیار کیا گیا تھا یہ مولانا رفیع الدین صاحب علیہ الرحمہ کے اہتمام کا زمانہ تھا نودرہ کی عمارت کا طول ۳۶ گز اور عرض ۱۲ گز ہے اس کی مدت تعمیر آٹھ سال اور خرچ ۲۳۰۰۰ ہے تاریخ دارالعلوم ج ۱ ص ۱۸۵

نودرہ کی صرف ایک منزل جو اس وقت تیار کی گئی تھی اس کے اندر ۳۶×۲۵ مربع فٹ کے تین ہال ہیں ان کے سامنے ایک طویل دالان بھی ہے یہی وہ عمارت ہے جس کی بنیاد کا نقشہ ایک مشہور خواب کے ذریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنایا ہے اسی نودرہ کی بالائی منزل پر دارالحدیث فوقانی ہے جس کی بنیاد اگرچہ سنہ ۱۳۲۹ھ ہو چکی

ڈال دی گئی تھی لیکن بعد میں رائے بدل جانے کے سبب سے پہلے تحتانی دارالعلوم کی تعمیر شروع کی گئی اور اس کی تکمیل کے بعد فوقانی دارالحدیث قاری صاحب کے زیر اہتمام ۱۳۵۲ھ ۱۹۳۳ء میں تیار کیا گیا جو ۶۸×۵۲ مربع فٹ کا ایک وسیع ہال ہے دارالطلبہ قدیم اسی نودرہ کے بالمقابل جانب شرق ہیں دارالاہتمام یا دارالمشورہ ہے اور اس کے دونوں جانب اسی طرح نودرہ کے شمال و جنوب میں طلبہ کے رہائشی کمرہ اور درسگاہیں جو احاطہ مولسری یا دارالطلبہ قدیم کے نام سے معروف ہیں یہ کمرے دارالاہتمام سمیت ۱۳۱۶ھ تا ۱۳۱۸ھ میں بارہ ہزار روپئے کی لاگت سے تیار ہوئی ہیں تاریخ دارالعلوم ج ۱ ص ۲۰۶ اس تعمیر کے وقت حافظ محمد احمد صاحب کے اہتمام کا زمانہ تھا اس کا مادۂ تاریخ جائے عجیب و غریب ہے ۱۳۱۵ھ۔

مسجد دارالعلوم

دارالعلوم کی تین مسجدیں ہیں ایک مسجد چھتہ کے نام سے معروف ہے دوسری دارالعلوم کی مسجد ہے تیسری ریلوے اسٹیشن کی مسجد ہے مسجد چھتہ وہی قدیم مسجد ہے جس کے صحن میں انار کے درخت کے نیچے سے تاریخ دارالعلوم کی پہلی صبح نمودار ہوئی یہ مسجد اگرچہ زمانہ قدیم کی تعمیر ہے لیکن اس کی تجدید و توسیع اور اس کے حجرہ قاسم وغیرہ کی نئی تعمیر بھی قاری صاحب کے زیر اہتمام ۱۳۹۹ھ میں ہوئی ہے البتہ دارالعلوم کی مسجد قاری صاحب کے اہتمام سے قبل تعمیر ہوئی ہے ۱۴ ربیع الاول ۱۳۲۷ھ ۱۹۰۹ء کو اس مسجد کی تعمیر کیلئے بورانڈیر کے حاجی علام محمد اعظم نے انیس ہزار روپے دئے تھے اسی سے سنگ بنیاد رکھا گیا اس کی تکمیل ۱۳۲۸ھ میں ہوگئی جیسا کہ شیخ الہند کے بنائے ہوئے مصرعۂ تاریخ: در مدرسہ خانقاہ دیدیم: سے ظاہر ہے لیکن اس مسجد کی بالائی منزل صحن کی توسیع اور اس کے احاطہ میں شمال و جنوب کے کمرے اور شرقی جانب میں دارالافتاء وغیرہ تمام عمارتیں قاری صاحب کے ہی اہتمام میں تعمیر ہوئی ہیں ریلوے اسٹیشن کے قریب دارالعلوم کے واردین و صادرین اور عام مسافر مسلمانوں کی سہولت کیلئے ۱۳۴۳ھ میں ایک مسجد اور اس کی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے بعض دکانوں کی تعمیر ہوئی۔ اس تعمیر پر اس وقت پانچ ہزار روپے خرچ ہوتے تھے اس وقت میں اس مسجد کا معاملہ کس طرح انجام پاتا ہے مجھے نہیں معلوم لیکن ابتداء میں یہ مسجد بھی دارالعلوم ہی کے زیر انتظام تھی اور اس کی تعمیر دارالعلوم نے ہی کرائی تھی (تاریخ دارالعلوم ج ۱ ص ۲۳۱)

کتبخانہ کی عمارت!

موجودہ کتب خانہ کی عمارت سے پہلے یہ کام نودرہ کے بعض جنوبی کمروں سے لیا جاتا ہے لیکن ضرورت ایک مستقل عمارت کی متقاضی تھی اس کام کیلئے ابتداءً نواب یوسف علی خاں صاحب رئیس مینڈھو نے سات ہزار روپے عنایت کئے اس کے بعد میرٹھ کے بعض اہل خیر نے بھی تعاون کیا اور ۲؍صفر ۱۳۲۳ھ کو اس کا سنگ بنیاد رکھدیا گیا اور ربیع ۱۳۲۵ھ ۱۹۰۷ء میں اس کی تعمیر ہوئی شروع میں یوسفی کتب خانہ کے نام سے اس کی شہرت تھی اس وقت صرف ایک بڑا ہال اور ایک کمرہ تعمیر ہوا تھا اس کے بعد ۸ کمروں اور دو بڑے ہال کا اضافہ ۱۳۸۶ھ اور ۱۳۹۶ھ میں ہوا ہے احاطہ کتب خانہ کی مذکورہ بالا دو منزلہ عمارت کے علاوہ جملہ تعمیریں قاری صاحب کے زیر اہتمام عالم وجود میں آئی ہیں۔

دارالحدیث تحتانی ۳۰ ربیع الآخر ۱۳۳۰ھ کو دارالعلوم کے طلبہ نے پورے خوش وخروش کے ساتھ اس کی بنیادیں کھودیں اور حضرت شیخ الہند مولانا خلیل احمد انبیٹھوی حضرت عبدالرحیم صاحب رائے پوری حضرت تھانوی نے بنیاد رکھیں اور تمام شرکائے اجلاس نے بھی دو دو اینٹیں رکھیں تاریخ دارالعلوم ج ۱ ص ۲۳۶ دارالحدیث کے ہال کا طول ۶۸ فٹ ہے اور عرض ۲۵ فٹ ہے اس کے گرد وپیش ۱۳×۱۲ در سگاہیں ہیں سنگ بنیاد کے بعد ہی سے تعمیر کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا ملک کے ہر گوشہ سے اہل خیر حضرات اپنا اپنا تعاون پیش کررہے تھے کہ اسی سلسلہ میں نواب سلیم اللہ خاں رئیس ڈھاکہ نے دارالعلوم سے ایک وفد کیلئے دعوت نامہ کے ذریعہ درخواست کی دارالعلوم سے علامہ کشمیری علامہ عثمانی حضرت مدنی اور حضرت چاندپوری پر مشتمل ایک وفد ۱۳۳۲ھ میں ڈھاکہ نواب صاحب کے پاس پہونچا نواب صاحب نے ایک اجلاس منعقد کیا اور لوگوں کو اس کام کی طرف متوجہ کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اپنے خاندان کی طرف سے تیرہ ہزار کی رقم پیش کی اور مزید رقم آئندہ بالاقساط بھیجنے کا وعدہ کیا لیکن قاری صاحب نے جس وقت اہتمام کی ذمہ داریوں کو اپنے ہاتھ میں لیا تھا یہ عمارت بھی نامکمل تھی اس لئے کہ ۱۳۳۸ھ ۲۰ رمضان المبارک کو شیخ الہند مالٹا سے رہا ہوکر دیوبند آئے تو سب سے پہلے اسی دارالحدیث کے ہال میں تشریف لائے تھے اس وقت تک دارالحدیث کے چھت کی تعمیر نہیں ہوسکی تھی جیسا کہ تاریخ دارالعلوم کے درج ذیل بیان سے واضح ہے۔

اسٹیشن سے حضرت مولانا محمود حسن صاحب علیہ الرحمہ) اولاً مدرسہ میں تشریف لائے دارالحدیث کے سب سے بڑے اور غیر مسقف کمرہ میں تخت پر تشریف فرما ہوئے تاریخ دارالعلوم ج ۱ ص ۲۵۲

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دارالحدیث کے تعمیر کا مرحلہ پایہ تکمیل تک نہ پہونچ سکا تھا چنانچہ دارالحدیث کی تعمیر قاری صاحب کے اہتمام کے اندر ۱۳۴۹ھ میں بہمہ وجوہ مکمل ہوگئی۔

دار جدید دارالعلوم کو جو خدا داد مقبولیت ابتداء سے حاصل تھی اس کی وجہ سے طلبہ کا رجوعہ دن بدن حیرت انگیز طریقہ پر بڑھتا جارہا تھا اور ان کی کثرت اصول ہشتگانہ کی روشنی میں مطلوب بھی تھی لیکن دارالاقامہ کی موجودہ وسعت اس کے لئے ناکافی تھی اس ضرورت کے پیش نظر دار جدید کا سنگ بنیاد ۱۳۳۸ھ ۱۹۱۹ء میں رکھدیا گیا تھا قاری صاحب کے اہتمام سے قبل صرف پانچ کمرے شمال مغرب میں اس کے تعمیر ہوسکے تھے اور مزید باون کمروں کی تجویز تھی قاری صاحب نے ۱۳۵۶ھ میں حاجی مرشد صاحب وغیرہ کی محنت سے ایک عشرۂ رمضان کے اندر مدارس سے ۴۷ ہزار روپئے اس کام کیلئے فراہم کئے جس کے ذریعہ تعمیر مکمل ہوئی اس کے بعد ۱۳۵۷ھ میں قاری صاحب نے افغانستان کا سفر کیا وہاں پچاس ہزار افغانی روپیہ کا شاہی عطیہ دارالعلوم کو ملا جس کے ذریعہ مجلس شوریٰ کی تجویز کے مطابق ۱۳۵۹ھ میں باب الظاہر کی تعمیر ہوئی۔ اسی تعلق سے ۱۳۷۷ھ میں دارالعلوم کی دعوت پر افغانستان سے ظاہر شاہ تشریف لائے۔

اسی طرح دار جدید کی تعمیر میں پیش رفت ہوتی رہی یہاں تک کہ ۱۳۴۶ھ ۱۹۲۵ء میں یہ سلسلہ پایۂ تکمیل کو پہونچ گیا۔

دار جدید میں ایک سو نو کمرے ہیں ہر کمرہ تقریباً ۱۰×۱۱ فٹ ہے اور تمام کمروں کے سامنے اونچی اونچی محرابوں کا دالان بھی ہے دار جدید کا کل رقبہ ۵۰۰×۲۶۱ مربع فٹ ہے اس کے بعد قاری صاحب کے اہتمام کے آخری سالوں میں دار الاقامہ کے بالائی منزل پر بھی اتنے ہی کمرے تیار ہو گئے تمام تعمیروں پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالنے کی نہ اس مختصر مضمون میں گنجائش ہے اور نہ ہی اس کی چنداں ضرورت ہے اس لئے کہ مذکور الصدر عمارتوں کی تعمیر میں بوضاحت بالا جو کام قاری صاحب کے دور اہتمام میں ہوا ہے اس سے باقی تعمیرات کا اندازہ لگانا کچھ مشکل کام نہیں ہے بالخصوص اس صورت میں کہ دار العلوم کی باقی تمام تعمیریں از اول تا آخر قاری صاحب کے ہی اہتمام میں تیار ہوئی ہیں جن میں دار التفسیر مہمان خانہ دار الاساتذہ اور جامعہ طبیہ کی عمارتیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں اس جگہ یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ بعض جزوی تعمیر مثلاً جنریٹر کی عمارت اور جشن صد سالہ یا دوسرے مواقع پر جو وقتاً فوقتاً تجدید و مرمت کا کام ہوا ہے وہ فہرست مذکورہ بالا میں داخل نہیں ہے

دار العلوم کی مالی ترقی

کسی ادارہ کی مالیات کا اندازہ لگانے کیلئے اس کی تعمیری ترقیوں کی تفصیلات بہت کافی ہیں اس لئے تعمیری ترقی کے بعد یہ بتانے کی کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ دار العلوم نے مالی لحاظ سے قاری صاحب کے اہتمام میں کیا ترقی کی ہے دار العلوم کے سالانہ آمد و خرچ کا جو گوشوارہ تاریخ دار العلوم میں دیا گیا ہے اس کی روشنی میں قاری صاحب کے اہتمام سے قبل سنہ ۱۳۴۸ھ میں آمد ۵۰۲۶۲ ہے اور خرچ [illegible] ہے اس آمدنی میں قاری صاحب کے دور اہتمام میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا حتیٰ کہ سنہ ۱۳۸۰ھ میں ۵۹،۱۲ روپئے گوشوارہ کے اندر آمد دکھائی گئی ہے لیکن دار العلوم کی مالی ترقی میں قاری صاحب کے اہتمام کے آخری دس سالوں میں غیر معمولی اضافہ ہوا جس کا اندازہ اس بات سے بآسانی لگ جاتا ہے کہ سنہ ۱۴۰۰ھ میں دار العلوم کا بجٹ ۳۰ لاکھ کے قریب ہو جاتا ہے جیسا کہ دفتر اجلاس صد سالہ کی طرف سے شائع کردہ رسالہ۔ دار العلوم کے ۱۱۷ سال کے۔ درج ذیل بیان سے واضح ہے۔

اس وقت دار العلوم کا مالی بجٹ تقریباً ۳۰ لاکھ ہے جو مسلمانوں کے عام چندوں سے پورا ہوتا ہے کم و بیش ڈھائی سو مدرسین و ملازمین ہیں جن کی مجموعی تنخواہ ماہانہ اسی ہزار روپئے ہے .... دو ہزار طلبہ زیر تعلیم ہیں ان میں سے ایک ہزار کی کفالت دار العلوم کے ذمہ ہے جس میں دونوں وقت کھانا سال میں چار جوڑے کپڑے ایک جوڑا جوتا اور دس روپیہ ماہانہ نقد وظیفہ جو روشنی اور کپڑوں کی دھلائی کے لئے ہوتا ہے ہر ایک طالب علم کو دیا جاتا ہے (دار العلوم کے ۱۱۷ سال ص ۵۸، ۵۹)

ظاہر ہے کہ یہ دار العلوم کے بجٹ اور خرچ کی تفصیل ہے آمد اس سے کہیں زیادہ ہے یہی وجہ ہے کہ تمام اخراجات کے بعد بھی دار العلوم کی رقم بینک میں محفوظ کر دی گئی تھی جو آج تک بینکوں میں منجمد ہے یہ ایک المیہ ہے کہ دار العلوم اپنی ترقی کے مراحل طے کرنے میں ان رقموں سے کوئی فائدہ اٹھانے سے

اس وقت محروم ہے بہرصورت قاری صاحب کے دوراہتمام کے اخیر سالوں میں آمد تقریباً ایک کروڑ روپئے سے زیادہ ہوگئی تھی جس سے قاری صاحب کے اہتمام کی غیر معمولی مالی ترقی اظہر من الشمس ہوجاتی ہے مالی مشکلات چوں کہ دارالعلوم کے سامنے نہ تھی اس لئے اس کے شعبہ جات اور دیگر ضروریات میں بھی بے شمار اضافہ ہوتا گیا۔

شعبہ جات کی ترقی!

قاری صاحب کے آخری دوراہتمام سے دارالعلوم کے تقریباً ۲۲ شعبوں ہوچکے تھے جن کی اجمالی فہرست یہ ہے۔

(۱) شعبۂ تعلیمات (۲) دارالافتار (۳) جامعہ طبیہ (۴) نشریات (۵) ادارہ اہتمام (۶) کتب خانہ (۷) مطبخ (۸) شعبہ دارالاقامہ یہ آٹھ دس سبھی کسی نہ کسی نوعیت سے قاری صاحب کے زمانۂ اہتمام سے قبل ہی وجود میں آچکے تھے۔ باقی تمام شعبوں کا اضافہ خود قاری صاحب کے اہتمام میں ہوا ہے اس لحاظ سے تقریباً ۱۲، ۱۳ شعبہ جات کے وجود اور ان کی جملہ ترقیاں قاری صاحب کے اہتمام کی مرہون منت ہیں زمانۂ اہتمام سے قبل کے جو شعبہ جات تھے ان میں سے صرف بعض شعبوں کی ترقیوں کا اجمالی جائزہ پیش کرنے کے بعد باقی شعبہ جات کی صرف فہرست پیش کی جائیگی۔

شعبہ اہتمام

کسی ادارہ کو عالم وجود میں آتے ہی سب سے پہلے اس کے انتظام وانصرام اور اس کی ضروریات کی تکمیل ونگہداشت کیلئے اس شعبہ کا ہونا ضروری ہے یہی شعبہ ادارہ کا بنیادی شعبہ ہوتا ہے جو اس کے تمام خارجی وداخلی امور کا ذمہ دار اور آہنی مرکزی نقطہ قرار پاتا ہے اس لحاظ سے اس کا وجود اور ادارہ کا وجود توأم ہوتا ہے دارالعلوم دیوبند کا یہ شعبہ مجلس شوریٰ کے ارکان اور مہتمم پر مشتمل ہے مجلس شوریٰ ملک کے مختلف حلقوں سے بااثر ہمدرد صاحب رائے اور نمائندہ شخصیتوں پر مشتمل ہوتی ہے جن میں اطراف ملک کے سربرآوردہ علمار کی اکثریت ہوتی ہے مجلس شوریٰ اپنی صوابدید سے عاملہ کمیٹی اور مہتمم کا انتخاب کرکے ان کے ذریعہ ادارہ کو چلاتی ہے اہتمام کے عظیم منصب کے پیش نظر یہ اصول مدنظر رہتا ہے کہ اس کے لئے صرف ایسی ہی شخصیتوں کا انتخاب عمل میں آئے جو علم وفضل کی دیانت وتقویٰ اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کے علاوہ ملک میں اثر ورسوخ اور ایک قسم کی وجاہت بھی رکھتی ہو ادارۂ اہتمام کے لئے جو عمارت خاص ہے وہ دارالعلوم کے صدر دروازہ کی بالائی منزل پر واقع ہے جس کی تعمیر ۱۳۱۵ھ میں ہوئی ہے۔

شعبہ تعلیمات

کسی ایسے ادارہ کیلئے جس کا مقصد اساسی ہی تعلیم وتربیت ہو اس کے متعلق یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ اس کا شعبۂ تعلیمات کب قائم ہوا ظاہر ہے کہ دارالعلوم کا آغاز وجود ہی اس واقعہ سے ہوا کہ ایک شاگرد اور ایک استاد سے شعبۂ تعلیم کی بنیاد پڑگئی پھر اس کا ہر قدم پہلے قدم کے مقابلہ میں حیرت انگیز طور پر آگے بڑھتا گیا باضابطہ درس نظامیہ کی مکمل تعلیم کا نظم دارالعلوم میں بنیاد کے وقت سے ہی تھا اگرچہ اساتذہ طب وعلم ہیئت وغیرہ بھی پڑھا دیا کرتے تھے لیکن ضابطہ میں ۱۲۹۷ھ میں طب کی تعلیم شروع ہوئی اور پھر ۱۳۰۱ھ کے اندر اس کو ایک شعبہ کی حیثیت دے دی گئی اس شعبہ کو قاری صاحب کے دوراہتمام کے اندر ۱۳۷۲ھ میں مزید ترقی کی گئی اور دارالشفار کی الگ عمارت تعمیر ہوئی پھر طب کی تعلیم کو ترقی دینے کیلئے ۱۳۸۰ھ میں جامعہ طبیہ قائم کیا گیا جو دارالعلوم

کے تحت مستقل ایک جامعہ ہے چنانچہ اس کی جملہ ضروریات پورا کرنے کیلئے طبیہ کالج کے نام سے ایک الگ عمارت تیار کرائی گئی جو سنہ ۱۳۹۱ھ میں پایۂ تکمیل کو پہونچی اسی طرح شعبۂ تجوید جو اس وقت ایک شعبہ کی حیثیت رکھتا ہے اس کی ابتداء سنہ ۱۳۲۱ھ میں صرف ایک استاذ حضرت قاری عبد الوحید خانصاحب الہ آبادی اور شاگرد قاری محمد طیب صاحب سے ہوئی تھی اسی نسبت سے لفظ قاری حضرت مہتمم صاحب علیہ الرحمہ کے نام کا جزو بن گیا تھا جو اس شعبہ کی مقبولیت اور کامیابی کی دلیل بھی ہے سنہ ۱۳۵۱ھ سے دارالعلوم سے سند فراغ حاصل کرنے کیلئے تجوید کی مشق لازم قرار دی گئی اور اسی سال سے داخلہ کا فارم اور دورۂ تفسیر کا بھی اجراء ہوا اسی طرح سنہ ۱۲۹۲ھ سے فتویٰ نویسی کا کام ضرورت کے تحت شروع ہو چکا تھا لیکن اس کے لئے علیحدہ سے مفتی کا تقرر اس وقت نہ ہوتا تھا یہ خدمت بھی صدر مدرس ہی انجام دیتا تھا لیکن ملک و بیرون ملک سے آنیوالے استفسارات کی کثرت اس بات کی متقاضی ہوئی کہ اس کام کیلئے ایک مستقل شعبہ ہونا چاہیئے چنانچہ سنہ ۱۳۱۰ھ میں دارالافتاء کا قیام ایک شعبہ کی حیثیت سے ہوا اور سنہ ۱۳۲۹ھ سے فتاوی کی نقول محفوظ کرنے کا باقاعدہ اہتمام کیا جانے لگا اس وقت سے ۱۳۹۶ھ تک دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء سے جو فتاوے جاری ہوتے ہیں ان کی تعداد ۲۹۲۳۳۶ ہے اس شعبہ کی علیحدہ عمارت تین بڑے کمروں پر مشتمل مسجد دارالعلوم کی شرقی بالائی منزل پر واقع ہے، جو سنہ ۱۳۸۶ھ میں مکمل ہوئی ہے دارالعلوم کے فتاوے چوں کہ اہل علم اور عام مسلمانوں کے نزدیک دینی معاملات کے اندر اپنی ایک حیثیت رکھتے ہیں اس لئے ان کا تقاضا تھا کہ ان کو کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے چنانچہ ضرورت کا احساس کرتے ہوئے ان بیش قیمت فتاویٰ کی ترتیب و اشاعت کا کام سنہ ۱۳۷۵ھ سے شروع کر دیا گیا اور اب تک اس کی متعدد جلدوں کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اسی طرح عربی زبان و ادب کی تعلیم کا نظم تدریسی نصاب کے اندر داخل ہونے کی وجہ سے شروع سے ہی تھا لیکن جدید عربی انشاء و ادب کیلئے ایک مستقل شعبہ کی حیثیت سے اس کا قیام سنہ ۱۳۷۵ھ میں اس طرح ہوا کہ جب قاہرہ ازہر سے دارالعلوم دیوبند کے روابط مضبوط ہوئے اور وہاں سے دو اساتذہ عربی زبان و ادب کی تعلیم کیلئے دیوبند آئے تو صف عربی کا قیام عمل میں آیا جس نے اس قدر ترقی کی کہ تھوڑے عرصہ میں طلبہ کی اکثریت عربی لکھنے بولنے لگی اور مختلف عربی رسالے فریم میں مزین ہو کر دارالعلوم کی دیوار پر آویزاں ہو گئے آگے چل کر اس شعبہ سے اچھے اچھے عربی انشاء پرداز اور مضمون نگار پیدا ہوئے جو علمی حلقوں میں آج معروف و مشہور ہیں مجلس شوریٰ نے سنہ ۱۳۹۰ھ میں جب تکمیل تفسیر تکمیل دینیات تکمیل معقولات وغیرہ کا فیصلہ کیا تو اسی کے ساتھ تکمیل ادب عربی کا فیصلہ کر کے اس شعبہ کو مزید ترقی دے دی۔

شعبہ مطبخ دارالعلوم کی ابتدائی زندگی میں طلبہ کیلئے کھانے کا نظم شہر کے اصحاب خیر کے یہاں تھا بعد میں کچھ طالب علم مدرسہ کی طرف سے وظیفہ پانے لگے تھے لیکن اس صورت حال سے ان کے وقت کا بڑا حصہ کھانے پینے کے نظم میں لگ جاتا اور تعلیم کا حرج ہوتا تھا اس لئے طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد اور تعلیمی ترقی کے لئے دارالعلوم سنہ ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء میں مطبخ قائم کیا اور تقریباً ۲۰۰ طلبہ کے کھانے جاری کئے لیکن بہت تیزی کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا

رہا امدادی طلبہ کی تعداد تقریباً ہزار سے زائد اور قیمتاً کھانے والوں کی تعداد بھی قابل ذکر ہوتی تھی اس لئے مطبخ میں تین قسم کے کھانے روزانہ دو وقت تیار کئے جاتے ہیں عام کھانے کے علاوہ مریضوں کے لئے پرہیزی کھانا اور قیمتاً کھانے والوں کی فرمائش پر اعلیٰ قسم کا کھانا بھی تیار کیا جاتا ہے مہتمم صاحب کے آخر دور سے صرف مطبخ کا عملہ ۲۸ افراد پر مشتمل ہے ۱۳۱۵ھ سے صبح اور شام کے دو ٹکٹ ہر طالب علم کے لئے تیار کرائے گئے اور اس طرح اس مشکل کو حل کیا گیا۔

شعبہ کتبخانہ دارالعلوم میں آغاز تعلیم سے ہی یہ شعبہ قائم ہو چکا تھا لیکن ارباب مطابع اور علم دوست حضرات بطور عطیہ یا عاریت جو کتابیں عنایت فرما دیتے تھے انھیں سے درس و تدریس کا کام لیا جاتا تھا اور موقوفہ کتابوں کو کتبخانہ میں محفوظ کر دیا جاتا تھا چنانچہ آہستہ آہستہ بہت سے وفات یافتہ بزرگوں اور اہل علم کے ذاتی کتبخانے دارالعلوم میں آتے رہے اور مشہور اصحاب مطابع نے اپنی مطبوعات سے کتبخانہ کو نوازا اسی طرح دوسرے اسلامی ملکوں کی مطبوعات بھی کتبخانہ میں آتی رہیں چنانچہ ۱۳۵۸ھ میں حضرت مدنی علیہ الرحمہ کے توسط سے سعودی عطیہ کے طور پر وہاں کی مطبوعات آئیں اور افغانستان سے قاری صاحب کے ذریعہ وہاں کے شاہی عطیہ کے طور پر کچھ کتابیں آئیں اسی طرح ترکی کے سلطان رشاد خاں نظام دکن جمال عبدالناصر صدر عرب جمہوریہ وغیرہم کی عطا کردہ کتابیں بھی خاصی تعداد میں کتبخانوں کو ملی ہیں۔ مخطوطات اور نوادرات کی معتدبہ بھی کتبخانہ میں موجود ہے اہتمام کے ساتھ دارالعلوم کے اکابر کی تصنیفات بھی جمع کی گئی ہیں چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب سے لیکر اب تک کے اصحاب تصنیف تصانیف بزرگوں کی کتابوں کو مستقل ایک کمرہ میں جمع کرنے کا التزام کیا گیا ہے جدید طرز پر استفادہ کو آسان بنانے کیلئے کارڈ سسٹم جاری کیا گیا ہے مختلف علوم وفنون کی کتابوں کو فن وار اور زبان وار ترتیب بھی دے دی گئی ہے نوادر اور مخطوطات کی دو جلدوں میں تعارفی فہرست بھی شائع کر دی گئی سب سے زیادہ تعداد عربی کتابوں کی ہے اس کے بعد اردو فارسی کا نمبر ہے ان زبانوں کے علاوہ انگریزی ہندی، یونانی، ترکی، انڈونیشی، سنسکرت، ٹیمل، بنگلہ، گجراتی، گورمکھی، مرہٹی کنٹری، پشتو، پنجابی وغیرہ زبانوں کی کتابیں مختلف مذاہب اور فنون سے متعلق دارالعلوم کے کتبخانہ میں موجود ہیں تقریباً ۹۹ عنوانات پر ان کتابوں کی ترتیب قائم کی گئی ہے درسی اور غیر درسی کتابوں کے الگ الگ ذیلی شعبہ بنائے گئے ہیں درسیات کی داد و کا سالانہ اوسط پندرہ ہزار سے زائد ہی رہتا ہے کتابوں کے علاوہ قدیم اخبارات و رسائل کی فائلیں بھی خاصی تعداد میں محفوظ ہیں ملک و بیرون ملک سے تحقیق و ریسرچ کا کام کرنے والوں کے لئے یہ کتبخانہ بہت مفید ثابت ہوتا ہے چنانچہ ۱۳۹۶ھ تک اس کتبخانہ میں مطالعہ کرنے والوں کی تعداد ۲۵۳۶۰ سے زائد ہے کتب خانہ میں کتابوں کی تعداد ایک لاکھ سے بھی زائد ہے جن میں غیر درسی کتابیں پچاس ہزار سے کچھ زائد ہیں لیکن ان سب چیزوں کے باوجود دارالعلوم کی طرف سے نادر کتابوں اور ہر فن کی اہم کتابوں کی تلاش اور خریداری کا انتظام جو بہ مستقل طور پر نہیں کیا گیا اس لئے دوسرے اسلامی ممالک سے نادر کتابوں کی

تحقیق و تعلیق کے ساتھ جو نئی اشاعتیں مسلسل ہو رہی ہیں اور حدیث و تفسیر کے قدیم و نایاب نسخوں اور مختلف علوم و فنون جو فی زمانہ کتابیں اشاعت پذیر ہو رہی ہیں ان میں ضرورت کی کتابوں کو حاصل کرنے کے سلسلہ میں چونکہ دارالعلوم نے خاطر خواہ توجہ نہیں دی اور اسی لئے کتابوں کی خریداری پر جو توجہ اور خرچ ہونا چاہیئے تھا اپنی فارغ البالی کے زمانہ میں بھی دارالعلوم کے بجٹ میں اس کے لئے کوئی خانہ نہیں رکھا گیا ہے اس لئے بہر صورت کتبخانہ کی کتابی ضروریات ابھی نا تمام ہی ہیں ظاہر ہے کہ کسی بھی کامیاب لائبریری کو صرف عطیے اور وقف کی کتابوں سے خاطر خواہ ترقی نہیں دی جا سکتی کاش دارالعلوم کی توجہ اس طرف ہوتی تو تاریخ دارالعلوم میں یہ جملہ نہ ہوتا، کتب خانہ میں زیادہ تعداد ایسی ہی کتابوں کی ہے جو دارالعلوم کو عطیے میں ملی ہیں تاریخ دارالعلوم دیوبند ج ۲ ص ۳۲۵

شعبۂ نشر و اشاعت

سب سے پہلے دارالعلوم سے رسالہ القاسم ۱۳۳۱ھ میں جاری ہوا اس کے ایک سال بعد رسالہ الرشید جاری کیا گیا یہ دونوں رسالے اپنے بلند پایہ علمی اور تحقیقی مضامین کیلئے مشہور اور مستند ہیں ان رسالوں نے اپنے وقت میں علمی حلقوں میں بہت مقبولیت حاصل کر لی تھی لیکن ۱۳۴۷ھ میں کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ دونوں رسائل بند ہو گئے اس کے بعد کافی عرصہ تک دارالعلوم کا کوئی علمی ترجمان نہ رہا یہاں تک کہ ۱۳۶۰ھ میں مولانا مناظر احسن گیلانی علیہ الرحمہ کے توجہ لانے سے ایک رسالہ دارالعلوم کے نام سے نکلنا طے پایا یہ رسالہ پہلے دونوں رسائل کی طرح اردو زبان میں دارالعلوم کا ترجمان قرار پایا اور اپنے علمی و تحقیقی مقالات و مضامین کی وجہ سے مقبول ہوا اور آج تک جاری ہے لیکن دارالعلوم کے موقف اور حالات سے دوسرے اسلامی ممالک اور غیر ملکی اہل علم کو باخبر رکھنے اور تعارف کو عام کرنے کے لئے ۱۳۸۳ھ میں مجلس شوریٰ کے مشورے سے ایک سہ عربی رسالہ دعوۃ الحق کے نام سے جاری کیا گیا جس کی ادارت مولانا وحید الزماں صاحب استاذ ادب دارالعلوم دیوبند کے ذمہ لگائی گئی یہ رسالہ علمی حلقوں میں نہایت پسندیدہ نگاہ سے دیکھا گیا اور دارالعلوم کے حلقۂ تعارف میں اس کے ذریعہ بڑی توسیع ہوئی اس کی اشاعت نے دارالعلوم کو درج ذیل ممالک کے اہل علم سے قریب کر دیا سعودی عرب، مصر، کویت، شام، لبنان، لیبیا، عراق، شرق اردن، سوڈان، مراکش، تیونس، یمن، الخلیج العربی، نائجیریا، الجزائر، ایران، انڈونیشیا، ترکی، تاشقند، حبش، امریکہ، جرمن، ڈنمارک، سیلون۔

۱۳۹۶ھ میں دعوۃ الحق کی جگہ پندرہ روزہ عربی اخبار الداعی مولانا بدر الحسن صاحب کی ادارت میں نکالنے کا مجلس شوریٰ نے فیصلہ کیا اس کے بعد دعوۃ الحق کی جگہ الداعی ہر جگہ دارالعلوم کا ترجمان بن کر پہونچتا رہا شعبہ نشر و اشاعت سے ان رسائل و اخبار کے علاوہ دارالعلوم سے شائع شدہ کتابوں تبلیغی ضرورت کے اشتہارات و رسائل اور تعارفی کتابچے وغیرہ بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں اور یہ شعبہ دینی و علمی خدمات کے علاوہ دارالعلوم کے ہمدردوں تک دارالعلوم کے حالات و کوائف پہونچانے اور روابط کو مضبوط بنانے کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔

مذکورہ بالا شعبوں کے علاوہ باقی شعبہ جات کی اجمالی فہرست یہ ہے۔

(۱) شعبۂ تبلیغ سن قیام ۱۳۴۲ھ / ۱۹۲۳ء (۲) شعبۂ صنعت و حرفت سن قیام ۱۳۴۵ھ / ۱۹۲۶ء (۳) شعبۂ تنظیم و ترقی سن قیام ۱۳۵۹ھ

(۴) شعبہ کتابت سن قیام ۱۳۶۲ھ (۵) شعبہ تعمیرات اس شعبہ کے ۱۳۸۲ھ تک اخراجات ۱۱ لاکھ ۹۱۰۰ روپے بتائے گئے ہیں (۶) شعبہ صفائی اس شعبہ میں دو سقے اور دس بارہ ملازمین کا کام کرتے ہیں (۷) شعبۂ امور خارجہ غیر ملکی طلبہ کے پاسپورٹ ویزے اور ملکی طلبہ کیلئے کنسیشن فارم وغیرہ کے کام اسی شعبہ سے متعلق ہیں (۸) محافظ خانہ دار العلوم کے جملہ کاغذات کے ریکارڈ محفوظ رکھنا اس شعبہ کا خاص کام ہے۔

قاری صاحبؒ کے اہتمام کی اہم ترقیات

۱۳۶۲ھ میں پراویڈنٹ فنڈ کا ضابطہ منظور کرنا نافذ کیا گیا جسکی وجہ سے مستقل ملازمین کیلئے یہ سہولت پیدا ہوئی کہ مقدور کی عمر میں داخل ہوجانے کے بعد ضروریات کیلئے ایک اچھی رقم ہاتھ آجاتی ہے مستقل ملازمین کی تنخواہ سے ۶ فی صد وضع کر کے منجانب مدرسہ اتنی ہی رقم ملاکر ہر ماہ یہ رقم محفوظ کر دیجاتی ہے جو سبکدوشی کے وقت دیجاتی ہے نیز کسی ہنگامی اور اہم ضرورت کے وقت قرض بھی دیا جاتا ہے نیز طویل المیعاد اور مزمن امراض یا عمر درازی کے باعث سبکدوش ہونیوالے ملازمین کیلئے پنشن بھی تجویز کیگئی مدرسہ کیلئے غلہ کی فراہمی کا مسئلہ حل کرنے کیلئے ۱۳۶۲ھ میں پہلی مرتبہ غلہ اسکیم کے جلسہ کی بنیاد ڈالی گئی جسمیں تین ہزار من غلہ آیا اس سلسلہ کے جاری ہوجانے سے دار العلوم کا غذائی مسئلہ بڑی حد تک حل ہوا قاری صاحبؒ کے دور اہتمام میں دار العلوم کی شہرت بھی بے پناہ ہوئی ہے اگرچہ دار العلوم کو یوں تو روز اول سے ہی مقبولیت اور شہرت کا غیر معمولی درجہ قدرت کیطرف سے مل چکا تھا جسکی واضح دلیل یہ ہیکہ ۱۳۲۲ھ میں دار العلوم کے اندر کابل ایران، بلخ، بخارا، چین، روس، شام اور حجاز تک کے طالبان علم و عرفان موجود تھے لیکن قاری صاحب دار العلوم کے پہلے مہتمم تھے جنکو اپنے زور خطابت اور نکات انگیز پر اثر اور سنجیدہ بیان کیوجہ سے عوام کے وخواص کے دونوں حلقوں میں یکساں مقبولیت حاصل تھی ان کا یہ فن ملک و بیرون ملک کے اسفار کا سبب بنا جس سے حلقۂ دار العلوم وسیع سے وسیع تر اور ہمدردان دار العلوم کی تعداد میں کماً وکیفاً اضافہ ہوا۔

مہتمم دار العلوم کی حیثیت سے تنہا ان کی ذات نے دار العلوم کے حلقۂ تعارف وتعاون میں صور اسرافیل کا کام کیا چنانچہ درج ذیل ممالک میں سب سے زیادہ دار العلوم کا تعارف انھیں کے اسفار سے ہوا۔

افغانستان، ایران، مصر، افریقہ، انگلینڈ، امریکہ، جرمنی، برما، حبش، فرانس، رنگون ممالک عربیہ وغیرہ اس سلسلہ میں اس کا حقیقت کا اعتراف بھی کئے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ دار العلوم کی شہرت وعزت کے اندر حضرت شیخ الہند حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی مولانا عبید اللہ سندھی مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاری رحمہم اللہ کی سیاسی گرمیوں کا بھی بڑا دخل ہے اسی طرح علامہ کشمیری علامہ عثمانی اور حضرت نانوتوی محدث گنگوہی اور مولانا مدنی علامہ بلیاوی مولانا اعزاز علی رحمہم اللہ جیسی عبقری شخصیتوں کے درس اور ان کی تصنیفات کا بھی خاصہ حصہ رہا ہے اسی طرح دار العلوم کی شہرت کو عروج تک پہونچانے میں حضرت نانوتوی حضرت چاندپوری مولانا ابو الوفا شاہجہانپوری مولانا نعمانی وغیرہم کے ان مناظروں اور کامیاب مساعی کو بھی دخل ہے جو ملک کے اندر وقتاً فوقتاً فرق باطلہ کیخلاف سامنے آتی رہی ہیں لیکن فضلاء اور اکابر کی سرگرمیوں اور مختلف الانواع خدمات کے ساتھ ہی ساتھ قاری صاحب کی اعلیٰ درجہ کی انتظامی خطابی تحریری اور اخلاقی صلاحیتیں بھی دار العلوم کی قابل رشک ترقی وشہرت کا ذریعہ بنی ہیں جس کا اعتراف نہ کرنا ایک حقیقت کا انکار ہے۔

فکر دار العلوم کی اشاعت و حفاظت میں حکیم الاسلام کا حصہ

از: محمد برہان الدین سنبھلی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم، والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

ایسی کسی شخصیت پر قلم اٹھانا، نسبۃً آسان ہوتا ہے جو بس ایک دو خوبیوں کی مالک یا چند صفات میں ہی امتیاز رکھتی ہو لیکن ایسے افراد میں سے کسی پر کچھ لکھنا جو عبقری صفت اور گوناگون خصوصیات کے حامل ہوں، اور جن کے محاسن بیشمار ہوں اور جو صفات حمیدہ کا مجموعہ ہوں ان پر لکھنا کاتب کیلئے ایک کا طرح کا امتحان ہوتا ہے کیونکہ تمام خصوصیات کا بیان اور شخصیت کے ہر پہلو پر روشنی ڈالنا۔ بالخصوص کسی مقالہ میں ممکن نہیں ہوتا اور پھر یہ فیصلہ کرنا کہ ان اوصاف میں سے کسے موضوع بنایا جائے اور کسے چھوڑا جائے حیران و سرگشتہ کرنے کا موجب ہو جاتا ہے۔

ایسے ہی جامع صفات اور مجموعۂ کمالات افراد میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب (نور اللہ مرقدہٗ) کی ذات گرامی بھی تھی، چنانچہ جب برادر محترم مولانا ابو بکر غازیپوری صاحب نے راقم کو آں مخدوم پر، کچھ لکھنے کے لئے اصرار کیا تو یہ عاجز سرگشتہ و حیران ہو گیا کہ گلستان قاسمی کے اس گل سرسبد و صد رنگ کے کس رنگ کو چنے اور کس سے صرف نظر کرے اور اس کے سامنے یہ شاعرانہ تخیل ؎

دامن نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچیں زتنگیٔ داماں گلہ دارد!!

حقیقت بن کر کھڑا ہو گیا، کیونکہ گل حسن کی، بسیاری، پر، تنگیٔ داماں، کا، گلہ، کسی اور جگہ استعارۃً وکنایۃً، یا مبالغۃً ہو تو ہو، مگر حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کی ذات میں تو واقعتہً، گلہائے گوناگوں، اس طرح پیوست ہو گئے تھے کہ ان کا شمار مشکل، مزید برآں یہ کہ آں ممدوح کی شخصیت کا ہر پہلو، کرشمہ دامن می کشد کہ جا اینجا است، کا سچا نمونہ ہونے کی وجہ سے۔ لکھنے والے کا دامن پکڑتا ہے کہ مجھے...... نہ چھوڑو۔ اس بنا پر خیال ہوتا ہے کہ اچھا ہوتا اگر برادر موصوف "قلّ کدۂ طیب" کے ہر تذکرہ نگار کے لئے، حیات طیب، کا ایک گوشہ، بطور موضوع۔ مقرر کر دیتے کہ اس طور پر، محاسن، کے اس گلدستہ کا۔ ایک درجہ میں، سراپا۔ ان کے سامنے بھی آجاتا جنھیں اب صرف مرحوم کی، موئے قلم کے ذریعہ کھنچی۔ تصویر، ہی دیکھنے کو مل سکے گی ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہو گئیں

لیکن جب ایسا نہیں کیا گیا تو راقم نے مرحوم کی زندگی کا وہ پہلو پیش کرنا طے کیا، جس پر خیال ہے کہ کسی اور نے (خلاف مصلحت جان کر) قلم اٹھایا ہو گا۔ حالانکہ آج بلکہ آئندہ نسلوں کیلئے بھی۔ اس پہلو کا سامنے لانا۔ کم سے کم راقم کی نظر میں۔ جتنا زیادہ مناسب بلکہ ضروری ہے اتنا کسی اور پہلو کا نہیں ہے۔ اسی وجہ سے راقم نے آں محترم کی زندگی کا یہی اہم پہلو (بلکہ کہنا چاہیئے اہم کارنامہ) یعنی فکر دارالعلوم کی اشاعت وحفاظت میں حکیم الاسلام کا حصہ پیش کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ (وبید اللہ التوفیق)

اس عنوان وموضوع کا قدرتی تقاضہ ہے کہ پہلے[1] "دارالعلوم کا فکر" (جو مجموعہ ہے ایک خاص مسلک، مشرب اور منہج کا) معلوم ہو، اس کے بعد ہی حفاظت وبقاء، نیز اشاعت وصیانت کا تذکرہ برمحل، اور قابلِ اعتناء ہو گا۔

یہاں یہ حقیقت ظاہر کئے بغیر نہیں گذرا جا سکتا کہ، فکر دارالعلوم کا یکجا تفصیلی اور جامع تعارف، تحریری شکل میں آج ہمیں اسی کی زبان قلم سے معلوم ہو سکتا ہے جس کی ساری زندگی اسی، فکر کی ترجمانی کرتے بلکہ اسی کی فکر میں گھلتے گذری۔ یعنی وہی شخصیت جو آج کے تذکرہ کا موضوع ہے۔ (رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ کاملہ)

اس تحریری فکر، کا درجۂ اعتبار بڑھانے کیلئے تنہا یہ بات کافی ہونی چاہیئے کہ "مسلک دارالعلوم" کے عنوان سے یہ دستاویز اُس زمانہ میں ہی منظرِ عام پر آچکی تھی جبکہ "دارالعلوم" کے 'ارباب بست وکشاد' میں اکثریت ایسے حضرات کی تھی جو مسلکِ دارالعلوم' (یا فکرِ دارالعلوم) سے نہ صرف پورے طور پر آگاہ تھے بلکہ تنہا اسی کو اپنی دنیا و آخرت سنوارنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان میں اس وقت ایسے تو بہت کم تھے جو اس فکر سے ناواقف، یا مانوس ہوں یا اس پر پورا انشراح نہ ہونے کی وجہ سے۔ فلاح ذات وقوم کیلئے۔ دوسری راہوں اور فکروں کی تلاش، تجربات میں مشغولیت کو۔ یا اس فکر سے متوحش ہونے کی بنا پر اس کی مخالفت کو۔ حق ودیانت کا تقاضہ سمجھتے رہے ہوں۔ (اور ایسا تو شاید ایک بھی نہ تھا یا اس کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ جو کہ محض دنیاوی مصالح کی خاطر حق سے چشم پوشی یا حق دشمنی پر کمربستہ ہو جانے میں بھی تامل نہ کرے۔)

دارالعلوم کا مسلک

حاصل کلام یہ کہ ذیل میں "مسلک دارالعلوم" کا جو تفصیلی تعارف کرایا جا رہا ہے وہ تنہا کسی ایک ذات کی جودتِ طبع یا تراوشِ قلم نہیں ہے، بلکہ اس پر اپنے زمانہ

---

[1] جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا "فکر دارالعلوم" تین چیزوں (مسلک، مشرب، منہج) سے عبارت ہے تفصیل آگے آرہی ہے مگر زیادہ تر مشہور اور زبان زد لفظ، مسلک دارالعلوم ہو گیا ہے (اس کی حیثیت وہی ہے جیسے علمی زبان میں "تسمیۃ الکل باسم الجزء الاہم" کہتے ہیں) دستورِ اساسی کی رو سے بھی دارالعلوم کے ہر متعلق بالخصوص تمام ارکان کیلئے اس کی پیروی کی حفاظت ضروری تھی۔ جیسا کہ دارالعلوم (مجریہ ۲۲ ج ۱) میں دستور کے حوالہ سے لکھا ہے، "دارالعلوم کے مسلک کی حفاظت تمام ارکان ومتعلقین دارالعلوم کا فرض ہو گا، کسی ملازم یا طالب علم کو (بھی) اجازت نہ ہو گی کہ وہ کسی ایسی انجمن، یا ادارے یا جلسے میں شرکت کرے جس کی شرکت دارالعلوم کے مسلک یا مفاد کیلئے مضر ہو۔۔۔۔ الخ۔ دستور کی اس بنیادی دفعہ کو سامنے رکھکر تمام منتسبین دارالعلوم۔ بالخصوص اس کے ارکان، اور ملازمین کو اپنا محاسبہ کرنا چاہیئے کہ واقعۃً کیا وہ اس دفعہ پر عمل پیرا ہیں؟

کے مسلّم "دیوبندیوں" کی مہر تصدیق۔ خواہ وہ سکوتی ہی ہو، ثبت ہے۔ اس کے بعد "مسلک دارالعلوم" نامی رسالہ کے مصنف الفاظ میں اس کا تعارف سنئے۔ علمی حیثیت سے یہ ولی اللّٰہی جماعت، مسلکاً اہلسنت والجماعت ہے جس کی بنیاد کتاب وسنت اجماع وقیاس پر قائم ہے۔ (ایک دوسری جگہ مصنف نے خود ہی ایسی بلیغ تشریح کی ہے کہ پڑھ کر بے ساختہ جزاہ اللہ نکلا، فرماتے ہیں۔ پہلی دو حجتیں تشریعی ہیں، جن سے شریعت بنتی ہے، اور آخری دو حجتیں تفریعی ہیں جن سے شریعت کھلتی ہے۔ ص۲۳۲ ایضاً) اس کے نزدیک تمام مسائل میں اولین درجہ نقل و روایت کو اور آثار سلف کو حاصل ہے...... اس کے یہاں کتاب وسنت کی مرادات محض قوت مطالعہ سے نہیں بلکہ اقوال سلف اور ان کے متوارث مذاق کی حدود میں رہ کر، نیز اساتذہ اور شیوخ کی صحبت و ملازمت اور تعلیم و تربیت ہی سے متعین ہو سکتی ہیں۔ (ص۲۴۳) اسی کے ساتھ بطریق اہل سلوک۔ جو رسمیات، رواجی طریقوں، اور نمائشی حال وقال سے مبرا اور بری ہے۔ تزکیۂ نفس اور اصلاح باطن بھی اس کے مسلک میں ضروری ہے (ص۲۴۳) مزید فرماتے ہیں۔ دارالعلوم نے اپنے جامع مسلک میں حدیث، تفسیر، فقہ، اصول فقہ، کلام، تصوف (یعنی احسانی صفت جس کا اصطلاحی نام تصوف ہے) حقیقت اور معرفت یعنی جملہ دینی علوم اور مقامات کے مختلف الالوان پھولوں کا ایک گلدستہ ایسے جامع انداز میں پیش کیا کہ تمام مسلکی طبقات کے ایک نقطہ پر جمع ہونے کی صورت پیدا ہو گئی۔ (تاریخ ص۲۰۳ ج۲)

دارالعلوم کے دستور اساسی میں (ص۶ پر) دارالعلوم کے مسلک ومشرب، کی مختصر تشریح اس طرح کی گئی ہے۔

دارالعلوم دیوبند کا مسلک اہلسنت والجماعت، حنفی مذہب اور اس کے مقدس بانیوں (حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ قدس سرہما) کے مشرب کے موافق ہوگا۔ (تاریخ ص۱۳۳ ج۱)

مشرب: اس سے پہلے۔ اور بھی اوپر کی سطروں میں دستور کے حوالہ سے۔ دارالعلوم کے مسلک کے ساتھ مشرب، کا لفظ بھی آیا ہے۔ یہاں اس کی بھی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔

مشرب سے مراد۔ جیسا کہ دستور کی عبارت میں گذرا۔ ان دونوں (حضرت نانوتویؒ و حضرت گنگوہیؒ) کا خاص زاہدانہ، متوکلانہ، متصوفانہ، یعنی احسانی رنگ ہے جسے صاحب "مسلک دارالعلوم" نے دوسری جگہ "مشرب احسانی" سے تعبیر کیا ہے، ایک موقعہ پر اس کی تفصیل یہ کی ہے...... سلاسل علمیہ اور سلاسل فقہیہ کے ساتھ۔ سلاسلِ صوفیہ (احسانی نسبت) کو بھی جمع کر دیا ہے ایک کے مرجع الامر شاہ ولی اللہؒ تھے اور دوسرے کے حضرت میانجی جھنجھانویؒ خلیفۂ مجاہد اعظم حضرت سید احمد شہیدؒ) کے خلیفۂ اعظم حاجی امداد اللہ تھے..... (جس کی وجہ سے) سند حدیث کے ساتھ سند خلافت باطنی..... نقشبندیت کی لائن سے مجددی (یعنی) پیروی سنت اور سید احمد شہیدؒ کے (جذبۂ) اعلاء کلمۃ اللہ کی روح بھی راسخ رہی..... اس (مشرب) میں ہر (دینی) فتنہ کی مدافعت بھی داخل ہے، خواہ وہ (فتنہ) نقل و روایت کی راہ سے آیا ہو، یا بے لگام عقلیت (نیچریت) کی راہ سے (اس فتنہ نے) خواہ شرک و بدعت کا روپ دھارا ہو، یا الحاد و بے دینی اور آزاد خیالی کا..... (ان سب باتوں کے ساتھ دارالعلوم کا مشن) تمام مسلک

حقہ (بالخصوص ہندوستان کے) و اہل مسالک کو باہم جوڑنا ہے۔[1]

اوپر کی تفصیلات سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہوجاتی ہے کہ "دیوبندیت" کوئی نیا، مذہب، یا فرقہ نہیں ہے بلکہ وہ مسلک اہلسنت والجماعت کا ایک جامع مرقع ہے، چنانچہ شاعرِ مشرق ڈاکٹر سید محمد اقبال مرحوم کہ جن کی دینی حمیت اور وسعت نظر نیز محبت رسولؐ معلوم و معروف ہے۔ سے جب کسی شخص نے اس بارے میں سوال کیا تو فرمایا (دیوبندیت) نہ مذہب ہے نہ فرقہ بلکہ ہر معقول دیندار کا نام دیوبندی ہے"

اس اجمال کی تفصیل۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ حقیقی دیوبندی کی پہچان، مولانا طیبؒ صاحب ہی کی کے الفاظ میں یہ ہے کہ یہاں علمی وقار، استغنار، فروتنی... ایثار و زہد (صفات میں جمع ہوتی ہیں لیکن) کبر و نخوت (نہیں ہوتی) اور نہ ذلت (کہ عزتِ نفس پامال کرلیں) جہاں یہ علم واخلاص کی بلندیوں پر پہنچکر عوام سے بلند ہوجاتے ہیں وہیں تواضع کی وجہ سے عوام میں ملے بھی رہتے ہیں... مجاہدہ و مراقبہ کی وجہ سے خلوت پسند ہونے کے ساتھ مجاہدانہ و غازیانہ..... نیز قومی خدمات کے جذبات سے سرشار بھی ہوتے ہیں۔ (ان کے نزدیک) محدث ہونے کے معنی فقیہ سے لڑنا، یا فقیہ ہونے کے معنیٰ محدث بیزار ہونے، یا صوفی ہونے کا مطلب متکلم دشمنی، یا علم کلام میں مہارت کا تقاضہ تصوف بیزاری نہیں۔ بنابریں دینی شعبوں کے تمام ارباب فضل و کمال (کیا محدثین، متکلمین، کیا فقہا و صوفیہ کیا اصولیین و منطقین اور کیا امرار و خلفار) ان کے یہاں سب واجب الاحترام ہیں۔ لیکن ان تمام شعبوں میں سب سے زیادہ اہمیت اس جماعت کے نزدیک تعلیم علوم نبوت کو حاصل ہے۔ (تاریخ صفحہ ۴۲۵ باختصار)

دارالعلوم کے مسلک و مشرب کی۔ قابلِ لحاظ حد تک۔ تفصیلات بیان میں آجانے کے بعد مناسب ہوگا کہ ادارہ کے مقدس بانیؒ نے۔ اس کے چلانے کے غرض سے۔ جو اصول مقرر فرمائے۔ اور تحریر کردئے۔ تھے ان کا یہ بھی مختصراً تذکرہ آجائے اس کو یہاں منہج کا نام دیا ہے۔

حضرت نانوتویؒ کے مقرر کردہ ان اصول ہشتگانہ سے اب شاید ہی کوئی۔ وابستگانِ دارالعلوم میں سے ناواقف ہوگا جو موصوف نے بطور اصول موضوعہ یا۔ دستور العمل کے مقرر فرمائے تھے غالباً اسی لئے ان کے زبانی اظہار و بیان پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ تحریری شکل میں منضبط فرما کر گویا انہیں۔ رجسٹرڈ کردیا تھا، عبارت کا طرز صاف بتا رہا ہے کہ ان کے اصول کے اندر دارالعلوم کے چلانے کا دائمی طریق کار بیان کیا گیا ہے، ورنہ ان سے انحراف ہونے کی شکل میں، زوال کی پیشن گوئی نہ ہوتی (حالیہ واقعات نے تو۔ عملی طور پر۔ ان کے دائمی بلکہ الہامی

---

[1] ماخوذ از تاریخ دارالعلوم صفحہ ۲۰، ۳۶، ۳۲ جلد ۱ مرتبہ سید محبوب رضوی مرحوم، یہ تاریخ اگرچہ ۱۳۹۷ھ میں مجلس شوریٰ کے ایما سے دارالعلوم نے شائع کی مگر اس میں دارالعلوم کے مسلک و مشرب وغیرہ کی تفصیلات، حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کے ایک بہت پہلے شائع ہوئے رسالہ "مسلک علمائے دیوبند" نامی سے لیگئی ہیں۔ راقم سطور نے مذکورہ بالا تمام عبارتیں اسی سے نقل کی ہیں اور "تاریخ" سے مراد یہی ہے جس کے صفحات کے حوالے اوپر گذرے ہیں۔ آئندہ بھی "تاریخ" کے حوالے سے اسی کے صفحات مراد ہوں گے واضح رہے کہ عبارت میں کہیں کہیں معمولی لفظی تغیر مزید کردیا گیا ہے اور بریکٹ کے اندر تشریحی یا ربط کی غرض سے کئے گئے اضافے بھی راقم کے ہیں۔

ہونے کا ثبوت فراہم کر دیا) یہاں ان تمام اصول کے ذکر کی چنداں ضرورت نہیں معلوم ہوئی اس لئے بس چند کے بیان کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ جن چند امور کے ملحوظ رکھنے پر اس میں جو پیشین گوئی کی گئی ہے وہ پوری ہوتی صاف نظر آرہی ہے اس قبیل کا ایک اصول یہ ہے۔

مشیران مدرسہ (نہ کہ حاکمانِ مدرسہ) کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور خوش اسلوبی ہو، اپنی بات کی پچ نہ کیجائے خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالفت رائے، اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنیاد ہل جائے گی۔

غور کیا جائے کیا حالیہ فتنہ میں رونما ہونے والے۔ افسوسناک بلکہ شرمناک واقعات کی ایک بڑی اہم وجہ یہی نہیں ہوئی کہ بعض مشیران مدرسہ (نہ کہ حاکمانِ) نے اپنی بات کی پیچ کی اور اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہوا؟

ان اصول ہشتگانہ میں ایک یہ ہے۔

یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں، اور مثل علمائے روزگار کے خود بیں اور دوسروں کے درپے توہین نہ ہوں۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر مدرسہ کی خیر نہیں"۔

کیا یہ مقام حیرت۔ بلکہ عبرت نہیں! کہ حالیہ ہنگامہ کے دوران بعض مدرسین خود بینی اور خودسری کی آخری حد تک پہنچکر کیا دوسروں۔ بلکہ خود مہتمم تک۔ کے درپے توہین بلکہ درپے آزار نہیں ہو گئے تھے؟

تو پھر ایسی صورت میں کیا مدرسہ کے خیر کی امید کیجا سکتی ہے؟

ہم یہاں ان اصول میں سے صرف ایک کے پیش کرنے کی اور اجازت چاہینگے جو یہ ہے۔

اس مدرسہ میں جبتک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جبتک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ۔ اسی طرح چلتا رہے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہو گئی جیسے جاگیر، یا کارخانہ تجارت، یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ، تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا، جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے، ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا:

جیسا کہ اوپر۔ مسلک دارالعلوم کے بیان کے دوران۔ گزرا، ان اصولِ ہشتگانہ سمیت، مسلکِ دارالعلوم کی پیروی اور حفاظت۔ دستور اساسی کی رو سے۔ تمام ارکان و متعلقین دارالعلوم پر فرض قرار دی گئی ہے۔ تو کیا واقعہ۔ ارکان دارالعلوم اور اس کے متعلقین نے یہ فرض ادا کیا؟ سب کو بالخصوص، ارکان، کو (کہ انہوں نے سب سے زیادہ دستور کا ذکر کیا ہے) اپنا بھی محاسبہ کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اس کا فیصلہ خود ان پر ہے۔ (فکر دارالعلوم کا بیان ہو جانے کے بعد آئیے) دیکھیں کہ اس ذاتِ گرامی نے دستور و مسلک دارالعلوم (مع اصول ثمانیہ) کی رعایت و حفاظت کس درجہ کی؟ کہ جس پر دستور کی خلاف ورزی کا بہت زور دار آواز میں۔ الزام لگایا گیا؟

مرحوم کے فکر دارالعلوم کی اشاعت و حفاظت میں حصہ کے جائزہ سے پہلے یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دیکھا

جائے کہ خود موصوف اس فکر سے کتنے ہم آہنگ تھے۔ اور کس درجہ ایک مثالی نمونہ بننے کے لائق ہو اس کے بغیر سچ پوچھئے تو نہ ترجمانی کا حق حاصل ہوتا ہے اور نہ بے عملی کی۔ بات میں تاثیر ہوتی۔ اور نہ ہو سکتی ہے، کیوں کہ۔ لم تقولون مالا تفعلون ٭ کبر مقتا عند اللّٰہ..... الخ۔ کا تقاضا ہے کہ ایسی صورت میں خداوند تعالیٰ کی رضا کے بجائے۔ شدید ناراضگی حصہ میں آئے تو پھر کامیابی کی توقع کیسے کیجا سکتی ہے؟

اس فکر، کے پہلے جزو (مسلک) میں سب سے اہم مقام (اس لئے سب سے زیادہ توجہ کا مستحق بھی) ۔ علوم نبوت کا اور ان کی تعلیم و تعلم کا بتایا گیا ہے چنانچہ اس بارے میں موافق و مخالف۔ سب ہی متفق ہیں کہ مرحوم کا علمی مقام بہت بلند تھا، واقعہ یہ ہے کہ۔ علم کے بعض شعبوں میں، ملک کے خواہ دوسرے علماء امتیاز رکھتے ہوں لیکن مجموعی طور پر، مطالعہ کے تنوع، وسعت اور عمق میں موصوف کا پایہ۔ اگر سب سے بلند نہیں تو، کم سے کم یہ کہ۔ بہت بلند تھا، اور مشکل علمی مضامین۔ بالخصوص نصوص متعارضہ اور سلف کے اقوال مختلفہ میں تطبیق دے کر اور ان کی مراد متعین کر کے۔ واضح عام فہم دل نشین اور شیریں انداز سے پیش کرنے کے کمال میں اب کوئی حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے بعد۔ ان کا ثانی نہ تھا۔

موصوف کے تبحر علمی اور وسعت نظر کی چھاپ۔ عوام ہی نہیں، علماء تک پر۔ کس درجہ کی تھی؟ اس کا اندازہ کرنے کے لئے شاید یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ۔ آج نہیں بلکہ پچیس، تیس قبل بھی، جبکہ آج کل کا جیسا قحط الرجال بھی نہ تھا۔ اہل علم تک یہ کہتے سنے گئے کہ۔ ہندوستان کے سارے علماء کا مجموعی علم ایک طرف اور تنہا مولانا طیب صاحبؒ کا علم ایک طرف" ظاہر ہے کہ۔ کم سے کم اس وقت۔ یہ قول مبالغہ سے خالی نہ تھا لیکن اس سے بہر حال اتنا تو ثابت ہی ہوتا ہے کہ۔ اہل علم کے نزدیک بھی۔ ممدوح علمی طور پر فرد مایہ نہ تھے بلکہ ممتاز ترین علماء کے صف میں شامل سمجھے جاتے تھے۔

موصوف کے ذوق علمی۔ کے تمام دوسرے مذاقوں پر۔ غالب ہونے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ۔ دار العلوم کے اہتمام جیسے اعلیٰ اعزاز و اکرام۔ بلکہ ایک درجہ میں راحت و احترام۔ کے منصب پر فائز ہونے۔ اور تعلیمی شعبہ سے منتقل ہونے۔ کے لئے موصوف طبعاً تیار نہ تھے مگر اس، فکر، کے ہی ایک تقاضہ۔ اکابر کے حکم کی تعمیل اور ان کا احترام۔ سے بادل ناخواستہ، مہتمم، بنا گوارا کیا (اس کی دلچسپ تفصیل تاریخ ج ۱ ص ۲۸۰ میں ملاحظہ کیجئے)

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ تقریباً دس بارہ سال قبل، مجلس شوریٰ کے بہت سے ممتاز اور با اثر ارکان نے حضرت مہتمم صاحب سے ان کے خلف الرشید کو نائب مہتمم بنانے کیلئے جب اجازت چاہی تو موصوف نے اجازت دینے سے انکار کرتے ہوئے فرمایا کہ۔ خاندان قاسمی کا امتیاز علم ہے، نظم نہیں لہ یہ واقعہ حالیہ حادثات کے موجب کے طور پر جس واقعہ کو بہت نمایا کیا جاتا ہے اس۔ پر روشنی ڈالنے کیلئے بھی۔ اہل نظر کے واسطے۔ کافی ہے کہ

لہ یہ واقعہ راقم سطور نے براہ راست ایک نہایت ثقہ اور نمونہ علم دین مدرسہ قاسمی فاضل سے سنا ہے۔ اگر زندہ افراد کے ناموں کے

اگر واقعۃً موصوف نے حالیہ زمانہ میں ایسی خواہش کا اظہار کیا تھا، تو وہ کسی اور جذبہ سے نہیں بلکہ دار العلوم ہی کی خیر خواہی کے تقاضا سے کیا ہوگا (مگر ان کی مثال اس بارے میں خود راہنمائی کرتی ہے اور پھر یہ کہ موصوف کی پوری زندگی دار العلوم کی سچی خیر خواہی کے جذبات پر شاہدِ عدل ہے (مگر ان پر الزام لگانے والوں کی زندگی کا تو شاید بہت محدود عرصہ بھی اس کی شہادت میں پیش کرنا بہت مشکل ہوگا)

موصوف کے علمی مقام کی سب سے بڑھ کر شہادت، وہ بیانات بھی ہیں جو ان کے حادثۂ وفات پر زبانی یا تحریری۔ تمام قابلِ ذکر علماء اور دوسرے طبقات کے آئے۔ ان میں موافق و مخالف سب ہی نے دوسری خوبیوں کے ساتھ علمی بلندی کا بھی اعتراف و اظہار کیا ہے (سوائے ایک بزرگ کے، کہ انہیں حضرت مرحوم کا علمی امتیاز تجوید و قراءۃ ہی میں نظر آیا) بلکہ ایک بہت قابلِ احترام بزرگ۔ جو نہ صرف اپنی ذات بلکہ اپنی نسبت کے لحاظ سے بھی تمام اہلِ حق کے نزدیک واجب الاحترام سمجھے جاتے ہیں۔ نے تو یہ تک فرمایا (اور پھر شائع بھی کرایا) عجزت النساء ان یلدن مثل طیب" (اب طیب کا ثانی پیدا کرنے سے عورتیں عاجز ہیں)۔

اس سے بھی زیادہ قوی تر دلیل۔ موصوف کے ذوقِ علمی کی۔ یہ ہے کہ اہتمام کے متنوع اور تھکا دینے والے بے پناہ مشاغل نیز دیگر میدانوں میں سرگرم عمل رہنے کے باوجود، ساری عمر موصوف نے علم و مطالعہ سے اپنا رشتہ قائم رکھا، اسی تعلق کا یہ اثر تھا کہ۔ فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین احمدؒ جیسے جلیل القدر محدث کی وفات کے بعد۔ اور اس کے علاوہ بھی دیگر مواقع پر۔ دار العلوم جیسی ممتاز درسگاہ میں صحیح بخاری جیسی ارق و اعلیٰ کتاب کا، دورۂ حدیث جیسی اہم جماعت کے طلبہ کو (جس میں ایک خاصی تعداد ماہر اساتذہ تک کی شامل ہوا کرتی تھی، اور پھر بعض طلبہ بھی ایسے جید الاستعداد، کثیر المطالعہ اور وسیع النظر ہوتے تھے کہ ہندوستان کے بہت سے مدارس کے اعلیٰ مدرسین اور "شیخ الحدیث" کی مسندیں سنبھالتے والے بھی ان کی برابری بمشکل کر سکتے تھے) نہایت کامیابی کے ساتھ درس دیا۔

نیز دار العلوم کے علمی تقاضہ کے علاوہ دیگر اوصاف و تقاضے۔ مثلاً تصلب فی الدین، دینی حمیت، اسلاف کی عظمت، فرقِ باطلہ کا حکیمانہ رد، تحمل، حقیقی تصوف (تزکیہ و احسان) متانت، تواضع، استغناء وغیرہ، اوصاف تو موصوف میں اس طرح جمع ہو گئے تھے کہ ان کا کٹر سے کٹر دشمن بھی انکار کرنے کی جرأت۔ آخرۃ میں جوابدہی کا خطرہ مول لئے بغیر۔ نہیں کر سکتا ہے۔ اس وجہ سے ان کے مذکورہ اوصاف ہی کچھ لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ البتہ صرف تین (تواضع، تصوف اور فرقِ باطلہ کا حکیمانہ) کے بارے میں اتنا کہے بغیر آگے بڑھنا مشکل ہو رہا ہے کہ کم سے کم ادھر ۳۰، ۴۰ سال کے اندر۔ ان کے جیسے پایہ کے کسی شخص کے یہاں، ان کی جیسی تواضع کا تجربہ و شاہدہ۔ کسی کو مشکل ہی سے نصیب ہوا ہوگا کہ وہ اپنے۔ چھوٹے ہی سے نہیں۔ چھوٹوں کے چھوٹے سے بھی

---

۱۸۳ کا بقیہ: مضمون میں اخبار سے متعلق احتراز کرنے کا التزام نہ کر لیا ہوتا تو معترضان کا نام ظاہر کر دیا جاتا۔ یقین ہے کہ ہر واقف شخص انہیں عادتی الفول اور مدلولا اظہار خیال ہی کی صفت سے متصف سمجھتا ہے۔ ویسے بھی یہ واقعہ عام طور پر معلوم و معروف ہے کہ خدا کی قدرت و حکمت ہے کہ یہ تحریر جس میں حضرت مہتمم صاحب کے بارے میں عجزت النساء کہا گیا ہے الفرقان لکھنؤ ۱۴۰۳ھ ہی میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی اسے سلام کی کرامت کے علاوہ اور کیا نام دیا جائے۔

اس طرح پیش آتے تھے کہ برابر والے بھی کم ہی پیش آتے ہیں ۔ غرضیکہ ان کی جیسی ۔ کم سے کم راقم سطور کو تو ۔ اور کہیں تواضع نظر نہیں آئی (حالانکہ سیکڑوں ۔ چھوٹے بڑے ۔ علماء سے ملنا جلنا ہوا ہے ۔)

اسی ۔ طبعی تواضع کا یہ اثر تھا کہ ان کے ایک ، معاصر نے ۔ جو عمر میں بھی ان سے کم ہیں ۔ جب ان سے معافی طلب کی تو ان کی متواضعانہ طبیعت پر سخت بار ہوا اور اس کا اظہار ایسے الفاظ میں کیا جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں ، موصوف نے انھیں جواب دیا ۔ آں محترم سے زیادہ کون جانتا ہے کہ میں نے اپنے چھوٹوں کو بھی کبھی خطا وار نہیں سمجھا کہ ان کی زبان پر معافی کی بات آئے ۔

تزکیۂ واحسان کی صفت میں امتیاز کی سند کیلئے یہی کافی ہے کہ موصوف ، اپنی جماعت اور اپنے وقت کے سب سے متقی عالم ۔ حضرت شیخ الہندؒ ۔ کے دست گرفتہ ، اور اپنے عصر کے سب سے بڑے مصلح اور بے مثال مربی ۔ حکیم الامت حضرت تھانویؒ ۔ کے خلیفۂ مجاز تھے ۔

فرق باطلہ کی حکیمانہ تردید میں مرحوم کے حکیمانہ اسلوب کی شہادت کیلئے ، برصغیر کے مشہور مسلم صحافی اور بصر ۔ ماہر القادری صاحب مرحوم ۔ کا وہ تبصرہ کافی ہے ، جس میں ماہر صاحب نے اپنے پشتینی مسلک ۔ کٹر بریلوی سے ہٹکر ، حضرت مولانا طیبؒ ہی کی تقریر دلپذیر کے اثر سے ، صحیح العقیدہ بنجانے کی تفصیل اور دیگر بہت سی مفید باتیں ۔ اپنے شہرۂ آفاق ماہنامہ " فاران ، کراچی میں ۔ تحریر فرمائی تھیں (جو بعد میں کتابی شکل کے اندر بھی شائع اور مقبول ہوا) اس ۔ وصف ۔ کی سب سے نمایاں مثال ، اور جیتی جاگتی تصویر بمبئی شہر ہے کہ جہاں موصوف کے حکیمانہ خطابات ہی کے ذریعہ ۔ ابتداءً ۔ فضا بدلی اس کے بعد ہی اہل حق کو وہاں پاؤں ٹکانے بلکہ اپنی بات کہنے ۔ اور باطمینان سنانے ۔ کیلئے ۔ زمین مل سکی (ورنہ اس سے پہلی ایسی جرأت ، گستاخی ، کے زمرہ میں آتی اور سخت سزا کا مستوجب بنا دیتی تھی) یہی وجہ ہے کہ اہل حق میں جہاں تک اندازہ ۔ سب سے زیادہ باشعور لوگ ان ہی کے دست گرفتہ پائے جاتے ہیں ۔

اس کے علاوہ بھی آں محترمؒ نے " فکر دار العلوم " کی اشاعت وحفاظت کیلئے کیا کیا قدم اٹھائے ، آئندہ سطروں میں ان میں سے کچھ ..... کا ذکر کیا جا رہا ہے (بلکہ کچھ ..... ہی کا کیا جا سکتا ہے ۔ سب کا ذکر تو کسی مقالہ کا نہیں کتاب کا موضوع ہے اور پر سطروں سے ۔ نیز دوسرے واقعات سے ۔

یہ اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا کہ یہ ، فکر ، موصوف کے جسم و روح میں اس طرح پیوستہ ہو کر رچ بس گئی تھی کہ ان کی ذات ہی " مجسم فکر قاسمی " اور " سراپا دار العلوم " بن گئی تھی ۔ ان کی وفات پر متعدد اہل علم اور اصحاب فکر و دانش نے جو یہ لکھا ہے کہ " انہوں نے اپنی ذات کو دار العلوم میں اس طرح گم کر دیا تھا کہ ایک کا تصور دوسرے کے بغیر ممکن نہ رہا تھا (مفہوم) اس میں نہ غلط بیانی ہے نہ مبالغہ ۔ بلکہ حقیقت کی صحیح صحیح ترجمانی ہے کیوں کہ وہ جس جگہ گئے ۔ اور دنیا کا کون سا اہم حصہ ہے جہاں وہ نہیں گئے ؟ کیا امریکہ و یورپ ، کیا افریقہ و ایشیا ، کیا عرب کیا عجم ، جہاں وہ گئے فکر دار العلوم کے ساتھ پہنچے بلکہ ان کی تنہا ذات گرامی کی بدولت ، ہر جگہ دیوبند ،

مدرسے "دارالعلوم" سے عظیم جامعہ بنا۔ اور شہروں سے لیکر قصبات و دیہات دارالعلوم کی صدا ان کی ہم آواز بنکر اس طرح پہنچی کہ وہاں کے حساس دلوں کی دھڑکن اور ان کی اپنی آواز بن گئی۔ اور ان کی آواز کی طرح ذات بھی دارالعلوم میں اس طور پر سما گئی تھی کہ ان کی ذاتی شہرت، دارالعلوم کی شہرت، اور ان کا اپنا نفع و نقصان، دارالعلوم کا نفع و نقصان بن گیا۔ اسی لئے ان کے لئے "مہتمم صاحب" کا لفظ وصف نہیں ان کا ذاتی نام بن گیا۔

اور ایسا ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں، بلکہ اس کے خلاف ہوتا تو حیرت ہوتی کیوں کہ موصوف کی تو آنکھیں ہی اس فکر، کے آغوش میں کھلیں اور اسی فکر کے اعلیٰ ترین نمونوں "اور مثالی پیکروں" کے سایہ میں وہ پروان چڑھے تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ کے وہ حکیمانہ الفاظ، مہتمم صاحب کی ذات میں مجسم و قالب بن کر نظر آنے لگتے ہیں جو شاہ صاحب نے مشہور حدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم "الائمۃ من قریش" کی تشریح کرتے ہوئے زیب قرطاس کئے ہیں فرمایا ہے۔

...ان یجعل الخلفاء من بعدہ اھل بلدہ و عشیرتہ الذین نشؤوا علی تلک العادات والسنن

ولیس التکحل کالکحل ویکون الحمیۃ الدینیۃ فیھم مقارنۃ با لحمیۃ النسبیۃ ویکون علو امرھم ونباھۃ شانھم علواً لامر صاحب الملۃ

(حجۃ اللہ البالغہ صفحہ $\frac{119}{120}$)

. . . .

...ان ہی کے خاندان اور ان ہی کے شہر کا جانشینوں کو ان... ہونا چاہئے کیونکہ اسی ماحول میں چلنے اور بڑھنے کی وجہ سے ان لوگوں کے اندر (مطلوبہ) عادات اور طریقے رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتے ہیں (اس کے بعد بہت بلیغ تمثیل کے ذریعہ فرق واضح کرتے ہیں جسکا مفہوم یہ ہے کہ) جس کی آنکھ قدرتی اور پیدائشی طور پر سرمگیں ہو اس کا وہ شخص مقابلہ کہاں کر سکتا ہے کہ جسنے صرف سرمہ لگالیا ہو اور یہ بات بھی ہے کہ (اسی خاندان کے جانشین کی) حمیت دینی اور حمیت نسبی دونوں ہم آہنگ ہو جاتی ہیں اور (اسی لئے) اس کی ذاتی بڑائی بھی دین کی بڑائی سے مربوط ہو جاتی ہے۔

اشارۂ نبوی اور اسی سے پیدا شدہ حکمت ولی اللہی کا ہی غالباً یہ پرتو تھا کہ دارالعلوم کی فکر کے حقیقی نمونہ اور اس کے سچے خیر خواہ اور اکابر نے اصرار کے ساتھ حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب کو منصب اہتمام پر فائز کیا تھا۔ چنانچہ جو تجویز بابت تقرری منظور ہوئی اس میں یہ بھی صراحت تھی کہ، مولانا موصوف نوجوان صالح صاحب علم اور عالی خاندان اور دارالعلوم کے ساتھ آبائی (نسلاً بعد نسل) سچی و دلی ہمدردی رکھتے ہیں۔ (تاریخ صفحہ $\frac{279}{1}$ ج)

اور یہی وہ واحد سبب تھا جس کی بنا پر حضرت الاستاذ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی (قدس سرہ العزیز) اس وقت بے چین ہو گئے تھے جب حکیم الاسلام بعض مصالح کی وجہ سے (جو اب راز نہیں رہے ہیں)

ایک نئے وجود میں آنے والے مسلم ملک چلے گئے تھے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ نے جب تک مہتمم صاحب کو واپس بلاکر مسند اہتمام پر جلوہ افروز نہیں دیکھ لیا اس وقت تک آں مخدومؒ کا خواب وخور۔ گویا حرام ہوگیا تھا۔ (نوّر اللہ مرقدہٗ صلیٰ آثرا حما)

یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا بھی شاید بے محل نہ ہوگا کہ "تحویل قبلہ"[لہ] کی حالیہ مہم کے دوران جن لوگوں نے اپنے ذاتی غور وفکر کے نتیجہ میں۔ تبدیلی کو ضروری سمجھا اور اسی لئے اپنا پورا زور بیان قلم یا لسانِ دہن استعمال کرکے۔ صرف کیا ان میں یا تو متشکل[لہ] تھے یا ایسے تھے جنہیں اس عمل سے مناسبت ہی نہ تھی یا ان کے نزدیک اس سے زیادہ دوسرے مصالح عزیز تھے۔ اور بعض تو ایسے بھی تو جو اس سے آشنا ہی نہ تھے بلکہ بالکل بے گانہ تھے۔

اس لئے اس پر بھی تعجب نہ ہونا چاہیئے کہ اس شورش کے درمیان (حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ صاحبؒ کے دادا) حضرت مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی کے بانیٔ دارالعلوم ہونے کی حیثیت کو چیلنج کیا گیا بلکہ ان کی مقدس ذات (نیز اُن کے بلند مرتبہ صاحبزادہ۔ حافظ محمد احمد صاحبؒ) پر تنقیص کی حد تک پہنچنے والی تنقیدوں میں بھی ذرا تامل یا باک نہیں ہوا، مزید براں کہ بانیٔ دارالعلوم کے مقرر کردہ اصول ہشتگانہ کو آج کے دور کیلئے نہ صرف ناکافی بتایا گیا بلکہ انکا مذاق تک اڑایا گیا۔ (فالی اللہ المشتکیٰ)

لہ راقم سطور نے دارالعلوم سے حضرت مولینا طیب صاحبؒ کے ہٹائے جانے کی مہم کو تحویلِ قبلہ کا نام طنزاً نہیں دیا ہے بلکہ واقعہ یہی ہے۔ اور جو لوگ بصیرت رکھتے ہیں وہ پہلے ہی سمجھ رہے تھے، بلکہ کہہ بھی رہے تھے کہ۔ انکا ہٹنا سمت (رخ) بدلنے کا سبب بنجائے گا۔ چنانچہ بعد میں بہت سے لوگ بھی یہی کہتے سنے گئے جو پہلے یہ بات تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے (اور تبدیلی کی مہم میں حصہ بھی لے رہے تھے) اگرچہ جزوی تبدیلیٔ سمت کے آثار پہلے ہی سے رونما ہونے لگے تھے مگر بہرحال ایک قطب نما موجود تھا جس کی موجودگی سے رخ ٹھیک کر لینے کا امکان ضرور رہتا تھا۔ ۲لہ شاید اسی حکمت سے فقہاء (جو دراصل امت کے حکماء تھے۔) نے خیر القرون کے بعد نئے ہونیوالے غیر عرب مسلمانوں کو قدیم الاسلام مسلمانوں کا اس وقت تک کفو نہیں مانا ہے جبتک کی انکی ایک دو پشت اسلام پر نہ گذر جائے۔ (در مختار مع شامی جز ۲ ص ۳۱۹ میں ہے "و مسلم بلنفسہ۔۔ غیر کفو لمن ابوہ مسلم") دارالعلوم کا معیاری دور جس میں کم وبیش ہر فاضل۔ فرق مراتب کے باوجود معیاری اور فکر دارالعلوم کا مکمل نمونہ ہوتا تھا حضرت شیخ الہندؒ کے براہ راست تلامذہ پر ختم ہوگیا اگرچہ اس کے بعد بھی۔ بحمد اللہ تعالی کثیر تعداد میں معیاری فضلاء پیدا ہوئے، مثلاً مفتی محمد شفیع، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، اور مولینا بدر عالم میرٹھی وغیرہم (رحمہم اللہ) لیکن پھر کوئی کلیہ بنانا مشکل ہے۔ بلکہ خدا کے فضل سے۔ آج بھی معیاری فضلاء خاصے موجود ہیں لیکن زندہ لوگوں کے ناموں کے ذکر سے احتراز کیا جانا ہی قرینِ مصلحت ہے۔ (فان الحی لا تؤمن علیہ الفتنۃ) چنانچہ اس عدم مامونیت کا شاہد و تجربہ حالیہ فتنۂ دیوبند کے زمانہ میں اچھی طرح ہوا کہ گویا۔ "اصبح الرجل مؤمنا ویمسی کافراً..... کا ایک ہلکا سا پرتو تھا جو برابر رونما ہورہا تھا) اور اسی فتنہ نے "تدع الحلیم حیران" جیسے معجزانہ کلام کی صداقت کی بھی ایک جھلک دکھلادی تھی۔ (اللھم احفظنا من الشرور والفتن ما ظھر منھا وما بطن)

یہاں مہتمم صاحب کے فکر دار العلوم کی حفاظت کیلئے اہتمام کا پتہ دینے والے ایک خاص واقعہ کا ذکر مناسب معلوم ہو رہا ہے لیکن واقعہ سننے سے پہلے اصول ہشتگانہ میں سے وہ اصل ذہن میں تازہ کر لیجئے جس کے اندر، کارخانۂ تجارت، جیسی مستقل آمدنی کی سبیل، کو امدادِ غیبی موقوف ہونے کا سبب قرار دیتے ہوئے اس...... سے منع کیا گیا ہے۔

اجلاس صد سالہ کے موقعہ پر دار العلوم کی ہمہ گیر خدمات (اور مہتمم صاحبؒ کے ذریعہ ہونے والے عمومی طور پر اس کے تعارف اور) خداداد مقبولیت کی وجہ سے۔ سارے عالم، بالخصوص ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے اگر جمع ہونے والے انسانوں کا سمندر کہ جس کی نظیر میدان عرفات کے علاوہ اور کہیں نہیں دیکھی جاتی بلکہ نہیں دیکھی جا سکتی۔ جب دیوبند میں ٹھاٹھیں مارنے لگا، تو قدرتی بات تھی کہ دار العلوم کے چندہ میں غیر معمولی رقم جمع ہوئی، اس جمع شدہ رقم کے بارے میں "بعض اہل الرائے" نے تجویز کیا کہ اسے یونٹ ٹرسٹ میں جمع کر دیا جائے (جس کو وہ سمجھتے تھے کہ تجارتی ادارہ ہے اور وہاں جمع شدہ رقم پر تجارتی نفع بھی ملتا ہے جو سود کے شائبہ سے پاک ہوتا ہے) لیکن حضرت مہتمم صاحبؒ نے اس تجویز کی مخالفت کی اور (دینی حیثیت سے قطع نظر کرتے ہوئے) فرمایا کہ دار العلوم کا موضوع تجارت نہیں، تعلیم ہے، اس لئے بھی وہاں رقم جمع کرنا مناسب نہیں (واقعہ نقل کرتے ہوئے راوی آبدیدہ سے ہو کر کہنے لگے کہ بھلا آن نزاکتوں کو کون ملحوظ رکھے گا؟

(اس واقعہ کے راوی بھی وہی ثقہ قاسمی فاضل ہیں جن کے حوالہ سے اوپر بھی ایک واقعہ ذکر ہو چکا ہے۔) یہ واقعہ جو ہر طرح دار العلوم اور اس کے مسلک کے محافظ مہتمم کے شایان شان تھا لیکن ان کے کرمفرماؤں کی نظر کیا بن گیا؟ اسے جاننے کیلئے دل پر جبر کر کے۔ یہ چند سطریں آپ بھی پڑھ لیجئے۔ اس وقت بھی بعض ارکان کو یہ اندیشہ تھا کہ مہتمم صاحبؒ کے بعض متعلقین اس تجویز کو اپنے غلط ارادوں کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹ سمجھ کر چلنے نہیں دینگے اور مہتمم صاحبؒ کو اس کے استعمال کریں گے۔ افسوس یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا اور نہ صرف یہ کہ اس تجویز کی تکمیل نہیں کی گئی بلکہ اس عدم تکمیل کو مقدس شرعی لباس پہنایا گیا۔[1]

اس موقعہ پر امام شافعی رحمۃ اللہ کا یہ مشہور شعر نقل کرنا بھی شاید بے محل نہ ہو گا ؎

؎ عین الرضا عن کل عیب کلیلۃ　　　کما ان عین السخط تبدی المساویا

اہل نظر کیلئے تنہا یہ مثال آئندہ کے دار العلوم کا رُخ اور قبلہ دریافت کرنے کیلئے کافی ہے!

اس لئے یہ سوال قدرتی ہے کہ مہتمم صاحبؒ کے بعد دار العلوم کی ظاہری شان و شوکت باقی رہنے بلکہ بڑھ جانے کے باوجود کیا اس کی معنویت بھی اس درجہ پر قائم رہ سکے گی؟ یہ بات اللہ عالم الغیب والسرائر کے علاوہ

---

[1] یہ بات متعدد عرب مہمانوں نیز ہندوستان کے ایک ایسے ممتاز عالم نے بھی وہاں جلسۂ عام میں کہی جن سے زیادہ دنیا دیکھنے کا تجربہ کسی اور عالم کو نہیں ہو گا کہ حالانکہ بعض یہ کہ پہلے جو ادارے یا ان کے منتظمین یونٹ ٹرسٹ کو تجارتی کمپنی سمجھ رہے تھے انہیں سے بھی کچھ اب اسکے تجارتی ادارہ ہونے میں تامل کرنے لگے ہیں اور وہاں جمع شدہ رقم پر ملنے والے نفع کو ربح نہیں ربا قرار دینے لگے ہیں اور غلط فہمی کی بنیاد پر پہلے جو رقم وہاں جمع کر چکے تھے اسے واپس نکالنے کی فکر کر رہے ہیں۔

اور کون جانتا یا جان سکتا ہے؟

یہی وہ سوال ہے کہ جو خیر خواہوں کو فکر مند بنائے رکھتا ہے۔ اگرچہ کارسازِ حقیقی نے جس طرح اس کے بانیوں اور اولین معماروں کے اخلاص کی برکت سے۔ ابتک نازک سے نازک تر مواقع پر اس کی حفاظت فرمائی ہے اسی کے فضل وکرم سے امید ہے کہ آئندہ بھی حفاظت فرمائے گا مگر ڈر اس بات سے لگتا ہے کہ حالیہ فتنہ کے درمیان دوسری کوتاہیوں کے علاوہ خداوند تعالیٰ کی ایک بہت عظیم نعمت کی بڑی ناقدری[1] ہوئی اور کفرانِ نعمت ہوا ہے۔

اوپر دارالعلوم کے مسلک ومشرب کے تذکرہ میں۔ ذکر آیا کہ اس کے مقاصد میں ہر دینی فتنہ کی مدافعت بھی شامل ہے، اس بارے میں مہتمم صاحبؒ کے بس ایک روشن، بلکہ عالم آشکارا، کارنامے کا تذکرہ کافی ہوگا۔ ہندوستان میں جب مسلمانوں کے عائلی قوانین (نکاح، طلاق، میراث وغیرہ۔ جنھیں مسلم پرسنل لاء کہا جاتا ہے۔ کے خلاف کچھ نام نہاد مسلمانوں اور روشن خیال سیاستدانوں کی طرف سے۔ حکومت کی ایماء پر زبردست مہم چلائی گئی اور اس کا پورا خطرہ پیدا ہو گیا کہ شریعت اسلامیہ کے جن چند قوانین پر عمل کرانیکا مسلمانوں کو۔ ہندوستانی دستور کی رو سے۔ حق باقی رہ گیا ہے بس وہ بھی اب چھینا جانے والا ہے اور پارلیمنٹری جمہوریت۔ جو دراصل اکثریت کا نام ہے۔ کی لاٹھی سے اس کے کچلنے کی تیاریاں آخری مراحل پر ہیں تو سب سے پہلے اسی دارالعلوم۔ کہ جسکے قیام اور وجود کا اصل باعث ہی دین وشریعت کی حفاظت دبقا رہا ہے۔ کے سربراہ حضرت مولانا طیب صاحبؒ بے چین ہو گئے اور پھر بہت سی حکیمانہ تدابیر اختیار کیں جس کا ثمرہ بالآخر تمام ہندی مسلمانوں کے واحد متفقہ پلیٹ فارم "آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ" کی شکل میں برآمد ہوا اور ایسے مختلف افکار ونظریات رکھنے والے افراد پر مشتمل بورڈ کی صدارت کے لئے موصوف سے زیادہ موزوں تر اور کوئی شخصیت۔ پورے ہندوستان میں نہ مل سکی، چنانچہ وہی۔ از روزِ اوّل تا آخرِ حیات۔ اس کے صدر رہے۔ (مرحوم کی اس خصوصیت کا خاص طور پر ذکر، ان کی وفات پر دیے جانے والے بیان میں ہندوستان کے ایک عظیم مفکر نے کیا ہے)

آخری میں مرحوم کا وہ آخری مطبوعہ خط پیش کیا جا رہا ہے، جس کے حرف حرف سے، سوزِ دروں دارالعلوم اور اس کے مسلک وجماعت کی حفاظت کے لئے بیقراری اور اس کی زبوں حالی پر دل فگاری ٹپک رہی ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خط روشنائی سے نہیں خونِ جگر سے لکھا گیا ہے۔

ان باتوں کے ساتھ خط سے مرحوم پر لگائے جانیوالے الزامات۔ ضعفِ دماغی[2] لیکر قوت فیصلہ سے محرومی اور دوسروں کے زیرِ اثر ہونے تک کی حقیقت بھی۔ اہلِ نظر پر آشکارا ہو جاتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس مکتوب کا شائع

---

[1] اور کس درجہ کی ناقدری ہوئی؟ اس کا اندازہ کرنے کیلئے دل پر پتھر رکھکر یہ بھی سن لیجئے کہ جس زمانہ میں مہتمم صاحبؒ کے خلاف الزام تراشی کی مہم زوروں پر چلائی جا رہی تھی اور اسکے ذریعہ غلط فہمیاں پھیلانے میں فی الجملہ کامیابی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اس زمانہ میں الزام تراشوں کے گروہ کے چھوٹی سطح کے لوگ برملا کہتے سنے گئے کہ ہم نے ایسا کر دیا کہ اب حکیم الاسلام کی حیثیت سے تو انکا انتقال ہو گا نہیں۔ (مطلب یہ تھا کہ غلط فہمیوں کے پھیل جانیکے سبب ان کی موت پر آنسو بہانے کے بجائے خوشیاں منائی جائینگی) لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ سارے عالم اسلام نے کسطرح انکی جدائی پر خون کے آنسو بہائے (شاید آنسو پہلے نہ بہائے جاتے) بلکہ وہ لوگ بھی رونے پر مجبور ہوئے جنھوں نے زندگی میں انہیں۔ انکا دل دکھا کر رلایا تھا اور جنازہ میں اتنا ہجوم ہوا کہ چشم فلک نے دیوبند میں کسی کے جنازہ کے ساتھ نہ دیکھا تھا حالانکہ وہاں ایک سے ایک بڑھ کر آسمان علم وتقویٰ کے آفتاب وماہتاب آسودۂ خواب ہیں۔

[2] یہ عجیب بات ہے کہ جس زمانہ میں حضرت مہتمم صاحبؒ پر کبر سنی کی وجہ سے ضعف دماغی کا الزام زور وشور سے لگایا جا رہا تھا اس زمانہ میں بھی موصوف کی جتنی تحریریں وتقریریں (حاشیہ کا بقیہ ص ۱۸۹ پر)

ہوجانا ہی موصوف کی کرامت اور ان کے اخلاص کی روشن دلیل ہے۔ لیجئے تاریخی خط کے اہم حصے آخر میں ملاحظہ کرکے آج پھر اس۔ پیکر اخلاص و مجسمۂ اخلاق۔ کی یاد تازہ کیجئے۔

دارالعلوم دیوبند صرف ایک مدرسہ نہیں بلکہ اللہ کی امانت ہے، آج کے لادینی دور میں دین کے ہر شعبہ میں امت کی راہنمائی اور عوام امت کی خدمت اس کا نصب العین رہا ہے، آج اس کا کیا حال ہے؟ اور ہم اللہ کے سامنے مسئول ہیں۔ یہ ہے وہ سوز جس سے میرا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے...... نہ اپنی ذات کا غم ہے نہ اپنے عزیزوں کا۔ بلکہ غم دارالعلوم کا ہے۔ جماعت۔ جو ایک سو سولہ ۱۱۶ برس تک اداروں کیلئے ہدایت، تقویٰ، اور توحید کی علامت تھی بکھر کر رہ گئی ہے۔ یہی میری بیماری ہے..... اس عالم بے چارگی اور بیماری میں آپ کا مکتوب گرامی ملا (واضح رہے کہ اس خط کے مخاطب ایک ایسے بزرگ ہیں جنکے اختلافات موصوف سے اس وقت آخری نقطہ تک پہنچ کر اذیت ناک بن گئے تھے) جسے میں اپنے لئے اور دارالعلوم کے لئے روحانی صحتمندی کی علامت سمجھتا ہوں...... معاملہ ہم میں سے کسی ذات کا نہیں..... بلکہ ہمارے اسلاف کی یادگار دارالعلوم کا ہے...... ہم سب اپنی خطاؤں کی معافی اللہ سے مانگیں اور کچھ مانگیں تو دعا مانگیں ہم سب کو توفیق نصیب ہو اور آخرت کی جو ابدی ہے نجات ملے...... زندگی کی آخری آرزو اور آخری دعا یہ ہے کہ دارالعلوم کا پہلا رنگ جس میں روحانیت تھی، خلوص تھا اور سب ایک تھے اور فیصلے ایک رائے سے ہوتے تھے پھر بحال ہو جائے۔

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ واکرم نزلہ واسبغ علیہ شآبیب رحمتک وادخلہ الجنۃ الفردوس

(حاشیہ صفحہ ۱۸۸ کا بقیہ) بھی جو سامنے آئیں وہ سب کی سب ان کی حاضر دماغی، بلکہ عالی دماغی نیز حسب معمول۔ عالی ظرفی، توازن، متانت اور شرافت کا شاہکار تھیں۔ لیکن دوسری جانب کے معزز ستون کی لکھی گئی یا لکھی جانے والی سب تحریریں بھی کیا ایسی ہی تھیں؟ اس کا فیصلہ کوئی بھی منصف مزاج۔ دونوں کو سامنے رکھکر آج جبکہ فضا ساکن ہو چکی ہے بہتر طریقہ پر کرسکتا ہے کچھ یہی حال ان پر دوسرے لگائے گئے الزامات، غبن، خیانت وغیرہ کا بھی ہے جس کا ایک قرینہ یہ ہے کہ ان کے کرم فرما، ایڑی چوٹی کا زور لگا کر تھک گئے مگر دو سال قبضہ پر گزرنے کے بعد بھی ایک بھی ثابت نہ کر سکے۔

شخصیت

حضرت مولانا محمد طیب صاحب

اکابرِ دیوبند کی آخری یادگار

حضرت مولنا شمس تبریز خاں صاحب قاسمی ندوۃ العلماء لکھنؤ

عالم اسلام خصوصاً ہندوستانی مسلمان ایک عرصے سے قحط الرجال کی ایسی آزمائش سے دوچار ہیں کہ ہر سال اُن کی دینی و ثقافتی، علمی و سیاسی صفوں میں کوئی نہ کوئی کمی محسوس ہوتی ہے اور نمایاں خلا پیدا ہو جاتا ہے جو عرصے تک پُر ہوتا نظر نہیں آتا۔

خصوصاً کسی ممتاز عالم و ربانی شخصیت کا اٹھ جانا ہماری ملت کو داغ یتیمی و محرومی دے جاتا ہے رسولِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے علماء کو انبیاء علیہم السلام کا وارث و جانشین بتایا ہے اور ان کی موت کو علم دین کا ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیا ہے۔

عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول انّ اللہ لا یقبض العلم انتزاعاً ینتزعہ من العباد ولکن یقبض العلم بقبض العلماء حتی اذا لم یبق عالماً اتخذ الناس رؤساء جہالاً فافتوا بغیر علم فضلوا واضلوا۔

(صحیح بخاری کتاب العلم)

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ اللہ تعالیٰ علم کو یکبارگی نہیں اٹھائے گا کہ اسے لوگوں کے دلوں سے نکال لے۔ بلکہ علم کو علماء کی موت کے ذریعہ اٹھائے گا۔ یہاں تک کہ جب کوئی عالم نہیں رہ جائے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنا لیں گے چنانچہ وہ سوال کئے جائیں گے تو بغیر علم کے فتویٰ دیں گے اس طرح خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔

گزشتہ شوال ۱۴۰۳ھ (۱۷، جولائی ۱۹۸۳ء) کو بھی ایک ایسا ہی حادثہ پیش آیا جب اکابر دیوبند کی آخری یادگار حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قاسمی نے اس دارِ فانی کو الوداع کہی رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ

حضرت مولانا مرحوم کی ہشت پہل شخصیت کا نمایاں وصف ان کی جامعیت و ہمہ گیری، علم و ثقافت کے مختلف پہلوؤں میں ان کی عالمانہ نظر کی گہرائی اور فکر کی وسعت و گیرائی تھی جو دار العلوم دیوبند کے اکابر کا فیضان تھی۔

علوم اسلامیہ کی تقریباً تمام ہی شاخوں پر ان کی نظر تھی۔ منقولات کے ساتھ معقولات، بنیادی اسلامی علوم (فقہ و حدیث و تفسیر) کے پہلو بہ پہلو تصوف و کلام و مناظرہ اور ان کے ساتھ شعر و ادب بھی آپ کے گلشنِ فضل و کمال کے غنچہ و گل تھے جن کے رنگ و بو سے ان کی دلکش و دلنواز شخصیت عبارت تھی ؎

بہارِ عالم حسنش دل و جاں تازہ می دارد
برنگ اصحابِ صورت را بہ بو اربابِ معنیٰ را

اسی جامعیت کے ساتھ انھوں نے علوم اسلامیہ کی دیرینہ روایت کا تسلسل قائم رکھا اور اس ثقافتی امانت وسرمایہ کو جو حضرت شاہ ولی اللہ تک پہونچی تھی اسے اپنے اکابر کے ہاتھوں سے لے کر نئی نسلوں کے حوالے کیا اور عصر حاضر میں اس کی معنویت واہمیت کو مزید اجاگر کیا اور نئے مسائل وحالات کے پیش نظر اسلامی تعلیمات کے استحکام وبقا اور نشو ونما کا ماحول پیدا کرنے اور اسلام اور مسلمانوں کے حق میں علمی ومعاشرتی فضا کو سازگار بنانے اور عوام وخواص کو اسلامی پیغام واحکام کی حکمت ومصلحت سے آگاہ کرنے کا فرض بخوبی انجام دیا۔

اپنی اسی جامعیت کے سبب انھوں نے اسلاف واکابر دیوبند کے طرز پر تمام علوم اسلامیہ کی طرف توجہ مرکوز رکھی اور برصغیر کے مسلمانوں اور ان کے علمی وثقافتی مرکزوں کو اپنی تقریر دلپذیر اور عالمانہ تحریر سے فیضیاب کیا۔ آپ کی تقریروں میں شاید اللہ تعالیٰ نے وہی تاثیر ودلکشی رکھدی تھی جو کبھی ان کے نامور دادا حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی تقریروں میں ہوتی تھی جس کے ذریعے انھوں نے مباحثۂ شاہجہانپور اور میلہ خداشناسی کے معرکے سر کئے۔ اور آریہ سماجی پنڈتوں کا ناطقہ بند کردیا تھا۔

عالمانہ، حکیمانہ اور متکلمانہ تقریروں میں شاید ان کا کوئی دوسرا معاصر ان کا ہم سر وہم چشم نہ تھا۔ کتاب وسنت اور علمائے امت کے علمی ذخیرے سے برجستہ وبرمحل استفادہ، منطقی استدلال، داعیانہ جذبہ، مجتہدانہ نظر، حکیمانہ اسلوب، اور خطیبانہ حاضر دماغی، ونفسیات شناسی اور شستہ زبانی وشگفتہ بیانی نے مل جل کر ان کی تقریروں کو ایسا حسنِ قبول بخشا تھا اور اللہ تعالیٰ نے انھیں ایسی توفیق ومقبولیت سے نوازا تھا کہ وہ موافق ومخالف سب کے دل موہ لیتے اور اپنا گرویدہ بنالیتے تھے۔ ان کی تقریروں کی یہی کشش تھی جس کے سبب وہ ہمیشہ ہند وبیرون ہند کے سفر پر رہتے تھے اور ہندوستان کا شاید ہی کوئی شہر ان کی تقریر سے محروم رہا ہو۔

تقریروں کی طرح ان کی تحریریں اور کتابیں بھی (جن کی تعداد قریب ڈیڑھ سو ہے) ان کے رنگ تقریر کی حامل ہیں اور ان کے اندر علمیت وروحانیت اور موادِ اسلوب کی بہت سی خوبیاں موجود ہیں اور ان میں اکثر کتابیں بہت اہم موضوعات پر ہیں اور انھوں نے عصر حاضر میں اسلام کی تفہیم وترجمانی میں اپنا خاص کردار ادا کیا ہے اور عوام وخواص کی دینی تربیت ورہنمائی میں بڑا اہم حصہ لیا ہے۔ ادارہ "تاج المعارف" دیوبند کے ذریعے ان کی بہت سی کتابیں پابندی کے ساتھ شائع ہوئیں اور انھوں نے اسلامیات کے اردو ذخیرے میں مقدار ومعیار کے لحاظ سے بیش قیمت اضافہ کیا۔

ان کی سب سے بڑی، قابل قدر، اور لائق تقلید خصوصیات میں مسلک اہلسنت والجماعت میں ان کی وفاداری ووابستگی، علمائے سلف کی قدردانی اور ان کے لئے عذر خواہی، اکابر امت سے استناد، اور ان پر اعتماد اور مشاہیر اسلام کے علمی وعملی کارناموں کی روشنی میں اجتہاد اور ان کے علمی وثقافتی ورثہ سے فراخ دلی اور وسیع النظری کے ساتھ استفادہ، اسلام کے ماضی سے خوش گمانی اور حال ومستقبل کی طرف سے امید پروری کے ساتھ فکرمندی، فکر ولی اللٰہی اور اس کے حامل وامین اکابر دیوبند خصوصاً حضرت مولانا

محمد قاسمؒ کے گہرے اسلامی افکار پر عبور اور ان سے عقیدت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس دور میں (مولانا سندھیؒ کے بعد) وہ مسلکِ دیوبند اور مولانا نانوتویؒ کے متکلمانہ و مجتہدانہ سلسلے کے سب سے بڑے مفکر و حکیم اور شارح و ترجمان اور اپنے طرز پر حکمتِ قاسمیہ کے آخری حامل و امین اور علمِ کلام کے دیوبندی دبستان کے عقائد و مقاصد کے سب سے بڑے نمائندہ تھے ؎

میں کہ میری نوا میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام زندگی کھوئے ہوؤں کی جستجو

اپنے مسلک پر قائم رہتے ہوئے دوسرے مکاتبِ خیال کی خدمات کی قدر و تحسین اور ان کے بارے میں ہمدردانہ رویہ اور معتدل و متوازن رائے رکھنا، تلخ کلامی، بہتان طرازی اور افترا پردازی و عدمِ رواداری سے اجتناب، اپنے مخالفوں کے ساتھ عفو و تحمل، نرمی و خوش مزاجی کا برتاؤ، ان کے فکر و شخصیت دونوں کا امتیاز خاص تھا اور وہ حافظ کے اس شعر کے بہترین مصداق تھے کہ ؎

آسائشِ دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

ان کی یہی وسیع الظرفی، بلند نظری اور خوش اخلاقی تھی جس کے سبب سے دیوبندی مسلک کے مخالفین یا غیر جانبدار حلقے بھی ان پر اعتماد کرتے تھے اور ان کی رائے و مشورہ سے مستفید ہوتے تھے اس طرح وہ ہندوستانی مسلمانوں کے ان چند اکابر کی صف میں شامل تھے جن پر مسلمانوں کی اکثریت کو اعتماد و اطمینان تھا اور ان کو وہ اپنا متفق علیہ عالم سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے جب ان کے ایما پر دیوبند میں "مسلم پرسنل لا بورڈ" کا اجتماع ہوا تو علمائے ہند کے اس اہم مجلس کے وہ صدر بنائے گئے اور اس معزز عہدے پر تاحیات فائز رہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے اہم علمی و ثقافتی اداروں ندوۃ العلماء، مظاہر علوم، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ میں وہ یکساں احترام کے ساتھ مدعو کیے جاتے تھے۔

وہ ایک بلند پایہ عالم اور ممتاز خطیب اور فاضل اہلِ قلم ہی نہ تھے بلکہ اسلافِ دیوبند کے طرز پر احسان و عرفان اور اخلاص و ایقان کی دولت سے بھی مالا مال تھے۔ وہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ تھے اور ہند و پاک میں ان کے مریدوں کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے۔ ایک گہری روحانیت ان کی زندگی کے ہر دور میں نمایاں رہی۔

دارالعلوم کے اجلاسِ صد سالہ (۱۹۸۰ء) اپنے اندر فرحت و ندامت کے گوناگوں پہلو لیکر آیا اور تنظیم ابنائے قدیم کے نام سے وہ اختلاف اور خانہ جنگی شروع ہوئی جس سے دارالعلوم اور اس کے دوستوں اور فرزندوں کا وقار مجروح ہو گیا اور برصغیر کے اس عظیم علمی و ثقافتی اور روحانی ادارے میں دنیوی سیاسیات کے مظاہرے سامنے آنے لگے۔ اس کا علمی و تعلیمی معیار پست ہوا۔ اس کے فرزندوں کا کردار متاثر ہوا اور دیوبند کی دیرینہ

روایات وخدمات کے تسلسل میں بہت سی رکاوٹیں پیدا ہوگئیں، مقدمات کا سلسلہ اور باہمی بداعتمادی کی فضا اب تک قائم ہے۔ بیرونی عناصر اور دار العلوم کے دوست نما دشمنوں کی مداخلت اور بالآخر دار العلوم کی پامالی و بدحالی کے خطرات وخدشات اب تک برقرار ہیں

اس افسوسناک بلکہ دردناک صورتِ حال کی ذمہ داری میں مولانا طیب صاحبؒ کو بھی بدنام کیا جارہا ہے، لیکن میرا خیال یہ ہے کہ مولانا مرحوم کے ارد گرد، دار العلوم کے دوست نما دشمنوں اور مفاد پرست، جاہ پسند، اگروہ بند، غیر مخلص لوگوں کا اجتماع ہوگیا اور انہوں نے ان کی قوت فیصلہ اور آزادیٔ رائے کو بری طرح متاثر کیا اور اکثر بیانات اور تحریریں جعلی طور پر مولانا مرحوم کی طرف منسوب کر دی گئیں اور بہت سے فیصلوں پر انہیں مجبور کر دیا گیا یا ان میں کمی بیشی کی گئی، اس طرح کے اندیشوں کا اظہار حضرت قاری صاحبؒ کے اکثر قدر دانوں اور مرتبہ شناسوں نے کیا ہے جن میں مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مدظلہٗ کی تحریریں بہت ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔

اخیر میں چند ذاتی تاثرات وواقعات کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے ۱۹۵۵ء کے بعد اپنے وطن بجوجپور کے مدرسہ اشرفیہ کے سالانہ جلسوں میں آپ کی زیارت کا شرف اور آپ کے مواعظ حسنہ کی سماعت کی سعادت حاصل ہوئی۔ ۱۹۶۱ء میں دار العلوم دیوبند میں اپنی طالب علمی کے بعد سے ان کی مجلسوں میں اکثر حاضری کی عزت حاصل ہوئی، بہت سے ملفوظات میرے پاس قلمبند ہیں۔ ان مجلسوں میں سوالات کی پرچی بڑھا دیتا اور حضرت مولانا ان کے شافی جواب عنایت کرتے۔

رئیس احمد جعفری کی فرمائش پر میں نے مولانا مرحوم سے مولانا محمد علی اور علمائے دیوبند کے تعلق پر کچھ لکھنے کی درخواست کی تو مولانا مرحوم نے ایک مختصر مضمون سپردِ قلم کر کے میرے سپرد کیا وہ مضمون جعفری صاحب کی مرتبہ "علی برادران" میں لاہور سے اور ماہنامہ دار العلوم دیوبند کے ۱۹۶۲ء کے کسی شمارے میں شائع ہوا۔ دیوبند کے ایام طالب علمی کی ایک خوش قسمتی حضرت مولانا کے ہفتہ وار درس حجۃ اللہ البالغۃ میں شرکت بھی ہے جس کا سلسلہ حضرت کے اسفار کے سبب قائم نہیں رہتا تھا انہیں ایام طلب میں مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب (مرتب فتاویٰ دار العلوم دیوبند) کے ساتھ حضرت مولانا کے قیمتی کتب خانہ کی ترتیب جدید میں شرکت کا موقع بھی ملا جس میں مولانا گیلانیؒ کے ذاتی ذخیرے سے بہت اضافہ ہوگیا تھا۔

۱۹۶۳ء ہی کے آس پاس محدث جلیل شیخ عبد الفتاح ابو غدہ اپنے تبلیغی دورے میں دیوبند بھی تشریف لائے اور دار العلوم کی زیارت سے بہت مسرور ہوئے دار الحدیث کی تقریر میں انہوں نے فرمایا کہ ہندوستانی اہل علم اور علمائے دیوبند کی اہم تصنیفات کا عربی میں ترجمہ ہو تو یہ بڑی علمی خدمت ہوگی اور اس سے عالم اسلام میں استفادے کی راہ کھل جائے گی اس سلسلے میں انھوں

نے مولانا گیلانی کی "تدوین حدیث" وغیرہ کا خصوصی تذکرہ کیا تھا۔ طلبۂ دار العلوم سے شیخ ابوغدہ کے خطاب کے اکثر جملے مرصع اور مقفیٰ تھے اُن کا ایک جملہ اب تک کانوں میں گونج رہا ہے کہ "نقد الجاھل فی الکیس ونقد العالم فی الکراریس"

دار العلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ندوۃ العلماء کے جشن تعلیمی ۱۹۷۵ء میں آپ کی زیارت ہوئی اور تقریر بھی سنی پھر مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس رانچی ۷۸ء یا ۱۹۷۹ء میں پھر آپ کی زیارت ہوئی اور یکجائی کا موقعہ ملا۔ رانچی ہوائی اڈے پر حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہٗ اور حضرت قاری صاحبؒ کو رخصت کرنے حاضر ہوا تو اس موقعہ پر مولانا علی میاں صاحب مدظلہٗ نے حضرت قاری صاحبؒ سے میری طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ "یہ آپ کے مولوی شمس صاحب عرصے سے میرے ساتھ ہیں" اس پر حضرت مولانا مرحوم نے اپنے معنی خیز اور خاص انداز میں فرمایا "ہم سب آپ ہی کے ہیں" اس میں اس طرف اشارہ تھا کہ سبھی اکابر دیوبند، حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک سے وابستہ یا اس کے ہوا خواہ ہیں۔

اس کے بعد مارچ ۱۹۸۰ء میں اجلاس صد سالہ کے موقعہ پر دیوبند کے اس عظیم یادگار اجتماع میں آپ کی زیارت اور خطاب سے مشرف ہونے کا موقعہ ملا اور آپ کی اقتداء میں اس نماز جمعہ میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی جس کے نمازیوں کی تعداد میدان عرفات کے حاضرین کے غالباً برابر تھی۔

حضرت مولانا طیب صاحبؒ کی مغتنم اور یادگار شخصیت اور عدیم المثال ہستی کے بارے میں مختصر اوپر لکھ کر اس کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا، اس کے لئے ان کی مفصل سوانح عمری کی ضرورت ہے۔ خصوصاً ان کی علمی خدمات پر مفصل تبصرے کی بھی ضرورت ہے۔ کیونکہ وہ اپنے طور پر اکابر دیوبند کی آخری یادگار اور اپنی مثال آپ تھے، ان کے دم سے حکمتِ قاسمیہ اور دبستانِ دیوبند کی دیرینہ روایت قائم تھی اور اس کا تسلسل کسی نہ کسی طرح برقرار تھا۔ اس دور قحط الرجال میں دور دور آپ کا ثانی تو درکنار آپ کا بدل بھی نظر نہیں آتا جس کی شخصیت کے آئینے میں اکابر و اسلاف کی کچھ جھلکیاں دیکھی جا سکیں، افسوس صد افسوس کہ ؎

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

میں کہتا ہوں کہ عمل کرنا خود فضل کی دلیل ہے۔ عمل کرنا یہ دلیل ہے کہ فضل خداوندی اس کے اوپر نہیں ہے تو دنیا ہی سے فضل شروع ہو جاتا ہے۔ فقط آخرت ہی میں فضل نہیں ہوگا۔ (حکیم الاسلامؒ)

حکیم الاسلام مولانا محمد طیبؒ ایک آفاقی شخصیت

حکیم محمد الیاس صاحب میرٹھی

ایشیا کی عظیم ترین اسلامی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیبؒ صاحبؒ نور اللہ مرقدہٗ۔ ایک ہمہ گیر اور آفاقی شخصیت کے مالک تھے۔ مولانا طیب حسب و نسب کے اعتبار سے بلند پایہ۔ فضل و کمال کے اعتبار سے گوہر گراں مایہ اور علم و فن، کردار و گفتار، اور تقویٰ و پاکیزگی دنیا میں مانندِ آفتاب عالم تاب تھے۔ جد امجد بانی دارالعلوم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے استعماری اور فرنگی طاقت سے ٹکر لی اسلام اور ملت اسلامیہ کے بقا و استحکام کیلئے خلوص و للّٰہیت کے جذبہ سے سرشار ہو کر سرفروشانہ جدّ و جہد فرمائی۔ والدِ ماجد حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ نے منصب اہتمام پر فائز ہو کر دارالعلوم کی تعمیر و ترقی میں سر دھڑ کی بازی لگائی اور مسند افتاء و قضا پر متمکن ہو کر علوم شرعیہ کی ترویج و اشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔

مولانا محمد طیبؒ صاحب اپنی خاندانی اقدار و روایات کے امین کی حیثیت سے عالی ظرفی، فراخ حوصلگی اور وسعتِ نظری کے علمبردار تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے انتظام و انصرام کیلئے ایسے ہی کشادہ دل، صاحب بصیرت اور خدا ترس بزرگ کی ضرورت ہے۔

حضرت مولانا نے اپنے ذاتی اور خاندانی اوصاف و خصائل کو جو سیرت طیبہ اور اسلامی اخلاق و آداب کا عکس جمیل ہیں دارالعلوم کے نظم تعلیم و تربیت سے ہم رشتہ کیا، تو دارالعلوم کو ایک عالمی اور آفاقی ادارہ بنا دیا، حضرت حکیم الاسلامؒ نے مسلک دیوبند کو اصل، اور دیگر افکار و نظریات کو لاابعاد بھا کی حیثیت سے روشناس کرایا۔ مختلف فکر و نظر کے اربابِ فضل و کمال کو وحدتِ مسلک کی بنیاد پر متحد کیا۔

اور مجلس شوریٰ اور حلقہ اساتذہ و کارکنان میں ان سب کو متحد و یک دل ہو کر کام کرنے کا موقع عنایت فرمایا، اس صدی کے منتظمین اور اربابِ بست و کشاد میں یہ امتیازی شان صرف حضرت حکیم الاسلامؒ کو ملی دارالعلوم میں مختلف شعبہ جات کا قیام اور مختلف علوم و فنون کی ترویج اس وصف عظیم کی کھلی مثال ہے۔

قرآن وحدیث، افتاء وقضا، تفسیر وادب، فلسفہ اور معقولات طب اور سائنس کی تدریس نے مدرسہ اسلامی عربی دیوبند کو دارالعلوم دالفنون سے بدل کر جامعہ اور ازہر الہند بنا دیا تھا اس موقع پر اس واقعہ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے جس سے حضرت حکیم الاسلامؒ کی بلندی فکر وعمل اور ان کے دردمند عوام ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔ میرے والد مولانا حکیم محمد اسحاق صاحبؒ کٹھوری خلیفہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ سے حضرتؒ کے دیرینہ روابط تھے۔ اکثر وبیشتر ان کے ساتھ ظرافت ومزاح اور خوش طبعی کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔ جب حضرت حکیم الاسلامؒ نے جامعہ طبیہ قائم کرنے کا عزم فرمایا تو حضرت حکیم صاحبؒ کو جو دارالعلوم کی شوریٰ کے رکن رکین بھی تھے دیوبند بلوایا اور فرمایا کہ حضرت حکیم صاحبؒ آپ نے اپنے فیضانِ علم وحکمت سے ہمیں تو بہت فائدہ پہونچایا، لیکن ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے واسطے سے خلق خدا کو فیضیاب کریں۔ اور شعبہ طب کے قیام میں مدد دیں۔ حضرت حکیم صاحبؒ نے اپنے مخلصانہ تعاون اور گرانقدر صلاح ومشوروں سے شعبہ طب کے قیام میں بڑا تعاون فرماتے رہے۔

خادم راقم الحروف کو بھی بحیثیت سکریٹری جامعہ طبیہ دارالعلوم دیوبند کے خدمت انجام دیتا رہا ہے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ کو اپنی انفرادی ترقی اور خوشحالی کی کبھی فکر نہ ہوئی۔ پوری زندگی اپنے دادا مرحوم کے مکان میں گذاردی حضرتؒ کا مشرب اور مسلک دارالعلوم کی بقا وارتقاء جماعت دیوبند کا اتحاد وملت اسلامیہ کی دینی معاشرتی وفلاح کے علاوہ کچھ نہ تھا دارالعلوم کے اس عظیم حادثہ حضرت حکیم الاسلامؒ کیلئے نہ صرف باعث اذیت بنا بلکہ لمحات زندگی کو اس قدر جلا سمیٹا جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اسی کے ساتھ حضرتؒ کی زندگی کے ایک اہم پہلو صبر واستقلال کا عوام کے سامنے ظاہر ہوا یعنی سب کچھ ملنے پر بھی شکر تھا اور سب کچھ چھن جانے پر بھی صبر واستقلال تھا۔ جہاں حضرتؒ نزاکت ونفاست مزاج میں اپنی مثال آپ تھے اقتدار جانے کے بعد مصائب کی برداشت پر صبر وقناعت پر بھی اپنے استقامت کا بین ثبوت پیش فرماکر عوام الناس میں ثابت قدم کی مثال قائم فرمادی۔

وماتوفیقی الا باللہ

اسرائیل سے قتل وقتال جہاد ہے کیونکہ یہ اعلائے کلمۃ اللہ ہی کیلئے ہے کیوں کہ مسجد اقصےٰ شعائر اسلام میں سے ہے اگر کوئی شعائر اسلام کو ڈھادے اور توڑ دے اور آپ کے ہاتھ میں قوت ہے تو آپ ضرور قوت سے کام لیں اور اس کو چھڑانے کیلئے جہاد کریں۔ حقیقت حال اللہ جانتے ہیں لیکن اہل عرب اس کو حاصل کرنے کیلئے کوشش کر رہے ہیں۔ اگر آپ نہیں کر سکتے تو کم سے کم ان کی آواز میں آواز ہی ملایئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ظاہر میں تو جنگ کرتے تھے لیکن اصل مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہی ہوتا تھا۔ (حکیم الاسلامؒ)

حضرت قاری صاحبؒ کچھ نقوش وتاثرات

قاری منظور احمد صاحب گھوسوی

استاذ جامعہ مظہر العلوم بنارس

بیسویں صدی عیسوی کے ہندوستان کی جن مایۂ ناز شخصیتوں کا ذکر جمیل عالم اسلام کی تاریخ میں ثبت ہوگا ان میں حضرت قاری صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے نام نامی کو نمایاں مقام حاصل ہوگا۔ بلکہ جب تک قاری صاحبؒ کا نام شامل نہ ہو تاریخ ناقص رہ جائے گی۔ آپ تاریخ اسلامی کا چمکتا ہوا عنوان ہیں۔ ایک مستقل باب ہیں۔ ایک اہم دور ہیں دار العلوم دیوبند کو جو قبول عام حاصل ہے یقیناً اس کے پیچھے حاجی عابد حسین صاحب اور حضرت قاسم نانوتوی و دیگر اکابر کی قربانیاں اور پُر خلوص دعائیں۔ لیکن آل انڈیا بلکہ عالمی پیمانے پر دار العلوم دیوبند کے تعارف کا سہرا قاری صاحب کے سر بندھتا ہے۔ ملیشیا، انڈونیشیا سنگاپور، برما، لنکا، افغانستان، پاکستان، افریقہ اور دیگر ممالک سے تشنگان علوم نبویہ قاری صاحب کے دور اہتمام میں ہی زیادہ آئے قاری صاحبؒ کی خصوصیات میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ان کا دور سابق مہتممین کی بہ نسبت سب سے زیادہ طویل رہا۔ پچاس سال سے بھی زائد عرصے تک آپ مہتمم رہے گویا دار العلوم دیوبند سو سال سے زائد عمر کا نصف حصہ قاری صاحبؒ کی سرپرستی واہتمام میں گذرا۔ برصغیر ہند میں جہاں قدم قدم پر اختلاف بلکہ مخالفت وعناد سے سابقہ پڑتا رہتا ہے اسی اہم ذمہ داری کو عرصہ دراز تک انجام دیتے جانا کرامت ہی کہی جائے گی جہاں ان کی سوجھ بوجھ پر یہ بات دلالت کرتی ہے وہیں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ آپ پر ملت اسلامیہ ہند کو پورا بھروسہ تھا یہ اعزاز بھی قاری صاحبؒ کو حاصل ہے کہ مشائخ حدیث کی جلیل القدر ہستیاں، جیسے حضرت انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مدنیؒ، حضرت مولانا فخر الدین صاحبؒ ان کے دور اہتمام سے گذریں، حضرت قاری صاحبؒ کیلئے یہ بات بھی باعث افتخار ہوگی کہ قیام دار العلوم سے لیکر اب تک جس قدر فضلاء ہوئے ان میں زیادہ تعداد ان کی ہے جو قاری صاحبؒ کے دور اہتمام میں فارغ ہوئے اس شرف میں مشکل سے کوئی ان کا شریک وسہیم ہوگا۔

قاری صاحبؒ کی چھاپ دار العلوم پر اور دار العلوم کا عکس قاری صاحب کی شخصیت پر کچھ اس طرح پڑ رہا ہے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کر کے تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ دار العلوم دیوبند کا تصور قاری صاحبؒ کے بغیر اور قاری صاحبؒ کا تصور دیوبند کے بغیر محال نہیں تو سخت مشکل ہے۔

قاری صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے بڑی مقبولیت اور ہر دلعزیزی عطا فرمائی تھی اور مقبول عام ہونے میں آپ کی شیریں مقالی اور خوش خصالی کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔ مرنجاں مرنج طبیعت میں بھی آپ منفرد تھے، حلم و بردباری میں آپ سلف کا نمونہ تھے۔ شدید تناؤ اور اشتعال کی فضا میں جہاں بڑے بڑے لوگ بشری تقاضے سے مجبور ہو کر بے قابو ہو جاتے ہیں، قاری صاحبؒ کو مسکراتے دیکھا گیا حلم کے اس بلند مقام پر تو بس خاصان خدا ہی فائز ہوتے ہیں ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

درس نظامیہ کے قدیم فضلاء کے بارے میں (باستثنائے چند) عام طور پر یہ گمان رہی ہے کہ وہ لوگ سیدھی سادی اور سلیس اردو بولنے والے اور لکھنے پر قادر نہیں یا آسان اردو بولنا خلاف شان سمجھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ نصابی کتب کو انتہائی انہماک سے پڑھنے پڑھانے کی وجہ سے وہ تمام علمی و فنی اصطلاحات از بر ہو کر گویا تکیہ کلام بن جاتی تھیں (یہ دراصل ان کا کمال تھا اور یہی کمال کمزوری بھی) جس کی وجہ سے تقریر و تحریر مشکل ہو جاتی تھی یہ بات قاری صاحبؒ کے ہمعصر بہت سے فضلاء میں بھی موجود تھیں مگر خود قاری صاحبؒ باوجود علمی انہماک اور علوم غامضہ کے مطالعہ کے سلاست تقریر میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ آپ کی تقریر نہایت شستہ و برجستہ اور ادبیت کی لطیف چاشنی لئے ہوئے ہوتی تھی۔

علم و کلام و فلسفہ و حکمت جو بہت خشک مضمون سمجھا جاتا ہے اور جس کے نام سے عوام تو عوام موجودہ زمانے میں طلباء بھی بھاگتے ہیں مگر قاری صاحبؒ کو زبان و بیان پر اس قدر قدرت حاصل تھی کہ فلسفہ و حکمت سے بھرپور تقریریں بھی نہایت دلچسپ معلوم ہوتی ہیں ہر آدمی اپنے ظرف کے مطابق قاری صاحب کی تقریروں سے مستفید ہوتا اور زبان حال سے کہتا ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

قاری صاحبؒ کی اسی حسن تقریر کی لذت سے محظوظ ہونے کے لئے جلسوں میں سامعین کا ہجوم بہت ہوتا تھا اگر ابتدائے تقریر میں حاضرین کی تعداد مثلاً پانچ ہزار ہے تو اختتام تقریر تک یہ تعداد ڈیڑھ گنی ضرور ہو جاتی اور سامعین کا یہ حال ہوتا کہ کوئی کہیں سے اٹھتا نظر نہ آتا۔

قاری صاحبؒ کی تقریر و خطابت کا انداز بھی انوکھا تھا عام مقررین کی طرح لب و لہجہ میں اٹھا پٹخ اور اکھاڑ پچھاڑ بالکل نہیں تھی نہ چیخ چیخ کر بولتے تھے نہ بہت فراٹے کے ساتھ تقریر کرتے اور نہ آواز میں جذباتی اتار چڑھاؤ تھا۔ تین تین چار چار گھنٹے کی تقریریں شروع سے آخر تک یکساں اور پروقار ٹھہرے ہوئے لہجے میں ہوتی تھی۔ چونکہ مجھ کو قاری صاحبؒ کی زیارت کا اتفاق بھی جلسوں ہی کی تقریب سے ہوا ہے اس لئے اس موقع پر اس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

تقریباً ۱۹۶۵ء کی بات ہے کہ ہمارے قصبہ گھوسی میں خالص توحید وسنت کے شیدائیوں کی کوششوں سے ایک جلسہ سیرت کا اہتمام کیا گیا گھوسی کی سرزمین پر ایک طویل عرصہ کے بعد اس نوعیت کا جلسہ منعقد ہو رہا تھا اس لئے اطراف وجوانب کے مسلمان بہت مسرور ومشتاق تھے۔ اس میں چوٹی کے مقررین شریک ہو رہے تھے جیسے حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی، حضرت مولانا ابوالوفا صاحب شاہجہانپوری اور دیگر اکابر علماء (افسوس کہ یہ سارے اکابر اس دنیا سے رخصت ہو چکے) انھیں میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا نام نامی سرفہرست تھا۔

اس جلسہ کی ایک خاص بات یہ ہوئی کہ اصل میں جلسہ سہ روزہ تھا لیکن چہار روزہ ہو گیا حضرت قاری صاحبؒ کسی اتفاقیہ عذر کی بنا پر جلسہ کی تین روزہ مقررہ تاریخوں میں تشریف نہ لا سکے جلسہ کے تینوں ایام گذار کر مزید ایک دن کے وقفے کے بعد تشریف لائے اس وقت کا منظر آج بھی آنکھوں میں تازہ ہے۔ قاری صاحب کے آمد کی خبر گرم ہے اہل قصبہ سڑک کے کنارے دیدہ دل فرش راہ کئے کھڑے ہیں پرشوق نگاہیں بار بار تاحد نگاہ غور سے دیکھ رہی ہیں اسی اشتیاق اور انتظار کے عالم میں قاری صاحبؒ بذریعہ کار گھوسی پہونچے۔ گیارہ بجے دن کا وقت رہا ہوگا اور قصبہ کے مشہور عالم مولانا وقار احمد صاحبؒ کے دولت کدہ پر سیدھے تشریف لے گئے اور غالباً ایک آدھ گھنٹہ وہیں ٹھہرے، وہیں پر قاری صاحبؒ کو قریب سے دیکھنے اور سلام ومصافحہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی پیرانہ سالی کے باوجود وجاہت وخوبصورتی ٹپک رہی تھی نہایت باوقار وحیادار بار بار دیکھنے کو جی چاہے مگر جمال کی تابناکی نگاہ خیرہ کر دے رہی تھی۔ نظر بھر کر دیکھنا مشکل تھا۔ قاری صاحبؒ کا اپنے مخصوص انداز میں نظریں نیچی کئے ہوئے کرسی پر جلوہ افروز ہونا اور آنے والوں کے سلام کا شیریں انداز میں جواب دینا اور مصافحہ کرنا وہ منظر پردۂ خیال پر ایسا نقش ہے جیسے ابھی کل کی بات ہو، قصہ کوتاہ یہ کہ رات میں قاری صاحبؒ کی تقریر ہوئی۔ بڑا اژدہام رہا، اطراف وجوانب سے بالخصوص، مئو، کوپاگنج، پورہ معروف محمد آباد، مبارک پور وغیرہ سے شائقین کثیر تعداد میں گھوسی پہونچکر شریک جلسہ ہوئے۔ میرا لڑکپن کا زمانہ تھا۔ اور اس عمر میں جلسے وجلوس میں شریک ہونے کا جیسا کہ شوق ہوا کرتا ہے مجھے بھی تھا پابندی کے ساتھ جلسہ میں شریک ہوتا رہا، کس عنوان پر کس نے کیا تقریر کی اس سے کوئی بحث نہیں تھی، اور ہوتی بھی کیسے، اس عمر میں جب اپنے پلے کچھ پڑتا تب تو ہاں جلسے سے واپسی کے بعد جو باتیں ذہن میں باقی رہ جاتی تھیں اور جس کا تذکرہ اپنے ساتھیوں کے فخریہ انداز میں کرتا تھا وہ کچھ اس قسم کا ہوتا کہ بہت بڑا تھا (مراد اس سے مجمع کی زیادتی ہوتی تھی) اور جلسہ کی سجاوٹ یوں تھی، دکانیں، فلاں فلاں چیز کی تھیں وغیرہ وغیرہ اس روز کی ایک خاص بات جو اطراف سے آنیوالے کئی لوگوں کی زبانی سنا وہ یہ تھی کہ آج فلاں فلاں اسٹیشن (ریلوے بکنگ آفس) سے گھوسی کا ٹکٹ ختم ہو گیا۔ اور خود گھوسی ریلوے اسٹیشن کا بھی یہی حال تھا۔ اللہ تعالیٰ نے قاری صاحبؒ کو عجیب محبوبیت اور کشش عطا فرمائی تھی۔

دوسری مرتبہ قاری صاحب علیہ الرحمہ کی زیارت احمد آباد میں ہوئی ۱۹۷۳ء کی بات ہے اس وقت میرا قیام

ضیاء العلوم مجلس دعوۃ الحق کرہی میں تھا (قصبہ کرہی احمد آباد کے شمال مغرب میں تقریباً بیس ۲۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے) ایک روز یہ مسرت انگیز خبر سننے میں آئی کہ قاری محمد طیب صاحبؒ احمد آباد تشریف لا رہے ہیں اور بواہر ہال میں ان کی تقریر کا پروگرام ہے چنانچہ مقررہ تاریخ میں شوق دیدار مجھے بھی احمد آباد کھینچ لے گیا پروگرام کے سلسلے میں معلوم ہوا کہ ملک احمد کی مسجد میں قاری صاحب نماز مغرب ادا فرمائیں گے اور نماز کے بعد ہی تقریر کریں گے ہم لوگ بھی وہاں پہونچے مغرب کی نماز قاری صاحبؒ کی امامت میں ادا کی گئی نماز سے فارغ ہو کر قاری صاحبؒ بواہر ہال تشریف لائے اور حاضرین کو خطاب فرمایا۔ قاری صاحبؒ کے قویٰ پر پیرانہ سالی کے اثرات نمایاں تھے پھر بھی ڈیڑھ دو گھنٹہ تقریر کی۔ اس قدر سامعین پر محویت رہی کہ وقت گذرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ مجمع ہمہ تن گوش بنا ہوا تھا کہ حضرت نے تقریر کے اختتام کا اعلان فرمایا جی تو یہ چاہتا کہ ؎ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

یوں تو قاری صاحبؒ کے قدرت بیان اور دلچسپ تعبیرات کی مثالیں ان کی مطبوعہ تقریروں اور تحریروں میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس موقعہ پر احمد آباد کی تقریر کے حوالہ سے ایک نمونہ ہدیۂ ناظرین ہے دوران تقریر اسلام میں میزبان و مہمان کی حیثیت اور ان کی ذمہ داری پر گفتگو چل پڑی اور اس سلسلہ میں ایک حدیث من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفہ اور برجستہ اس کا مفہوم اردو میں یوں پیش کیا کہ "جو شخص خدا اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کے فرائض میں سے ہے کہ مہمان کا اکرام کرے۔

عام طور پر فلیکرم کا ترجمہ یہ کیا جائیگا کہ "چاہیئے کہ اکرام کرے۔ اور یہ ترجمہ غلط نہیں کہا جا سکتا لیکن چاہیئے کے بجائے لفظ "فرائض" نے مفہوم کو جس قدر چست اور بلیغ بنا دیا نکتہ داں بلاغت سے پوشیدہ نہیں ہے۔ چاہیئے کہ اکرام کرے کہنے پر پھر یہ وضاحت کرنی پڑتی کہ امر وجوب کیلئے آتا ہے لہٰذا اس حدیث کی رو سے مہمان کا اکرام و احترام بہت ضروری ہے اب اس طوالت میں پڑے بغیر ایسا پیرایہ اختیار کیا گیا کہ جو لفظی ترجمہ نہ ہونے کے باوجود ارشاد نبوی کے ترغیبی و تاکیدی منشا کو سمیٹے ہوئے ہے اور ایک خاص لطف دے رہا ہے۔ مورخہ ۶ شوال ۱۴۰۳ھ کے دن کا وہ لمحہ بڑا تکلیف دہ تھا جس وقت یہ خبر سننے میں آئی کہ حضرت قاری صاحبؒ وصال فرما گئے۔ بیماری کی اطلاع اگرچہ پہلے سے تھی لیکن اس کے باوجود اس پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن قدرت کے فیصلے ہمارے چاہنے اور نہ چاہنے کے نہیں ہوتے۔ عشاء کے وقت جب کئی مسجدوں سے قاری صاحبؒ کے انتقال کی خبر کا اعلان کیا گیا تو ماننا ہی پڑا اور بصد افسوس یہ کہنا پڑا کہ

اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

حضرت مدنی اور قاری محمد طیب

از مرتب

حضرت مدنی حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ سے بڑے تھے بلکہ حضرت قاری صاحبؒ کے اکابر کی صف کے تھے اس وجہ سے حضرت قاری صاحبؒ بھی انکا احترام ویسا ہی کیا کرتے تھے جس طرح اصاغر اکابر احترام کیا کرتے ہیں، میں نے بارہا دیکھا ہے کہ حضرت قاری صاحبؒ مجلسوں میں اور تقریروں میں اکابر کے واقعات کے ضمن میں حضرت مدنی علیہ الرحمۃ کا بھی ذکر بڑی محبت سے کرتے تھے اور ان کی مجاہدانہ اور طالبعلمانہ زندگی کے واقعات بیان کرتے تھے، حضرت مدنی علیہ الرحمۃ سراپا تواضع تھے، وہ حضرت قاری صاحب کو اس طرح مخاطب کرتے جیسے چھوٹا اپنے بڑے کو مخاطب کرتا ہے، چاہے یہ خطاب عام مجلسوں میں ہوتا یا خطوط میں دفتر اہتمام میں جب حضرت مدنی تشریف لاتے تو قاری صاحبؒ کے سامنے دوزانو مؤدب بیٹھتے حضرت قاری صاحبؒ اپنی مسند چھوڑ دیتے اور حضرت مدنی کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جگہ بیٹھاتے، حضرت مدنی علیہ الرحمۃ خاندان قاسمی کا بڑا احترام کرتے، یہ احترام کا جذبہ ان کو حضرت شیخ الہند علیہ الرحمۃ سے ملا تھا حضرت شیخ الہند کے دل میں خاندانِ قاسمی کا بڑا احترام تھا آپ اپنے کو اس خاندان کا غلام کہتے، حضرت نانوتوی علیہ الرحمۃ تو خیر آپ کے محبوب استاد ہی تھے جن پر آپ دل وجان سے قربان تھے اس خاندان کے ہر فرد کے ساتھ حضرت شیخ الہند کا معاملہ بڑی محبت کا تھا، بلکہ شیفتگی اور فدائیت کا تھا، حضرت مدنی علیہ الرحمۃ حضرت شیخ الہند کے محبوب شاگرد تھے، استاذ سے یہ عقیدت ومحبت منتقل ہو کر شاگرد میں بھی آئی،

حضرت مدنی علیہ الرحمۃ اور حضرت شاہ انور کشمیری ایک زمانہ میں حضرت قاری صاحبؒ کے گھر ہی رہتے تھے کھانے کا نظم حضرت قاری صاحبؒ کے والد حضرت حافظ محمد احمد صاحب اپنے گھر سے کرتے تھے، اور ان کو اپنی اولاد کی طرح رکھتے تھے، حضرت مدنی علیہ الرحمۃ اپنی کتابوں میں اور خطوط میں حضرت نانوتوی کا جس والہانہ انداز میں ذکر کرتے ہیں اس سے حضرت نانوتوی کے ساتھ آپ کے قلبی تعلق کا اندازہ ہوتا ہے، یہی جوش محبت حضرت مدنی کے دل میں پوری زندگی موجزن رہا اور اس خاندان کا ہر فرد آپ کی نگاہ میں محبوب ومقبول تھا، اور کبھی بھی اس خاندان کے احترام کے خلاف کوئی بات آپ کی زبان وقلم سے صادر نہیں ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ حضرت قاری صاحبؒ جب تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے اور وہاں پریشانیوں میں مبتلا ہوئے تو حضرت مدنی نے پوری کوشش کر کے اور اپنے ہر جہتی تعلقات کو کام میں لاکر حضرت قاری صاحبؒ کو پاکستان سے ہندوستان بلوایا، اور انکے آنے پر اللہ کا شکر ادا کیا اور انکیلئے خیر مقدم جلسہ منعقد کیا اور قاری صاحبؒ کا خیر مقدم کرتے ہوئے آپ نے ان کو مخاطب کر کے یہ شعر پڑھا ؎

اے تماشا گاہ عالم روئے تو
تو کجا بہر تماشہ می روی

حضرت قاری صاحبؒ کو حضرت مدنی علیہ الرحمۃ سے بڑی تقویت تھی حضرت مدنی کے زمانہ میں بظاہر اہتمام تو قاری صاحب کا تھا مگر اس کے سہارے کیلئے حضرت مدنی کی بھاری بھرکم شخصیت تھی، قاری صاحب کو کوئی بھی انتظامی پریشانی پیش آتی حضرت مدنی علیہ الرحمۃ آگے بڑھتے اور اس کو حل کرتے بارہا ایسا ہوا کہ دار العلوم کا خزانہ خالی ہو گیا، تنخواہ کیلئے پیسہ نہیں ہے، حضرت مدنی نے اپنے تعلقات سے اس کا انتظام کر دیا، طلبا اور مدرسین کا کوئی معاملہ ہوا، حضرت قاری صاحبؒ نے حضرت مدنی کو اطلاع دی اور حضرت کے ناخن تدبیر سے معاملہ ختم ہو گیا، غرض حضرت مدنی علیہ الرحمۃ کے زمانہ میں حضرت قاری صاحبؒ کی زندگی بڑی آزاد اور بے فکر تھی، حضرت کی شفقت و محبت کا سایہ ان پر رہا کرتا تھا، شوریٰ کے ممبران میں کوئی بات پیدا ہوئی کوئی اہم مسئلہ سامنے آگیا مگر حضرت مدنی کی ایک آواز اور ان کے ایک محکم فیصلہ کے بعد اہم سے اہم معاملہ گزشت و رفت ہو جاتا اور حضرت قاری صاحبؒ کا بار ہلکا ہوتا۔

قاری صاحبؒ علیہ الرحمۃ کے ابتدائی دور اہتمام میں جب دار العلوم میں اختلاف ہوا اور اس نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ حضرت علامہ انور شاہ اور مولانا شبیر احمد عثمانی اور ان کے ساتھ طلبہ و اساتذہ کی ایک بڑی جماعت دیوبند چھوڑ کر ڈابھیل چلی گئی، اس وقت حضرت مدنی علیہ الرحمۃ نے آکر دار العلوم کو سنبھالا اور اس کی گذشتہ ساکھ کو برقرار رکھا، اور پھر جب حضرت قاری صاحبؒ کو نیابت اہتمام سے مہتمم بنا دیا گیا تو حضرت مدنی قدم قدم پر ان کو سنبھالتے رہے اور گویا انتظام و انصرام میں جس طرح ایک بڑا اپنے چھوٹے کی نگرانی کیا کرتا ہے حضرت مدنی علیہ الرحمۃ بھی حضرت قاری صاحب کی نگرانی کرتے اور ان کی پریشانیوں کا حل ڈھونڈھتے۔

کسی مدرسے یا ادارہ کی اصل بنیاد اس کے مالیات کا استحکام ہوتا ہے، حضرت مدنی علیہ الرحمۃ اسکا ہمیشہ خیال رکھتے اور اس بارے میں حضرت قاری صاحبؒ کو مناسب مشورے دیتے رہتے، اور فراہمی چندہ کی ہر ممکن سبیل پیدا کرتے، خود حضرت مدنی کا سفر فراہمی چندہ کا ایک بڑا ذریعہ تھا۔

حضرت قاری صاحبؒ کو کوئی الجھن پیش آتی اور آپ دل گرفتہ ہوتے تو حضرت مدنی ان کو بزرگانہ انداز میں تسلی دیتے اور ہمت بڑھاتے، اسی طرح کے ایک موقع پر حضرت مدنی قاری صاحبؒ کو لکھتے ہیں۔

میرے محترم! قومی و اجتماعی کاموں میں ایلوے کے گھونٹ پینے پڑتے ہیں، بلکہ جس قدر زیادہ خدمات انجام دینی ہوتی ہیں، اسی قدر زیادہ صبر و تحمل کی ضرورت ہوتی ہے، اور اسی وجہ سے انبیاء علیہم السلام کو بہت ہی زیادہ مصائب کا سامنا ہوتا ہے، "اشد الناس بلاءً الانبیاء ثم الامثل فالامثل" شاہد عدل ہے، قرآن میں جس قدر صبر کے لئے آیات ہیں کسی اور خلق اور عمل کیلئے نہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت بڑا منصب دیا ہے۔ اس میں آپ کو بہت زیادہ تحمل اور صبر کی ضرورت اور بہت زیادہ خدمت خلق کا موقع ہے، میرے محترم ان کاموں کے انجام دینے میں اجتماعی فلسفہ ہی کو کام میں لانا پڑے گا۔

انفرادی اشغال میں آپ مخلی بالطبع ہو سکتے ہیں اور استعداد کو کام میں لا سکتے ہیں کوئی آپ کا معارضہ نہیں کر سکتا، راحت و آرام کی زندگی بسر کر سکتے ہیں مگر اجتماعی زندگی کا فلسفہ ہی اور ہے، یہاں قدم قدم پر کانٹے، دلآزاری ہے،

بھنورا لو بھی پھول کا کلی کلی رس لے   کانٹا لاگے پریم کا تڑپ تڑپ جیو دے

مت گھبرائیے اور صبر و استقلال اور عالی ہمتی اور خوش دلی کے ساتھ اس باغ محمدی (علیہ السلام) کو سرسبز و شاداب کیجئے فیوض تامہ کو چار دانگ عالم میں منتشر کیجئے۔ ٹھوکریں لگیں تو آہ مت کیجئے لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ

صبر کن حافظ بسختی روز و شب   عاقبت روزے بیابی کام را..!

اخلاص و للہیت، تقویٰ اور خشیت کو ہاتھ دل زبان میں محفوظ رکھئے، یہی تامیت ہے یہی رشیدیت ہے، یہی امدادیت ہے کان اللّٰہ فی عونکم زمانہ کی تیز و تند ہوائیں سمندروں کی موجیں تھپیڑے ماریں گے، خواہشات کے زلزلے آئیں گے، اصحاب اغراض جھڑ جھڑائیں گے مگر آپ کو ہمالیہ بنا چاہیئے، برداشت کیجئے اور سعی پیہم میں مردانہ گام زنی کرتے رہئے، حضرت قاسم قدس سرہٗ العزیز نے اگر لوگوں کی چلنیں بھر بھر کر اور پاؤں دبا دبا کر ان کو راہ پر لانے کا شیوہ اختیار کیا تھا تو ان کے اخلاف صدق کو اس میں عار نہ آنا چاہیئے اور نہ گھبرانا چاہیئے اور ہمت بلند ہی رہنی چاہئے، حسن تدبر اور حکمت صدق کو اختیار کر کے سلف صالح اور ان کے فیض کو زندہ کرنا چاہئے، ہم ناکارے بدنام کنندہ نکو نامان آپ کے ساتھ ہیں۔

حسب طاقت خدمات انجام دیتے رہیئے اور انشاء اللہ دیں گے، واللّٰہ بصیر بنا وایاکم لما یحبہ ویرضا ،،

(مکتوبات شیخ الاسلام جلد دوم)

اس خط کو پڑھئے اور دیکھئے کہ حضرت مدنی علیہ الرحمۃ حضرت قاری صاحب کو کتنی ڈھارس بندھا رہے ہیں، اور ایسے موقع پر جب قاری صاحب ایک شدید الجھن میں گرفتار ہیں اور حالات کی وجہ سے گرفتہ خاطر ہیں کسی انداز میں ان کو ثابت قدم رہنے حالات کا مقابلہ کرنے اور صبر کرنے کی تعلیم و تلقین کر رہے ہیں، ایک ایک سطر سے خلوص اور جذبات محبت نمایاں ہیں، خصوصاً یہ جملہ "ہم ناکارے بدنام کنندہ نیکو نامان آپ کے ساتھ ہیں" بہت قابل غور ہے، اس سے یہ اندازہ لگانا کسی کیلئے مشکل نہیں ہے کہ حضرت مدنی کا تعلق حضرت قاری صاحبؒ سے کتنا گہرا رہا ہے اور حضرت ان کا کتنا خیال فرماتے تھے، حضرت مدنی کا یہ خط حضرت قاری صاحبؒ کے جس خط کے جواب میں ہے، چند ابتدائی سطریں اس کی بھی ملاحظہ فرمائیے تاکہ اندازہ ہو کہ حضرت قاری صاحبؒ علیہ الرحمۃ حضرت مدنی کا کتنا احترام کرتے تھے اور حضرت کے ساتھ ان کے ربط و تعلق کی نوعیت کیا تھی، حضرت قاری صاحبؒ لکھتے ہیں۔

حضرت سیدی وسندی ومخدومی ومطاعی دامت برکاتہم، سلام مسنون وشوق زیارت، عرض آنکہ بحمد اللہ مع الخیر مستدعی مزاج اقدس ہوں، حضرت اقدس کا پیغام بتوسط بھائی حافظ محمد یوسف صاحب دام مجدہم شرف صدور ہوا، جسکو بہت شوق سے سہارنپور جاکر پڑھا...... چند سطر بعد، الحمد اللہ آں مخدوم کو اس ناکارہ سے تعلق ہے، جو میرے لئے باعث سعادت اور فلاح دارین ہے، دوسرے یہ کہ حضرت کو میری اصلاح حال کی طرف بھی توجہ ہے، اس لئے والانامہ میں ہدایت ونصیحت کا پہلو بھی اختیار کیا گیا ہے، مجھے اس سے اپنے حسن احوال پیدا ہوجانے کی توقع ہوتی ہے، وما ذالک علی اللہ بعزیز، تیسرے اس وجہ سے کہ حضرت نے مجھ میں سمع قبول اور طاعت کی گنجائش متصور فرمائی اور نصیحت کا محل تصور فرمایا جس سے ناصحانہ خطاب فرمایا اس سے اس نالائق کو حسن انجام کی توقع بندھتی ہے، اور چوتھے اس وجہ سے کہ حضرت نے اپنے وابستوں سے میری صفائی کرادینے کی سعی فرمائی جس سے اندازہ ہوا کہ مجھے بھی اپنے وابستوں میں شمار فرمایا گیا ہے اور یہ میرے لئے انشاء اللہ باعث نجات اور ترقی درجات ہے۔

بہرحال ان وجوہ سے یہ ہر دو پیغامات میرے لئے باعث انبساط وشرح خاطر ہوئے اور حضرت کیلئے بے ساختہ دعا زبان سے نکلی، حق تعالیٰ احسن احوال میں جلد زیارت نصیب فرماکر ہمیں بلا واسطہ استفادہ برکات کا موقع نصیب فرمائے۔ (حاشیہ مکتوبات شیخ الاسلام جلد دوم)

یہ خط بڑا طویل ہے اور ایک خاص نزاع کے بارے میں لکھا گیا ہے، مجھے ان ابتدائی سطروں سے محض یہ بتلانا ہے کہ حضرت قاری صاحبؒ علیہ الرحمۃ کا معاملہ حضرت مدنی کے ساتھ بالکل اس طرح کا تھا جس طرح ایک ارادت مند وعقیدت مند مرید کا اپنے شیخ سے ہوتا ہے چنانچہ قاری صاحب کے خط کی یہ ابتدائی سطریں اس کا بین ثبوت ہیں۔

مجھے اسکا دعویٰ نہیں ہے کہ حضرت قاری صاحب کا حضرت مدنی سے کبھی اختلاف نہیں ہوا یا حضرت مدنی ہمیشہ حضرت قاری صاحب سے ہر معاملہ میں متفق رہے، فکر ونظر کا اختلاف تو ہمیشہ رہا ہے، خصوصاً سیاسی معاملات میں دونوں کی راہ الگ تھی، نیز دار العلوم کا اتنا بڑا انتظام اور حضرت مدنی اور حضرت قاری صاحب دونوں ہی اس نظام میں شریک عمل اس وجہ سے یہ فطری بات ہے کہ دونوں بزرگوں کا ہر ہر معاملات میں توافق ممکن نہیں تھا، مگر ان سب کے باوجود ان دونوں حضرات کے دل میں ایک دوسرے سے محبت عقیدت اور احترام وشفقت کا جذبہ ایک دوسرے کیلئے تھا اور ان میں کا ہر ایک دوسرے کا خیال اور اس کی خیر خواہی میں کوشاں رہتا تھا۔

ایک خط میں حضرت مدنی حضرت قاری صاحب کو لکھتے ہیں۔

میں ہمیشہ کا خادم ہوں مگر نالائق، آپ حضرات بالخصوص حضرت نانوتوی قدس سرہ العزیز کے خاندان کا خیر خواہ ہوں مگر اکھڑ، دریوزہ گر ہوں مگر ناکارہ غلام ہوں، مگر بیوقوف، میری عین خواہش ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاف اس طریقہ پر مضبوطی سے قائم رہیں جس پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ چلتے رہے اور

ہم لوگ استادوں کو چلایا میں جب ان کے خلاف صدق میں سے کسی کو اس طریقہ سے دور اور خلاف پاتا ہوں تو بہت زیادہ متاثر ہوتا ہوں۔ (مکتوبات جلد دوم)

میں نے اوپر کہیں ذکر کیا ہے کہ کسی ادارہ کی اساس اس کا مالیاتی نظام ہوتا ہے اگر یہ اساس مضبوط ہے تو وہ ادارہ مضبوط ہے ورنہ اس ادارہ کا نظام برقرار نہیں رہ سکتا دارالعلوم کا نظام بڑا پھیلا ہوا ہے اس کے مالیہ کا سارا دارومدار عوامی چندہ پر ہے، فراہمی مالیات کی ذمہ داری اصلاً مہتمم کا کام ہے مگر جب تک حضرت مدنی زندہ رہے وہ دارالعلوم کے مالیہ کو مضبوط رکھنے کی اپنے طور پر بھرپور کوشش کرتے رہے بلکہ صحیح یہ ہے کہ حضرت مدنی کی موجودگی میں حضرت قاری صاحب ایک طرح اس کی طرف بے فکر رہتے تھے، اور جب کوئی ضرورت ہوتی حضرت سے عرض کرتے اور حضرت مدنی کے توسط اور ان کی توجہ سے وہ ضرورت پوری ہو جاتی، حضرت مدنی دارالعلوم کی ترقی اور اس کی خیرخواہی میں ہر وقت لگے رہتے چنانچہ حضرت قاری صاحب کو ایک طویل خط کے آخر میں لکھتے ہیں۔

" امور ذیل کی طرف بھی توجہ فرمائیں۔

(۱) حیدرآباد سے اگر ٹھیکہ دار صاحب کی رقم نہ آئی ہو تو مطالبہ فرمائیں۔

(۲) جدید حجروں میں جن کے چندے آچکے ہیں ان پر پلاسٹر کرا دیا جائے۔

(۳) سیٹھ عبدالحکیم صاحب کو وعدہ کی یاد دہانی کی جائے۔ (شیخ الاسلام کے چند نایاب خطوط)

حضرت مہتمم صاحب نے ایک دفعہ حضرت مدنی کو خط لکھا۔

"قرضہ فنڈ میں بیحد تنگی ہے، پیشگی تنخواہ جو پہلے سے بند ہیں یا جب دیا جاتا تھا اس میں کچھ قید و بند عائد کر دی گئی ہیں لوگوں کی ضروریات متقاضی ہوتی ہیں کہ تنخواہ سے زائد بطور قرض وصول کریں مگر قرضہ فنڈ میں کل تین سو روپے ہیں ...... اگر اس فنڈ میں ایک ہزار روپیہ ہر وقت رہے تو بفراغت تمام اس فنڈ سے بڑے چھوٹے مستفید ہو سکتے ہیں، ایسی توسیعات میں نظر صرف حضرت ہی پر جاتی ہے، یہ فنڈ چونکہ بدر کار اس امال نہیں ہے اس لئے کسی بڑے متول کو یا کوئی کو وقیع شخصیت ہی اس میں رقم دینے پر آمادہ کر سکتی ہے اس سفر میں کلکتہ وغیرہ میں اس کے لئے ضرور سعی فرمائیں،

حضرت مدنی اس کے جواب قاری صاحب کو تحریر فرماتے ہیں،

" قرضہ فنڈ کے متعلق جو کچھ ارشاد ہے اس کی فکر کروں گا دعوت صالحہ اور کار لائقہ سے فراموش نہ فرمائیں۔ (ایضاً)

اسی سلسلہ کا درج ذیل خط بھی ہے جس سے معلوم ہو گا کہ حضرت مدنی علیہ الرحمۃ کو دارالعلوم کی ترقی سے کتنی دلچسپی تھی اور وہ حضرت قاری صاحب کے کاموں کو کتنا ہلکا بنائے رہتے تھے، حضرت مدنی کا خط ملاحظہ فرمائے جو قاری صاحب کے نام ہے۔

محترم المقام زید مجدکم:۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مزاج مبارک مہربانی فرما کر جلد از جلد وہ زمینیں جو کہ دار العلوم کی ضروریات کیلئے درکار ہیں ان کے نمبر خرید وغیرہ ترتیب دے کر ایک فہرست جلد از جلد تیار کریں وہ حسب ذیل ہیں۔

دار الطبہ جدید کی جنوبی جانب کی زمینیں جس میں بیری والا نمبر اور درمیانی نمبر آتے ہیں اور مغربی جانب کے پورے وہ نمبر جو کہ دار الطبہ کی دیوار کے نیچے سے جانب غرب کو جاتا ہے اور وہ قطعہ جو کہ جنوبی سڑک واقعہ نزد مسجد شاہ ولایت سے شمالاً موجودہ تالاب واقع باب جدید غربی تک ختم ہو جاتا ہے، اور دار الطبہ کی شمالی جانب کے نمبر جو کہ جدید پانخانوں سے لیکر خانقاہ کی آبادی یعنی حضرت شاہ صاحب مرحوم کی دیوار تک اور اسی طرح سے باب جدید دار الطبہ غربی سے لیکر غربی جانب سیدھ میں سڑک تک وہ جملہ نمبر جن میں موجودہ تالاب بھی واقع ہے ان سب کو تحریر فرمائے، غرضیکہ وہ جملہ نمبر جنکی دار العلوم کو ضرورت ہے مفصلاً درج فرمائے اور سب کو درج فرمانے کے بعد وہ نمبر جن کی اشد اور فوری ضرورت ہے ان کو بعد میں انہیں الفاظ کے ساتھ ظاہر فرمائے گا ان تمام نمبروں میں سے فوری اور سخت ضرورت فلاں نمبر کی ہے...... اس تفصیل کو بہت جلد مکمل کرا کر مسٹر محمد سلیمان انصاری پارلیمنٹری سکریٹری چیمبر لکھنؤ کے پاس بھیجدیں اور خیال رکھیں کہ حکومت سے کسی قطعہ کے متعلق کا کاروائی ہو جاوے تو فوراً اس پر قبضہ کر لیا جائے اور نہ صرف حدبندی کر لی جائے بلکہ دیوار احاطہ بنوالی جائے اور ہرگز کسی قسم کی سفارش حکومت کے فیصلہ کے بعد نہ سنی جائے حکومت جو قیمت لگائے اسی کو دیا جائے۔ (ایضاً)

حضرت قاری صاحب علیہ الرحمۃ کے زمانہ اہتمام میں دار العلوم کی مالیاتی یا تعمیراتی جو ترقی ہوئی ہے اس کی پشت پر حضرت مدنی علیہ الرحمۃ کی گرانقدر عظیم المرتبت بارسوخ اور موثر ومحبوب ومقبول شخصیت تھی، مسند اہتمام پر بلا شبہ حضرت قاری صاحب علیہ الرحمۃ متمکن تھے مگر دار العلوم کی پوری مشینری کا کل پرزہ حضرت مدنی علیہ الرحمۃ کی متحرک شخصیت مشین سے گھوم رہا تھا، اور یہ فی الاصل حضرت قاری صاحب علیہ الرحمۃ کے ساتھ دار العلوم کے ساتھ اور اکابر کے اخلاص صدق کے ساتھ حضرت مدنی کے گہرے ارتباط وتعلق کی بات تھی، حضرت مدنی سے دار العلوم دیوبند کو جتنا فائدہ پہونچا اس کی نظیر نہیں ہے، قاری صاحب کو بھی اس کا پورا احساس تھا اور یہی وجہ ہے کہ حضرت قاری صاحب ہر چھوٹے بڑے امور میں حضرت مدنی کا مشاورہ معلوم کر لیتے تھے، اور بہت سے مواقع پر اپنی رائے کے خلاف حضرت مدنی کے

منشا کی تکمیل کرتے تھے۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی جب دیوبند کے صدر مہتمم تھے اور حضرت قاری صاحب مہتمم کا عہدہ سنبھالے ہوئے تھے، اس زمانہ میں کئی ایسے موڑ آئے کہ مولانا شبیر احمد صاحب اور قاری محمد طیب صاحب کے مابین شدید اختلاف پیدا ہوا، حضرت عثمانی کی بھاری بھرکم شخصیت کے سامنے حضرت قاری صاحب بھینچے بھینچے سے رہتے تھے اس زمانہ میں حضرت مدنی کی شخصیت حضرت قاری صاحب کیلئے بڑا سہارا تھی۔ حضرت نے ہر موڑ پر قاری صاحب کو نیک مشورے دیے اور ان کو صبر واستقامت کی تلقین کی اور ان کو ہر طرح سے تقویت پہونچائی۔

افسوس کہ حضرت مدنی علیہ الرحمۃ کے انتقال کے بعد حضرت کے خاندان کا قاری صاحب کے ساتھ رشتہ آہستہ آہستہ کمزور ہوتا چلا گیا اور قاری صاحب کی حیات کے اخیر زمانہ میں تو یہ رشتہ بہت کمزور پڑ گیا، جس کا نقصان متعدی ہوا اور اس افتراق و انتشار سے جو نقصان ہوا وہ اب ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، کاش اب بھی ارتباط و تعلق کی ان دونوں خاندانوں میں وہ بات ہوتی جو پہلے تھی تو امت کو اس سے بڑا فائدہ پہونچتا۔

۔ جیسا آدمی سامنے مخاطب ہوگا ویسا ہی دعوت کے طریقے ہوں گے ایک وہ ہیں جو سادہ لوح ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ و رسول کا نام لیا گیا تو وہ گردن جھکا دیتے ہیں۔ ان کے مطالبات نہیں ہوتے ہیں اور نہ علم کی ضرورت سمجھتے ہیں بس وہ حکم جاننا چاہتے ہیں کہ شریعت کا حکم معلوم ہو جائے تو ان کیلئے موعظت ہے کہ وعظ و نصیحت کر دو ان کے لئے کافی ہو جائے گا اور بعضے حجت پسند ہوتے ہیں یعنی کٹھ حجت کہ جب تک ان کے مسلمات سے ان پر حجت قائم نہ ہو وہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے تو انکے لئے مجادلہ رکھا اور مجادلہ بھی علمی انداز پر، جھگڑا بنا کے نہیں۔ پھر اس کا خیال رہے کہ اس میں سخت کلامی نہ ہو۔ بلکہ معروف طرز پر ہو۔ (حکیم الاسلام)

حضرت صحابہؓ کی ترقی کی وجہ ۔ حضرات صحابہؓ کی جو ترقی ہوئی ہے وہ دو چیزوں سے ہوئی ہے ایک کثرت صلوٰۃ اور ایک کثرت جہاد، جہاد میں تو انہوں نے نفس کو مار ڈالا اور کچل ڈالا اور نماز میں توجہ الی اللہ اور تعلق مع اللہ پیدا کیا تو صحابہؓ کی جو سب سے بڑی عبادت تھی وہ یا تو جہاد یا کثرت صلوٰۃ اسی سے ان کی ترقی ہوئی اور اسی میں وہ کامیاب ہوئے اور ان سب سے بڑھ کر سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور آپ کی مجلس میں حاضری یہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مخصوص دولت تھی۔

(حکیم الاسلام)

مولانا معراج الحق صاحب
دارالعلوم دیوبند

مرنجاں مرنج شخصیت

"۱۱ محرم ۱۴۰۵ھ کو میں دارالعلوم دیوبند تذکرہ طیب کے سلسلے میں اپنے اساتذہ واکابر سے مشورہ لینے اور ان کی رائے معلوم کرنے کے لئے حاضر ہوا اس سلسلے میں حضرت الاستاذ مولانا معراج الحق صاحب مدظلہٗ کے پاس بھی حاضر ہوا اور میں نے قاری صاحب سے متعلق ان سے مندرجہ ذیل سوالات مختلف مجلسوں کے، جن کا جواب مولانا نے بڑے انشراح سے دیا مولانا کے جوابات میں نوٹ کرتا رہا جواب اس نمبر کی زینت ہیں جوابات کو حتی الامکان مولانا ہی کے الفاظ میں ضبط کیا گیا ہے۔

(۱) میں نے مولانا سے سوال کیا کہ آپ کی دارالعلوم میں ملازمت کی ابتدا کس طرح ہوئی آپ نے درخواست دی تھی یا آپ کو طلب کیا گیا تھا اور وہ زمانہ اہتمام کس کا تھا؟ مولانا نے فرمایا کہ

میری حاضری قاری محمد طیب صاحبؒ کے زمانے میں ہوئی اور وہ اس طرح کہ میں حیدرآباد میں ملازم تھا ایک دفعہ دارالعلوم حاضر ہوا یہ وہ وقت تھا جب دارالعلوم سے شیوخ دارالعلوم حضرت علامہ کشمیریؒ و علامہ عثمانی اور ان کے رفقاء دارالعلوم سے علیحدہ ہو چکے تھے اس وقت دارالعلوم کو اساتذہ کی ضرورت تھی حضرت قاری صاحب سے جب میری ملاقات ہوئی تو انھوں نے مجھ سے دارالعلوم میں رہ جانے کو کہا میں نے عرض کیا کہ دارالعلوم کی ملازمت میری لئے سعادت ہے حضرت قاری صاحبؒ نے پوچھا کہ آپ تنخواہ کیا لیں گے میں نے کہا کہ دارالعلوم کی ملازمت کیلئے تنخواہ کا مطالبہ نہیں کروں گا وہ بار بار اصرار کرکے پوچھتے رہے اور میرا ہر دفعہ یہی جواب رہا آخر میں مجھ سے پوچھا کہ آپ کی حیدرآباد میں تنخواہ کیا ہے میں نے کہا کہ میری تنخواہ ایک سو پچیس روپیہ ہے قاری صاحب نے کہا کہ اتنی تنخواہ تو میں نہیں دے سکتا میں نے ان سے عرض کیا کہ میں تو پہلے ہی سے کہہ رہا تھا کہ میں تنخواہ کا

مطالبہ نہیں کروں گا پھر میں نے عرض کیا کہ مجھے تین چیزوں کا شوق ہے، کھانے، کپڑے اور چائے کا اسکا انتظام کردیں اور میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ تنخواہ کا مطلب ہے تن، خواہ اس لئے میرے کھانے پہننے کا انتظام ہو جاتے بس وہ میرے لئے کافی ہو دارالعلوم کو میں ماں کہتا ہوں اور میں اپنی ماں سے زیادہ کا مطالبہ نہیں کرتا چنانچہ میرا تقرر پچاس روپیہ پر ہوا پینتالیس روپیہ تنخواہ تھی اور پانچ روپیہ الاؤنس۔

۲۔ میں نے مولانا سے سوال کیا کہ آپ کا تعلق حضرت قاری صاحب سے حاکم و محکوم کا بھی تھا کیا آپ نے کبھی محسوس کیا کہ قاری صاحب نے آپ کے ساتھ حاکمانہ برتاؤ کیا ہے؟ مولانا نے فرمایا۔

"کبھی نہیں ملازمین کے ساتھ قاری صاحب کا معاملہ ہمیشہ رواداری، اغماض اور چشم پوشی شفقت و مروت کا تھا کبھی انھوں نے اپنے کو حاکم بنا کر ہمارے سامنے پیش نہیں کیا قاری صاحب فرمایا کرتے تھے کہ کام ضابطہ سے نہیں ہوا کرتا ہے بلکہ رابطہ سے ہوا کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ قاری صاحب کی اس نرمی سے لوگوں نے بہت غلط فائدہ اٹھایا قاری صاحب کا معاملہ یہ تھا کہ ماتحتوں پر خواہ کوئی بھی ہو بے انتہا اعتماد کیا کرتے تھے اور اس اعتماد کا لوگ غلط فائدہ اٹھاتے تھے جس سے قاری صاحب کی شخصیت مجروح ہوا کرتی تھی لیکن قاری صاحب اپنی فطری نرمئ طبع اور رواداری کی بنیاد پر کبھی اپنے ماتحتوں سے تیز لب و لہجہ میں محاسبہ نہیں کیا کرتے تھے اس سے بسا اوقات دارالعلوم کا نقصان ہو جایا کرتا تھا"

۳۔ میں نے مولانا سے تیسرا سوال کیا کہ آپ نے حضرت قاری صاحب کی کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں اور ان کی کتابوں اور تحریروں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ مولانا نے فرمایا کہ

"میں نے قاری صاحب کی بہت کم کتابوں کا مطالعہ کیا ہے ایسی باتیں جن میں بہت زیادہ علمی لطائف ہوں میرے مزاج کے مطابق نہیں ہوتی ہیں ان کی تحریریں نقل سے زیادہ عقل اور استدلال کا حصہ نظر آتا ہے قاری صاحب کو اس میں کمال تھا کہ وہ اپنی ذہانت اور اپنی قوت عقلیہ سے معمولی بات کو بھی بڑے موثر انداز اور ایسے عقلی اسلوب میں پیش کرتے کہ اس کا اثر مخاطب یا قاری پر گہرا پڑتا قاری صاحب کا مطالعہ وسیع نہیں تھا البتہ ان کی قوت عقلیہ بڑی قوی تھی استدلال اور استنباط کا ان کو ملکہ تھا۔"

۴۔ میں نے مولانا سے پوچھا کہ آپ کی رائے قاری صاحب کی تقریر کے بارے میں کیا ہے؟ مولانا نے جواب دیا

"کہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کے بعد قاری صاحب جیسا مقرر و خطیب ہندو پاک میں نظر نہیں آتا اللہ نے خطابت و تقریر میں ان کو یگانۂ روزگار بنایا تھا مولانا نے دوران گفتگو یہ بھی فرمایا کہ قاری صاحب ابتداء میں پوری تیاری کے بعد تقریر کیا کرتے تھے کتابوں کا مطالعہ کرتے مضمون کو اخذ کرتے پھر اس کی تنہائی میں سٹنگ کرتے اور اس کو پورے طور پر اپنی قوت حافظہ میں محفوظ کرتے اور پھر تقریر کرتے یہ طریقہ ان کا عرصۂ دراز تک تھا اس سلسلے میں مولانا نے فرمایا کہ مولانا حکیم عبدالحکیم صاحب مدراسی حضرت مہتمم صاحب کے یہاں تشریف فرما تھے اور ان کا قیام مہتمم صاحب کے کمرہ ہی میں تھا میں حکیم صاحب سے ملنے کیلئے حاضر ہوا تو ایک گوشہ میں میں نے کاغذوں کا انبار دیکھا اور پھر مجھ سے حکیم صاحب نے فرمایا کہ یہ حضرت مہتمم صاحب کی ان تقاریر کے مسودے ہیں جو اس وقت ہر جمعہ کو حضرت مہتمم صاحب دیوبند کی جامع مسجد میں تقریر کرنے سے پہلے تیاری کے لئے نوٹ کر کے رکھا کرتے تھے مولانا نے فرمایا کہ مہتمم صاحب تقریر ہی سے تحریر کی طرف آئے تھے اسلئے جو رنگ تقریر کا تھا ان کی تحریر میں بھی وہی رنگ تھا"

۵۔ میں نے حضرت مولانا سے پوچھا کہ حضرت مہتمم صاحب کی مجلس کے بارے میں آپ کا تاثر کیا ہے؟ مولانا نے فرمایا

"کہ حضرت قاری صاحب کی مجلس بڑی پاکیزہ ہوا کرتی تھی نہ کسی کی غیبت نہ کسی پر طعن اور نہ کوئی ایسی بات جو عالمانہ شان و وقار کے خلاف ہو شروع سے اخیر تک ان کی مجلس میں علم و حکمت ہی اور اصلاح و ارشاد ہی کی بات ہوا کرتی تھی"

۶۔ میں نے مولانا سے پوچھا کہ آپ نے عرصہ تک نائب مہتمم کی حیثیت سے بھی کام کیا ہے اس عرصہ میں قاری صاحب کا معاملہ آپ کے ساتھ کیسا رہا؟ مولانا نے فرمایا

"قاری صاحب میرے اوپر بے انتہا اعتماد کیا کرتے تھے اتنا کہ کہا نہیں جا سکتا فرماتے تھے کہ میں نے تو مولانا معراج الحق صاحب کے سامنے اپنے کان بہرے کر دیئے ہیں

۷۔ میں نے مولانا سے پوچھا کہ آپ نے حضرت قاری صاحب کے ساتھ سفر بھی کیا ہوگا؟ سفر میں قاری صاحب کا معاملہ اپنے رفقائے سفر کے ساتھ کیا تھا؟ مولانا نے فرمایا

"کہ مجھے قاری صاحب کے ساتھ سفر کرنے کا بہت کم ہی اتفاق ہوا ہے لیکن میں نے انکو سفر میں رفقائے سفر کے ساتھ بہت ہی منشرح پاتا تھا وہ عموماً سفر میں دلچسپ باتیں کیا کرتے تھے کبھی قصے سناتے کبھی اشعار سناتے سفر ان کے ساتھ باعث گرانی نہیں ہوتا تھا"

۸۔ میں نے مولانا سے پوچھا کہ دوران سفر کا کوئی خاص واقعہ مولانا نے فرمایا

"کہ ایک دفعہ میں اور وہ بمبئی سے ہوائی جہاز کا سفر کر کے دہلی آئے جب ہوائی جہاز اترنے کے قریب ہوا تو جہاز کا وہ پہیہ نہیں کھل رہا تھا جو زمین سے لگتا ہے اور اس پر چکر کھا کر جہاز رکتا ہے۔ جہاز والے پریشان تھے اور ان کی ایک بس نہ چل رہی تھی اخیر میں انھوں نے یہ اعلان کیا کہ جہاز میں فلاں خرابی ہے اور ہم جہاز کو اڑا کر اس کا تیل ختم کر رہے ہیں یہ ستر پچھتر آدمیوں کی سیٹ کا جہاز تھا جہاز میں تقریباً پینتیس آدمی تھے ان کو آگے کی کھڑکیوں کی طرف کر دیا گیا اور اعلان ہوا کہ کھڑکیوں کا جوں ہی پٹ کھلے سب لوگ کود جائیں سارے مسافر سراسیمہ اور خائف تھے لیکن میں نے قاری صاحب کو دیکھا کہ وہ نہایت سکون کے ساتھ آنکھ بند کئے ہوئے سر جھکائے بیٹھے ہیں انکے اوپر کسی طرح کی پریشانی کا کوئی اثر نہیں تھا اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ حضرت قاری صاحب کی قوت قلبیہ بھی بڑی غضب کی تھی۔ بہرحال جہاز خیریت سے نیچے اتر گیا بعد میں معلوم ہوا کہ پہیہ تو کھل گیا تھا البتہ پہیہ کھلنے پر جو روشنی جلا کرتی ہے وہ روشنی خراب تھی اور جل نہیں رہی تھی جس کی وجہ سے پائلٹ نے سمجھا تھا کہ پہیہ نہیں کھلا ہے"

۹۔ میں نے حضرت مولانا معراج الحق صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ نے کبھی قاری صاحب کو تحریر و تصنیف میں مشغول بھی دیکھا ہے؟ اس وقت ان کا کیا عالم رہتا تھا؟ فرمایا

کہ جب وہ تحریر و تصنیف میں مشغول ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ اس دنیا میں نہیں ہیں اور گھنٹوں اسی عالم میں قلم و کاغذ سے شغل جاری رکھتے مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ بسا اوقات قاری طیب صاحب رات رات بھر بلا تبدیلی مجلس کے

مستقل لکھا کرتے تھے اور فجر کی اذان کے وقت ان کو معلوم ہوتا کہ اب صبح ہو گئی ہے"

۱۰۔ میں نے حضرت مولانا سے پوچھا کہ حضرت قاری طیب صاحب کے بعد ہند و پاک میں قاسمی علوم کی تشریح و تفہیم کرنے والا اب کون ہے؟ آپ نے فرمایا کہ کوئی نہیں پھر تھوڑی دیر کے بعد فرمایا

کہ ان کے بعد کسی کا نام کس درجہ میں لیا جا سکتا ہے تو مولانا اکبر آبادی ہیں"

۱۱۔ میں نے مولانا سے سوال کیا کہ کیا آپ کے نزدیک قاسمیت اور دیوبندیت ایک ہی چیز ہے اور اگر یہ ایک ہی چیز ہیں تو آپ کے نزدیک قاسمیت کی تعبیر کیا ہے؟ مولانا نے فرمایا کہ

قاسمیت اور دیوبندیت در حقیقت ایک ہی چیز ہے قاسمیت یا دیوبندیت حدیث و فقہ اور تصوف کو ایک ساتھ لیکر چلنے کا نام ہے جو جماعت ان چیزوں کو ایک ساتھ لیکر چلتی ہے اور غلو کی راہ سے ہٹ کر اعتدال کی راہ اختیار کرتی ہے اسی کا نام قاسمی یا دیوبندی جماعت ہے۔ تصوف سے مراد ہمارے اکابر و اسلاف کا تصوف ہے اہل بدعت کا تصوف نہیں۔"

۱۲۔ میں نے آخری سوال حضرت مولانا سے کیا کہ آپ نے حضرت قاری صاحب اور حضرت مدنی علیہ الرحمہ دونوں کی ملاقاتیں دیکھی ہیں یہ جب آپس میں ملتے تو ان دونوں کا حال کیا ہوتا؟ مولانا نے فرمایا

کہ حضرت مدنی مولانا نانوتوی اور حضرت حافظ احمد صاحب کی خاندان کا بڑا احترام کرتے تھے حضرت مدنی جب حضرت قاری صاحب کے پاس جاتے تو ایک ملازم کی طرح با ادب بیٹھتے اور پھر حضرت قاری صاحب اپنی مسند چھوڑ کر ہٹ جاتے اور اپنی جگہ ان کو بٹھلاتے مولانا نے فرمایا یہ میری آنکھوں دیکھا واقعہ ہے۔"

مولانا حکیم گنگوہی
عبدالرشید محمود گنگوہی

تلخ و شیریں

مرتب تذکرہ طیب نے حضرت مخدومنا المکرم مولانا حکیم محمود رشید گنگوہی زید مجدہم سے تحریر درج ذیل سوالات کئے تھے ممدوح نے ان کا جو جواب دیا ہے اسکو جوں کا توں شائع کیا جا رہا، عنوان بالا مرتب کا تجویز کردہ ہے۔

(۱) حضرت قاری صاحب کے بارے میں آپ کا عام تاثر کیا ہے؟

(۲) آپ کی نظر میں قاری صاحب کی سب سے نمایاں خصوصیت کیا تھی؟

(۳) حضرت قاری صاحب کے ساتھ آپ کے ربط و تعلق کی نوعیت کیا تھی؟

(۴) کوئی خاص واقعہ جس کا آپ سے اور حضرت قاری صاحب سے تعلق ہو، یا جس سے خصوصیت کے ساتھ آپ متاثر ہوئے ہیں؟

(۵) حضرت قاری صاحب کی تصانیف میں سے آپکے نزدیک سب سے اہم تصنیف کون سی ہے اور اسکی وجہ خصوصیت کیا ہے، آپ کے نزدیک انکی تصانیف کا نمایاں وصف کیا تھا۔

(۶) حضرت قاری صاحب نے دارالعلوم دیوبند کی طویل مدت تک بحیثیت مہتمم جو خدمت انجام دی ہے اس سلسلہ میں اپنے تاثرات سے نوازیں۔

(۷) حضرت قاری صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کے انتقال سے علمی و دینی حلقوں میں جس خلا کا احساس ہے آپ کے خیال میں کیا اسکے پر ہونے کی کوئی صورت ہے؟

(۸) قاری صاحب کے علمی سرمایہ سے موجودہ اور آئندہ نسلوں کے مستفیض ہونے کی آپ کی نظر میں مناسب صورت کیا ہے؟

(۹) قاری صاحب کے بعد ہند و پاک میں علوم قاسمیہ اور حکمت قاسمیہ کی تفہیم و تشریح اور ترجمانی کرنے

والا آپ کی نظر میں اب کون ہے؟

(۱) جامعیت علمیہ متنوعہ پر ان کی نظر کی وسعت، حسن تعبیر، خطابت متین، زبان سہل ممتنع، جدال وخصام سے بلند سیرت، یا یہ کہیے کہ تاب مقاومت مفقود،

(۲) حلم ورفق، قوت برداشت، اغماض وسماحت، گویا تبع لہ الحلم فی نصبر فکان لا یغاضبہ شیئی ؎

(۳) ربط وتعلق کی نوعیت قدیم وآبائی روابط ہیں۔ حضرات رشید وقاسم کی مثال اخوت، دونوں کی نسبتوں کا متقارب ومتجانس ہونا، زندگی اور جد وجہد کے ہر مقام پر اتفاق، پھر میرے اور ان کے باپ احمد ومسعود کو ہر گز حلاوت اخوت " اخوای وموفسای ومحمد ثانی کی سی بات،

(۴) خاص واقعہ کوئی نہیں، انکی جریت علمی مضامین میں خوشگوار وحسین اور منطقی ترتیب اور کمال استاج کہ سننے والے کا قلب بھی تصدیق کرے اور دماغ بھی دیے تاثر خوشگوار بھی ہو سکتا ہے ناخوشگوار بھی، خوشگوار کا تو یہ جواب ہے جو عرض کیا۔ ناخوشگوار بھی سن لیجئے وہی تاب مقاومت کا فقدان ڈھیلا پن ہوا کے رخ پر اڑ جاؤ، پانی کے بہاؤ پر بہہ جاؤ، زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز کی قوت وجرأت سے فارغ، بساز کی منفعل طبیعت، لڑنا اور اڑنا مزاج ہی نہ تھا، آخر ایام حیات کے واقعات کی تاویل وتحوار یہاں تو اڑنے لڑنے اور اصرار کی ایک مثال قائم کر گئے، یہ خوبی بھی ہے اور بعض محل ومواقع پر کمزوری بھی خصوصاً اس دور یاجوجی اور فتن عمومی عمیا میں کہ صبح وشام نئے فتنے آ رہے ہیں اور ٹوٹ رہے ہیں بدل رہے ہیں، صبح کو مسلم شام کو کافر وقد دخلوا بالکفر وہم قد خرجوا بہ ای وغلوا من باب واحد وخرجوا من باب آخر، اس وقت تو سخت تصلب، غیر لچکدار عزم وعمل اور سیرت کی ضرورت ہے، مضبوط ثقافت اور اتقان فی العلم والعمل درکار ہے، خصوصاً ایک علمی مرکزی ادارے کے مہتمم کیلئے جو ایک بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے۔ ان حالات میں ضرورت ہے ید آہن کی، دشمن کیلئے بأس شدید دوستوں کے لئے منافع درکنار انقلاب آفریں دعوت واصلاح والے کی۔ خارا شگاف وآہن گداز عزم کے پیکر کی حلم ورحم صدیقی کے ساتھ واللہ لاقتلن من فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ کا ساتھ ہر صدیقی رکھنے والے کی،

(۵) یوں تو سب تصانیف خصوصیات گوناگوں کی حامل ہیں مگر "اسلام اور [illegible] اقوام" بہترین جائزہ ہے، اس سے قبل کسی نے اس طرح بھرپور تجزیہ نہیں کیا، دوسری "التشبہ فی الاسلام" بہت وافی ہے اپنے موضوع پر اور شافی بھی اس موضوع پر بسط وجامعیت کے ساتھ ہر گوشہ پر استدراک اس سے پہلے نظر سے نہیں

گزرا۔

(۶) دار العلوم کا بیرونی دنیا میں تعارف اسکی حسی، مادی تعمیری ترقی، بہت سے مفید شعبوں کا اضافہ وغیرہ وغیرہ اسکا اعتراف نہ کرنا بے انصافی ہوگی۔ البتہ اس آخری ربع صدی میں نمایاں طور پر کمیت زیادہ کیفیت کم قول کم شمار زیادہ، یہ خیر القرون سے بعد کا بھی نتیجہ ہے، حضرات شیخین کے ادوار کا فرق سامنے ہے،

یہ ادوار کا فرق ہے ورنہ درجہ بدرجہ منتظر الامارہ سب تھے، وہاں نہ روحانیت و مادیت میں کوئی کشمکش تھی نہ سیاست و دیانت میں کوئی مزاحمت تھی، یہ اس دور مادہ پرستی و مغرب زدگی کے ماحول کا بھی اثر ہے، پھر اسلاف دار العلوم کی تاریخ سے علاء بے اعتنائی اس سے سرسری طور پر گزرنا از کار تور ہے کردار متغیر منحرف، آخری ایام کی تاریخ بلند از تاریل، شواہد میں جشن صدسالہ ہی کافی ہے۔ ارشاد ولی اللہ ایاکم و غنی طاغ تیتکلف بزی الاعاجم و یدا خل فی مضادبة الجاجم اس سب کے باوجود بھی یہ اعتراف ناگزیر ہے کہ ان کے عصر اہتمام میں دار العلوم کو مالی حسی فائدہ بہت پہونچا، اور خود انکی ذات کو بھی،

(۷) جی ہاں! اسکے پر ہونیکی صورت نہ ہے، حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کی حیات میں مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم جب مکہ مکرمہ حاضر ہوتے تو ایک روز حضرت حاجی صاحب سے عرض کیا کہ حضرت ہمارے مدرسہ دیوبند کیلئے دعا فرمائیں، فرمایا اچھا آج وہ آپ کا مدرسہ ہے ہمارا نہیں ہے؟ یہاں یہ حال ہے کہ اتنے برس گزرے مدرسہ کیلئے آستانہ قدس پر دعا و ابتہال کرتے، آج وہ آپ کا ہوگیا ہمارا نہیں رہا، بس ایسے ارباب دعا و ابتہال مہیا کر لیجئے خلا پر ہو جائے گا، حضرت سید احمد بریلوی قدس سرہ کو اس زمین سے بوئے علم محسوس ہوئی، بزرگان دیوبند کا خواب، نودرہ کی عمارت کا خط و نشان حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عصائے مبارک سے، یہ استحقاق پیدا کیجئے،

آج بھی ہو جو براہیم کا ایمان پیدا ⁂ آگ کر سکتی ہے انداز گلستان پیدا

دار العلوم کا وقار اسکی ثقافت و عدالت یونہی قائم نہیں ہوگئی تھی اس کے پیچھے صلحاء روزگار کی ایک قطار تھی، زاہدین و متوکلین کی عظیم کمک تھی، طور کی تجلیاں تھیں۔ وادیٔ ایمن کے شرارے تھے، بیچین تلوب تھے، تابناک تاریخ تھی، روشن روایات تھیں، تزکیہ نبوت علم بالاحکام اور علم بالاوصاف کے اقتراب و ارتفاق اور اشتراک کے آثار و انوار تھے، سید احمد شہید اسماعیل شہید ایران

دستان یحییٰ علی ولایت علی اور پھر امداد اللہ ان کے مرکز کے امین رشید و قاسم محمود و خلیل و انور اشرف العلما ربطل جلیل حسین احمد، پھر اس فیضان کو کوچہ بکوچہ سہل و جبل قائع و اکم میں پھیلانے والے اور دیوان عشق کے ہم سبق، کوئی بصحرا و خفت کوئی دور کوچہار سو شدیم جیسے الیاس اور یوسف تھے جیت کے ساتھ دعوت و ابلاغ اور لیظہرہ علی الدین کلہ، تمام شعبہائے دین کی تاسیس تجدید اور تفہیم و تذکیر کا جنون رکھنے والے سودا بر سر پا بھی تھے۔

میں ایک زمانہ میں کہا کرتا تھا کہ دارالعلوم اس وقت عبارت ہے دو اشخاص سے ایک حضرت مدنی، دوسرے مولانا طیب، حضرت مدنی قلب ہیں، مولانا طیب زبان۔

لسان الفتیٰ نصف و نصف فوادہ ؎ فلم یبق الا صورۃ اللحم والدم

جس دن قلب نیل ہوا یہ دل دھڑکا، فری زبان ہی تو سب کچھ نہیں نہ وہ تو صرف ترجمان ہے

ان الکلام لفی الفؤاد وانما ؎ جعل اللسان علی الفؤاد دلیلا

بلکہ بعض جگہ عذرہ اور وقتی الموارد بھی، اب دارالعلوم آدھا رہ گیا، پھر آدھے میں بھی فساد انتشار جس نے جمعیت کو برہم کر کے رکھدیا، منتشر اور غیر منقسم اکائیوں میں بانٹ دیا، جمعیت نہ رہی تو جماعت اجماعیت بھی ایک فریب بنکر رہ گئی، چلو ہم آدھے پر بھی راضی تھے اب وہ بھی نہ رہا، ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے، بہر حال یہ اعتراف غیروں کو بھی ہے کہ اب کوئی طیب نہیں رہا۔

۸۔ اس کا فیصلہ باخبر اشخاص و رجال ہی کا کام ہے میں ایک گوشہ نشین اس سوال کا محل نہیں۔

۹۔ حکمت قاسمی در حقیقت حکمت ولی اللہ ہے، اسکی تفہیم و تشریح حضرت طیب نے بلا شبہ کی مگر یہ ترجمانی کردار طلب ہے، ٹیگور سے کسی نے سوال کیا کہ برہمو سماج کے اصول حکیمانہ تھے مگر وہ مذہب کچھ پھیلا نہیں، جواب دیا کہ کسی مذہب میں پھیل بڑھنے کی بات اسکے مطلقاً حکیمانہ اصولوں کی بنا پر نہیں ہوتی جب تک کہ ان اصولوں کا نمونہ اور اسوہ سامنے نہ آئے، آپ کے مذہب اسلام کے راز بھی اسی میں مضمر تھا کہ پیغمبر خود اپنے اصولوں کا نمونہ بنکر دکھلا گئے، پھر اتنا ہی نہیں بلکہ ان نمونوں اور اصولوں کا ایک عظیم الشان گروپ بھی اپنے بعد چھوڑ گئے۔

عرض کرتا ہوں ـــــ جی ہاں اس خلا کے پر ہونے کی صورت یہی ہے کہ "من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را" والے پھر پیدا ہوں، بجے تو مدرسہ و خانقاہ، راتھے تو سپاہ کا حلقہ پھر ابھرے، آوازۂ منصور کہن شد کا احساس

پھر پیدا ہو، لاکھ حکیم سر بجیب ہوں مگر ایک کلیم سر بکف بھی سامنے آئے، علمی تبحر انکی تفوق، اتاثیر و تنقید کی قوت والے پھر آئیں۔ ابن حنبل غزالی و جیلانی اور جوزی کے مقتفی آثار جن کے قدم گوہر بار جنکی شمشیر آبدار اور جنکے نفوس عنبر بار ہوں، جو برکف جام شریعت برکف سنداں عشق کی جمعیت رکھتے ہوں، زاہد فی الدنیا راغب فی الآخرۃ ہوں، اللّٰہ غایتنا، والرسول زعیمنا، والقرآن دستورنا، والجہاد سبیلنا والموت فی سبیل اللّٰہ اقصٰی امانینا ادن کا غایت مقصود ہو جو تڑپ کر یہ کہہ سکیں فالخیل واللیل والبیداء تعرفنی والحرب والضرب والقرطاس والقلم متنبی نے تو شیخی سے یہ کہا تھا۔ وہ شوخی و سورش اور سستی کہیں، نری شاعری نہیں، نرا عشق، یداللّٰہی، جو متاع دنیا اور عیش و جاہ کو اپنا قبلہ مقصود بنانے کے بجائے اسکو انسانیت کی پستی تصور کرتے ہوں،

عرب ترا غازی نہ ہو، عجم ترا سپاہی نہ ہو، شیشہ گری کے بجائے خارہ شگافی جنکا عزم راسخ ہو — تو ممکن ہے کہ ان کے نفوس قدسیہ زکیہ قویہ کی برکات و آثار سے پھر کوئی مشعل روشن ہو، شمع کا نوری نہ سہی چراغ خانہ ہی میسر ہو۔

والسلام

ایم ایم قریشی کرناٹک

قاری صاحب کا دورِ آخر اور دارالعلوم سے علیحدگی

میں نے چاہا تھا کہ اس تذکرہ طیب میں دارالعلوم کے اس قضیہ نامرضیہ کا ذکر بالکل نہ ہو جسکا انجام دارالعلوم دیوبند سے حضرت قاری صاحب کی علیحدگی پر ہوا، اور جس سے ملک اور بیرون ملک دارالعلوم کی بدنامی ہوئی اور دیوبندیت مجروح ہوئی اور وہ باتیں سامنے آئیں جن سے ہماری گردن شرم سے جھک گئی ہے، میں نے اپنے مضمون نگاروں سے بھی گذارش کی تھی کہ میں کوئی ایسی تحریر شائع نہ کروں گا جس میں دارالعلوم کے اس قضیہ کو چھیڑا گیا ہو۔

لیکن مجھے جو اس تذکرہ طیب کیلئے مضامین وصول ہوئے ہیں ان میں کسی نہ کسی انداز میں بہت سے مضمون نگار حضرات نے اس قصہ کو بھی چھیڑا ہے اور ان کا اصرار ہے کہ ہماری تحریرات جوں کی توں شائع کی جائیں،

چونکہ بہت سے مضامین میں اس حادثہ کا ذکر آہی چکا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تذکرہ طیب کے عنوان سے جب کوئی چیز سامنے آئے گی تو قاری صاحب کی زندگی کے اس اہم واقعہ کا ذکر بہر حال ہوگا اس سے صرف نظر کرنا بہت دشوار ہے۔ اس وجہ سے مندرجہ ذیل تحریر بھی شائع کی جارہی ہے۔

مرتب تذکرہ کا اس تحریر سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے، بہتر ہوتا کہ مضمون نگار اپنے نام کی وضاحت کر دیتے۔ (مرتب)

حضرت قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کا دارالعلوم سے جو گہرا خاندانی ربط رہا ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں، قاسمیت جس چیز کا نام ہے وہ ان کے دادا حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ کے افکار و رجحانات اور ان کا فکر و فلسفہ ہے، جن کا سرا حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے جا ملتا ہے۔ دارالعلوم کی فکری بنیاد حضرت نانوتوی کی حکمت و فلسفہ پر قائم ہے، البتہ مجھے اس سے اختلاف ہے کہ حضرت نانوتوی کو دارالعلوم دیوبند کا بانی قرار دیا جائے۔ بلاشبہ حضرت نانوتوی کا دارالعلوم کی ترقی و تقدیم میں بڑا حصہ

ہے، اور انھوں نے اس مدرسہ کو دارالعلوم اور ایک یونیورسٹی بنانے میں اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ مگر اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دارالعلوم حضرت حاجی عابد حسین صاحب دیوبندی علیہ الرحمہ کے ہاتھ قائم ہوئی ہے۔ اگر اس کا اعتراف کر لیا جائے تو اس سے حضرت نانوتوی کے فضل و کمال میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی ہے۔

حضرت قاری صاحب کے والد مولانا حافظ احمد صاحب نے دارالعلوم کی چالیس سال خدمت کی خود قاری صاحب نے پچاس سال سے زیادہ عرصہ تک اس شجرہ طوبی کی دیکھ بھال کی اور اپنا خون پسینہ اس کی آبیاری میں صرف کیا، جس کا تعلق دارالعلوم دیوبند سے اتنا قدیم ہو اور اتنا گہرا ہو اسکا دم واپسیں دارالعلوم سے کٹ جانا زبردست حادثہ ہے، قاری صاحب پر اسکا جو اثر ہوا ہوگا اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے، وابستگان دارالعلوم خود بھی اس حادثہ سے متاثر ہیں میں چاہتا ہوں کہ زیر نظر مضمون میں اس سلسلہ میں اپنے خیالات کا اظہار کروں اگرچہ مجھے اس کا احساس ہے کہ میری یہ تحریر بہتوں کے لئے باعث گرانی ہوگی مگر اپنی فکر و رائے پر پابندی لگانا یا کسی کے لحاظ میں اظہار حق اور واقعات سے پہلو تہی کرنا جرم سمجھتا ہوں۔ دارالعلوم سے متعلق ہر شخص میرا محبوب ہے اور میرے بھی محترم ہیں مگر پاسداری اور جنبہ داری کی لعنت سے میں پاک ہوں۔

قاری صاحب علیہ الرحمہ کا دارالعلوم سے انقطاع تعلق کا حادثہ کیوں پیش آیا؟ میں سمجھتا ہوں کہ قاری صاحب کی زندگی کی سب سے بڑی چوک یہ رہی ہے کہ انھوں نے دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ جس میں ہندوستانی کے اکابر دین و ملت کی نمائندگی ہے اور جس کے تحت اب تک دارالعلوم کا نظام چلا آیا ہے اس سے ٹکرا گئے، یا لوگوں نے کوشش کر کے ان کو اس مجلس سے ٹکرانے پر مجبور کر دیا، یہ ایسی فاش غلطی تھی کہ اسکی آج تک کوئی تاویل سمجھ میں نہ آسکی، قاری صاحب کی اس غلطی کا احساس ان کے قدیم رفقاء کو بھی تھا جو قاری صاحب کے مخلص اور ان کے ہمدرد تھے، اور جنکے بارے میں یہ تصور دشوار ہے کہ ان کے دل میں حضرت قاری صاحب کیلئے کوئی جذبہ انتقام موجود ہو، ان رفقاء نے جو مجلس کے ممبر بھی تھے حضرت قاری صاحب کو اس خطرناک اقدام پر متنبہ بھی کیا۔ اس سے باز رہنے کی عاجزانہ گذارش بھی کی لیکن حضرت قاری صاحب پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا، اور ان کے رفقاء اور مخلصین کی ساری گذارشات بیکار ثابت ہوئیں اور جو غلط قدم اٹھ چکا تھا اس کا پیچھے کرنا اور اپنی غلطی کا احساس و ادراک کرنا یہ قاری صاحب سے نہ ہو سکا۔

دیوبند کے جشن صد سالہ کی کامیابی سے اگر یہ دھوکہ ہوا کہ یہ پروانے قاری صاحب کی ذات پر ٹوٹتے ہیں اور ہندوستان کے مختلف اطراف سے بے شمار لوگوں کا دیوبند پہونچنا یہ حضرت قاری صاحب کی مقبولیت کا اثر ہے اور دارالعلوم کی ہیئت حاکمہ سے ٹکرا کر کے بھی حضرت قاری صاحب اپنی مقبولیت اور محبوبیت باقی رکھ سکیں گے۔ اور ملک اور بیرون ملک کے وابستگان دارالعلوم حضرت قاری صاحب کا ساتھ دیں گے تو یہ شدید قسم کی غلط فہمی تھی۔

جشن صد سالہ کی کامیابی کا تعلق صرف دارالعلوم کی مرکزیت اور اسکی محبوبیت سے ہے، قاری صاحب کی جگہ کوئی دوسرا بھی ہوتا اور جشن کا اسی پیمانہ پر انتظام ہوتا جب بھی یہ جشن اتنا ہی کامیاب ہوتا، لوگ قاری صاحب کے نہیں دارالعلوم کے عاشق تھے، یہ انکی پروانگی و دیوانگی دارالعلوم کے لئے تھی مگر اس کا احساس کئے بغیر قاری صاحب نے یہ یقین کر لیا یا ان کو کچھ کوتاہ اندیش قسم کے لوگوں نے یقین دلا دیا کہ ملک قاری صاحب کے ساتھ وہ لوگ جنکا تعلق قاری صاحب سے عقیدت وارادت واخلاص کا ہرگز نہیں تھا ان پر قاری صاحب نے بے انتہا بھروسہ کیا اور ان کی ہر بات کو دہراتے رہتے، حالانکہ یہ گروہ جو قاری صاحب سے چپٹا ہوا تھا وہ کوتاہ اندیش بھی تھا اور غیر مخلص بھی، خود قاری صاحب کے خاندان کے لوگ بھی اسی گناہ کے مجرم تھے، یہ گروہ قاری صاحب کی عزت وآبرو سے کھیل کر رہا تھا، اور قاری صاحب کی گراں قدر شخصیت کو مہرے پر رکھ کر خود اپنے مصالح کی دستیابی کی فکر میں لگا ہوا تھا، انہیں غیر مخلص لوگوں نے قاری صاحب کو ان تعلق رکھنے والوں سے بھی کٹوا دیا جو سنجیدہ اور متین تھے اور جنکو واقعۃً حضرت قاری طیب صاحب سے خیر خواہی وبہی خواہی تھی جو دل سے چاہ رہے تھے کہ قاری صاحب کو اس جنجال سے نکالیں لیکن قاری صاحب کا یہ گروہ ہمیشہ مانع بنا رہا، اور کوشش کرنے والے تھک ہار کر بیٹھ گئے اور ان کا ہر مشورہ اور ہر گذارش فضائے آسمانی میں بکھر کر رہ گئی، اور جو قریب تھے وہ دور ہوتے گئے اور حضرت قاری صاحب ہندوستان کی اس لق ودق آبادی میں تنہا نظر آنے لگے، اور جو قاری صاحب کے ساتھ تھے بھی انکا ہندوستان میں کوئی وزن نہیں تھا، یا پھر وہ خانہ نشین اور خانقاہ نشین قسم کے لوگ تھے جن سے قاری صاحب کو کوئی تقویت نہیں مل رہی تھی۔

حضرت قاری صاحب علیہ الرحمہ کی زندگی کی ایک شدید چوک یہ بھی تھی کہ انھوں نے حضرت اقدس مدنی علیہ الرحمہ کے انتقال کے بعد ان کے گھرانے کے افراد کو دارالعلوم سے دور رکھا، یا ان کو اس پر مجبور کیا

گیا، حالانکہ حضرت مدنی کی خدمات کا یہ تقاضا تھا کہ حضرت قاری صاحب اس خاندان کو اپنے سے قریب رکھتے، دارالعلوم دیوبند کی تاریخ میں حضرت مدنی کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا خود حضرت قاری صاحب پر حضرت مدنی کی جو بزرگانہ عنایتیں رہی ہیں اور خاندان قاسمی کے ساتھ ان کا جو قدیم گہرا ربط و تعلق رہا ہے، اس کا بھی تقاضا تھا کہ حضرت قاری صاحب حضرت مدنی کے انتقال کے بعد بھی اس گھرانے سے اپنے تعلقات استوار کئے رہتے ، اگر ایسا ہوا ہوتا تو آج مولانا اسعد ان کے مخالف نظر آتے اور دارالعلوم کی تاریخ بڑی تابناک ہوتی اور جن آزمائشوں میں اس وقت دارالعلوم ہے شاید یہ حادثہ پیش نہ آتا۔

حضرت مدنی کے ہزاروں شاگرد اور لاکھوں عقیدتمند و ارادتمند اس کا شدید احساس رکھتے تھے کہ قاری صاحب کا اس خاندان کے ساتھ یہ رویہ اور دارالعلوم سے اس خاندان کے افراد کا دور رکھنا غیر مناسب ہے۔ اور ان کے دلوں میں اس کی وجہ سے حضرت قاری صاحب کے خلاف عرصہ سے دبی دبی ناراضگی تھی اور مولانا اسعد صاحب کے میدان میں آجانے کے بعد یہ ناراضگی شعلہ جوالہ بن کر ابھر کر سامنے آگئی۔

جشن صد سالہ کے موقع پر مولانا اسعد صاحب نے جو موتمر قائم کی تھی یہ کوئی ایسی چیز نہ تھی جو قاری صاحب کیلئے مولانا اسعد صاحب کے خلاف عملی اقدام پر مجبور کرتی، قاری صاحب اور ان کے لوگوں نے اس موتمر کی مخالفت کر کے جس کا بظاہر کوئی سبب نہیں تھا خود اس موتمر کو اہم چیز بنادیا اور مولانا اسعد صاحب کی طاقت کا اندازہ کئے بغیر ان سے ٹکرا گئے، مولانا اسعد صاحب سے جو لوگ واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ وہ اپنے حریف کو پچھاڑنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں ان کے پاس افراد اور جماعت کی طاقت بھی ہے، اور وہ ان فنون لطیفہ سے بھی واقف ہیں جن سے اپنے حریف کو بڑی آسانی سے زیر کیا جا سکتا ہے حضرت قاری صاحب، ان کی جماعت اس بارے میں مولانا اسعد کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

درحقیقت حضرت قاری صاحب کی یہ مسلسل غلطی رہی کہ انھوں نے مولانا اسعد کو نظر انداز کیا دارالعلوم میں پڑھانے سے وہ ہٹائے گئے اور بہت سے ممبران مجلس شوریٰ کی خواہش کے باوجود قاری صاحب ان کو شوریٰ میں لینے پر راضی نہیں ہوئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا اسعد کے دل میں خاندانی قاسمی اور حضرت مولانا قاری صاحب کے خلاف ایک زبردست گرہ پڑ گئی، اور اتفاق سے ان کو یہ موقع مل گیا اور مجلس شوریٰ

نے بھی ان سے تعاون لیا۔ ادھر قاری صاحب اور ان کے آس پاس کے بدعقل اور بدخواہ لوگوں کی مسلسل ضد دلیح رحمی نے پورے ہندوستان کو ان کا مخالف بنادیا۔ مجلس شوریٰ توڑ کر اور ایڈہاک کمیٹی بنا کر پورے ملک میں اپنے خلاف نفرت کی آگ لگادی گئی ہر شخص حیران و پریشان تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے مولانا اسعد صاحب کو اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا تھا چنانچہ وہ میدان میں بڑی احتیاط سے کود پڑے اور سب پر چھا گئے۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ قاری صاحب بازی ہار گئے اور ان کا دورِ آخر ہم سب کے لئے عبرت بن گیا دارالعلوم کی اجتماعیت کا شیرازہ بکھر گیا، اور جماعت رسوا ہوئی اور مسلک بدنام ہوا۔

نیز حضرت قاری صاحب کو غالباً اندازہ نہ ہوسکا کہ قاسمی برادری جس کا نام ہے وہ اس وقت انہیں افراد سے عبارت ہے جن کا تعلق حضرت مدنی علیہ الرحمہ سے رہا ہے۔ خواہ یہ تعلق شاگردی کا ہو یا عقیدت و ارادت کا، حضرت مدنی ہی سے وابستہ لوگ دیوبندیت یا قاسمیت کا جھنڈا بلند کئے ہوئے ہیں اسلئے مولانا اسعد صاحب کے خلاف ان کا جو بھی قدم ہوگا انکو قاسمی برادری سے دور کرتا چلا جائے گا اور انکی حیثیت کمزور ہوتی چلی جائے گی، دارالعلوم دیوبند جس تحریک کا نام ہے وہ حضرت مدنی کا حلقہ اور انہیں سے وابستہ لوگوں کی جماعت ہے۔ اور یہی جماعت ہمیشہ سے دارالعلوم پر غالب رہی ہے۔ اس سے کٹ کر حضرت قاری صاحب دارالعلوم کی گاڑی کو آگے نہیں بڑھا سکتے تھے۔

قاری صاحب حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے خلیفہ تھے، بلاشبہ حضرت تھانوی دارالعلوم کے اکابر میں سے تھے، لیکن یہ تاریخ کا افسوسناک حادثہ ہے کہ حضرت تھانوی سے متعلق حضرات کو دارالعلوم دیوبند سے عقیدت و محبت اور قلبی درجاتی تعلق کبھی نہیں رہا ہے یہ بات سے بہت تلخ لیکن یہ صحیح بھی صوفی صد ہے اس لئے حضرت قاری صاحب کو اس حلقہ سے بھی کوئی مدد نہیں مل سکی اور نہ کسی نے دارالعلوم کے اس حادثہ کے سلسلہ میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا، اس کے برخلاف مولانا اسعد صاحب اور مجلس شوریٰ کے ساتھ ایک پوری جماعت تھی اور یہ جماعت وہی تھی جس کا تعلق حضرت مدنی سے ہے۔

اس پورے فتنہ کے زمانہ میں ایک بڑی مصیبت حضرت قاری صاحب کے ساتھ یہ رہی کہ جماعت اسلامی کے لوگ حضرت قاری صاحب کی حمایت میں اگو دپڑے یا قاری صاحب کے لوگوں نے اس جماعت سے تعاون حاصل کیا، اس جماعت کا قاری صاحب کی حمایت میں آنا یا اس جماعت سے قاری صاحب

اور ان کے متعلقین کا تعاون حاصل کرنا، یہ دلیل تھی کہ جماعت دیوبند قاری صاحب کے ساتھ نہیں ہے اور وابستگان دارالعلوم کی قاری صاحب کو حمایت حاصل نہیں ہے۔

جماعت اسلامی کا قاری صاحب کی حمایت میں اتر آنا حب علی کی بنا پر نہیں تھا بلکہ اس کا محرک بغض معاویہ تھا، جماعت اسلامی کے لوگ مولانا اسعد صاحب اور خود دارالعلوم دیوبند سے بدلہ لینا چاہتے تھے، جس دارالعلوم سے ہمیشہ جماعت اسلامی کی مخالفت کی گئی، اس دارالعلوم کی بقاء وحفاظت کے نام پر اسکی حمایت میں جماعت اسلامی والوں کا کھڑا ہونا ایک فریب کے سوا اور کچھ نہیں تھا، دارالعلوم کی رسوائی وبدنامی سے ان کو حظ نفس حاصل ہوتا تھا، قاری صاحب کے ساتھ ان کی شرکت ان کے اخبارات کا قاری صاحب کی حمایت میں وقف رہنا یہ کسی اخلاص کا نتیجہ نہیں تھا اس تنازع کو کسی قیمت پر بھی صلح ومصالحت کے راستہ سے حل کرنا کرانا اس جماعت کے پیش نظر کبھی بھی نہیں رہا، فتنہ کو ہوا دینا ہی اس جماعت کا مشغلہ رہا ہے۔

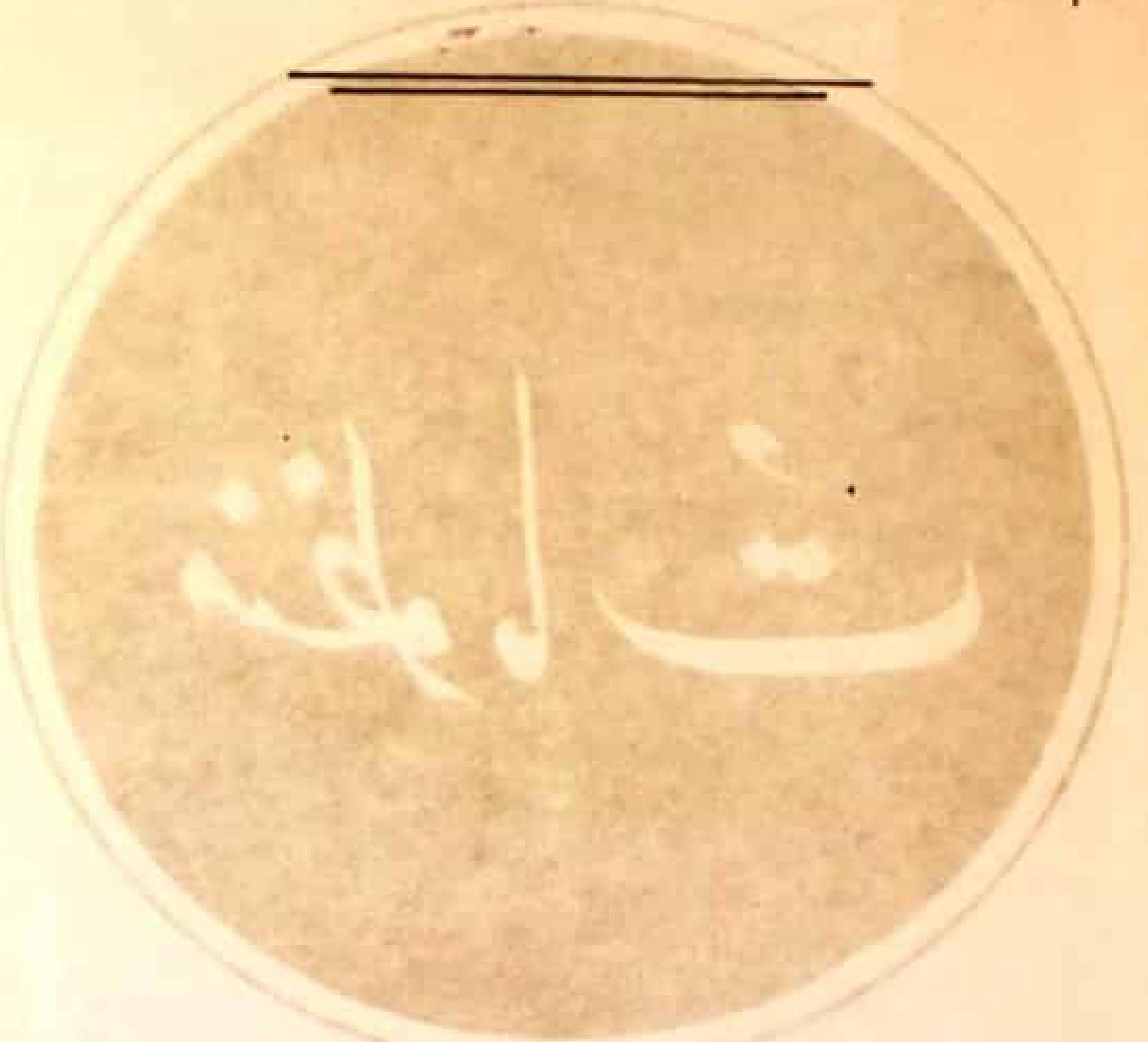
جماعت اسلامی کی یہ حمایت حضرت قاری طیب صاحب کے لئے نہایت مضر ثابت ہوئی اور قاری صاحب کو اپنی جماعت کے لوگوں سے کافی دور کر دیا اور اتنا دور کر دیا کہ آخر کار دارالعلوم سے ان کا رشتہ اس عمر میں بظاہر کٹ گیا جبکہ دارالعلوم کو ان کی شدید ضرورت تھی اور وہ دارالعلوم کی آبرو بنے ہوئے تھے، مجھے اس کا یقین ہے کہ اگر جماعت اسلامی کے افراد قاری صاحب کے ساتھ نہ ہوتے تو شاید یہ فتنہ اتنی شدت اختیار نہ کرتا اور آپس کا یہ نزاع کسی نہ کسی مرحلے ضرور حل ہو جاتا،

میرے نزدیک یہ وہ چند بنیادی باتیں ہیں جنکی وجہ سے حضرت قاری صاحب کو اپنی زندگی کے آخری مرحلے میں اس حادثہ فاجعہ سے دوچار ہونا پڑا،

لیکن ساتھ اس کا بھی شدید احساس ہے کہ جو لوگ انکی مخالفت میں قائدانہ رول ادا کر رہے تھے خاص طور پر عالمی موتمر کے افراد یا دارالعلوم دیوبند کے وہ فضلاء جنکے خون میں حرارت زیادہ تھی انھوں نے بھی حضرت قاری صاحب کی مخالفت میں اسکی قطعاً پرواہ نہ کی کہ انکی یہ مخالفت جائز حدود سے بہت آگے جارہی ہے، انھوں نے حضرت قاری صاحب کے ساتھ ساتھ ان کے والد حتیٰ کہ ان کے دادا حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ تک کو اپنے نشانہ کی زد پر رکھا بیہودہ باتیں کہیں اور لکھیں اور ان کو پھیلایا اور نشر کیا جس سے دارالعلوم کی پوری تاریخ رسوا اور بدنام ہوئی اور اکابر دارالعلوم کے مجاہدانہ کارنامے دھندلے پڑ گئے، جوش

میں اگر پوشش کھو بیٹھنا یہ ہنر نہیں عیب ہے اگر مورخ کبھی اس داستان کو قلم بند کرے گا تو اسکے سامنے تصویر کا صرف ایک ہی پہلو نہیں بلکہ تصویر کے دونوں رخ ہوں گے اور اس وقت معلوم ہوگا کہ قاری صاحب کی مخالفت میں ہم کتنے آگے نکل گئے تھے۔

اللہ ہم سب کی خطاؤں اور لغزشوں کو معاف کرے،



منظومات

دارالعلوم دیوبند

دلِ افرنگ کا کانٹا

سید امین گیلانی شیخوپورہ

عین حق ہے جو تجھے علم کا دریا کہدوں — یہ بھی سچ ہے کہ تجھے گلشنِ تقویٰ کہدوں
ایشیا ہے جو انگوٹھی تو پھر اس میں تجھ کو — کیوں نہ میں ایک چمکتا ہوا ہیرا کہدوں
جتنے دل والے ہیں وہ تجھ پہ ہیں شیدا دل سے — کیوں نہ دل والوں کی میں تجھکو تمنا کہدوں
تو نے پیدا کئے محمودؒ و رشیدؒ و انورؒ !! — زیب دیتا ہے انھیں جس قدر اچھا کہدوں
ہاں بجا ہوگا! کہ میں تیرے حسین احمدؒ کو — پیکرِ عشق کہوں، علم سراپا کہدوں
ہاں تیرے اشرفؒ و عثمانیؒ و طیبؒ کو میں — جھوٹ کیا ہوگا اگر فخرِ زمانہ کہدوں
ایک دو چار جو ہوتے تو گِنا دیتا میں — حق ہے یہ تجھکو نوادر کا خزانہ کہدوں

بار بار آتا ہے گیلانیؔ کے دل میں کہ تجھے
دلِ افرنگ میں اٹکا ہوا کانٹا کہدوں

دینِ حق کا پاسبان و ترجمان دار العلوم

دارُالعُلوم

از مرتب

شمعِ راہِ ہدایت ضوفشاں دار العلوم
ہے زمینِ ہند پر اک آسماں دار العلوم

شرق تا غرب جس کا نام ہے تابندہ تر
ہے علوم دین کا وہ پاسباں دار العلوم

حامیٔ دین و شریعت، مرکزِ رشد و ہدیٰ
دینِ حق کا پاسبان و ترجماں دار العلوم

جو مشائخ ناخدا تھے کشتیٔ اسلام کے
ہے انہیں کا ایک نقشِ جاوداں دار العلوم

ہند میں اسلام کا روشن اسی سے نام ہے
کفر کی تاریکیوں میں ایک نشاں دار العلوم

فخرِ دینِ مصطفےٰ ہے اور دیارِ ہند میں !
نازشِ اسلامیاں ہے بیگماں دار العلوم

ذرہ ذرہ اس جہاں کا آفتاب و ماہتاب
جلوہ گاہ نورِ عالم کہکشاں دار العلوم !

عظمتِ اسلام کا جس نے کیا پرچم بلند
شوکتِ اسلام کا ہے وہ نشاں دار العلوم

یادگارِ قاسم و یعقوب محمود و رشید ! ! !
عابد و انور کا نقشِ جاوداں دار العلوم

ہے حسین احمد و فخر الدین کے اخلاص کا
ایک دلکش اور معطر گلستاں دار العلوم

شیخ احمد اور حبیب و طیب و اعزاز کی !
کاوشِ جہد و عمل کا اک نشاں دار العلوم

شرک و بدعت کے کئے تو نے قلعے مسمار سب
ہر زبانِ حق پہ تیری داستاں دار العلوم

جب تلک چلتی رہے گی شرک و بدعت کی ہوا
تیرا ابھی ہوتا رہے گا امتحاں دار العلوم

تا قیامت فیض تیرا قائم و دائم رہے !
ہے دعا ہر دم یہی وردِ زباں دار العلوم

دارالعلوم دیوبند ایک نظر میں!

(مولانا) محمد عثمان عاصی معروفی

علم و فن کا ایک بحرِ بیکراں دارالعلوم
جہل کے ظلمات میں ہے ضوفشاں دارالعلوم

تو ہے بارہ سو تراسی (۱۲۸۳ھ) کے محرم میں کھلا
عیسوی اٹھارہ سو سرسٹھ (۱۸۶۶ء) عیاں دارالعلوم

اک صدی میں فارغ التحصیل کل سولہ ہزار (۱۶۳۰۲)
تین سو ہیں اور بستر بیگماں دارالعلوم

صاحبِ تصنیف اور تالیف جو پیدا ہوئے
وہ ہیں سب گیارہ سو چونسٹھ (۱۱۶۴) دُرفشاں دارالعلوم

پندرہ سو (۱۵۴۰) ہیں مناظر اور مدرس چھ ہزار (۵۸۸۹)
ہیں بیالیس سو (۴۲۸۸) مبلغ خوش بیاں دارالعلوم

چھ سو چوراسی (۶۸۴) صحافی دو سو اٹھاسی (۲۸۸) طبیب
سترہ سو (۱۷۸۴) سے زیادہ مفتیاں دارالعلوم

پانچ سو چھتیس مشائخ صاحبِ رشد و ہدیٰ
جا بجا ہیں کاتبانِ خوش خطاں دارالعلوم

تیرے فضلانے مدارس جتنے کھولے ملک میں
نو ہزار (۸۹۳۴) ان کی بھی پہونچی گنتیاں دارالعلوم

یہ ہیں تیرہ سو چھیاسی (۱۳۸۶ھ) تک کے اعداد و شمار
کارنامے تیرے بیروں از بیاں دارالعلوم

تیرے اب تک جلسۂ دستاربندی چھ (۶) ہوئے
جو تری عظمت کے تھے روشن نشاں دارالعلوم

پہلا بارہ سو نواسی (۱۲۸۹ھ)، بانوے (۱۲۹۲ھ) میں دوسرا
تیسرا اٹھانوے (۱۲۹۸ھ) میں گلفشاں دارالعلوم

تیرہ سو ایک (۱۳۰۱ھ) میں چہارم، پنجم اٹھائیس (۱۳۲۸ھ) میں
پھر سوا چودہ سو ہجری میں چھٹاں دارالعلوم

جو مطابق مارچ سنہ انیس سو اسی (۱۹۸۰ء) میں تھا!
بیس لاکھ انساں کا تھا سیلِ رواں دارالعلوم

یہ تری خدمات کے ہیں کچھ نقوشِ جاوداں
جن کا ہے عثمانؔ عاصی ترجماں دارالعلوم

نوٹ: کہیں کہیں صحیح اعداد موزوں نہ ہو سکے اس لئے سامنے ہی قوسین میں صحیح اعداد کا اندراج ہے۔

مولانا محمد عثمان عاصی معروفی

عظمتِ دارالعلوم

مرکزِ رشد و ھدیٰ دارالعلوم دیوبند — سایۂ بالِ ہُما، دارالعلوم دیوبند
جہل کے ظلمات میں بدرالدجیٰ شمس الضحیٰ — راہِ حق کا رہنما دارالعلوم دیوبند
وسعتِ قلزم لئے ہر قطرہ ہے آغوش میں — تیرا ابرِ باسخا دارالعلوم دیوبند
ہے ثریا سے تجاوز رفعتِ عظمت تری — کون ہے ہمسر ترا دارالعلوم دیوبند
ہیں ترے فرزند لاکھوں چار سو پھیلے ہوئے — شمعِ روشن جابجا دارالعلوم دیوبند
ہے دعائے سحرگاہی حاجیِ امداد[1] کی! — فیضِ قاسم[2] بادفا دارالعلوم دیوبند
ہاں رشید[3] احمد مجاہد بیگماں روحِ رواں — قلبِ شیخ الہند[4] کا دارالعلوم دیوبند
عبقریت تجھ میں انور شاہ[5] کشمیری کی ہے — عزمِ مدنی[6] باصفا دارالعلوم دیوبند
شانِ ابراہیم[7] انوکھی سطوتِ اعزاز[8] بھی — فخرِ دینِ[9] مصطفےٰ دارالعلوم دیوبند
اصل ثابت تیری مثلِ شجرِ طیب[10] بے خطر — فیض تیرا جابجا دارالعلوم دیوبند
رابطہ جمعیۃِ علماء سے ترا مستقل!!! — حفظِ رحمان[11] سا فدا دارالعلوم دیوبند
حاملِ شانِ ولی اللہ[12] تیرا بانکپن!! — حریت کا رہنما دارالعلوم دیوبند

دل سے یہ عثمانِ عاصی کی دعا ہے اے خدا
فتنہ و شر سے بچا دارالعلوم دیوبند

ع۱ سید الطائفہ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مدنی متوفی ۱۳۱۷ھ ع۲ بانی دارالعلوم مولانا قاسم نانوتوی متوفی ۱۲۹۷ھ ع۳ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی متوفی ۱۳۲۳ھ ع۴ مولانا محمود الحسن صاحب متوفی ۱۳۳۹ھ ع۵ علامہ انور شاہ کشمیری متوفی ۱۳۵۲ھ ع۶ شیخ الاسلام مولانا حسین صاحب مدنی متوفی ۱۳۷۷ھ ع۷ علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی متوفی ۱۳۸۷ھ ع۸ شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب متوفی ۱۳۷۴ھ ع۹ مولانا فخر الدین صاحب مرادآبادی متوفی ۱۳۹۲ھ ع۱۰ مولانا قاری محمد طیب صاحب متوفی ۱۴۰۳ھ ع۱۱ مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی متوفی ۱۳۸۲ھ ع۱۲ سید الطائفہ حضرت مولانا ولی اللہ شاہ دہلوی متوفی ۱۱۷۶ھ

مرقعِ عقیدت

از حضرت مولانا قاری محمد عبدالعزیز شرقی اسعدی انبالوی رحمۃ اللہ بخدمت عالیجناب حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

اے حکیم عالمِ اسلام! اے شیخِ جلیل! — ذوقِ علم و فن کی رونق ہے ترا ذکرِ جمیل
اے خطیبِ ملک! اے ملت کے سحبانِ کبیر — حسنِ رازیؒ و غزالیؒ زینتِ ابنِ کثیرؒ
اے مجاہد اے زعیمِ قوم، دانائے عظیم! — زیب دیتا ہے اگر تجھ کو کہیں فخرِ کلیم
اے علومِ قاسمی کے شارحِ شیریں ادا — ندرتِ انشا تری کلکِ ازل کی ہم نوا
اے سریر آرائے بزمِ رشد اے قطبِ زماں — تیرے فیضِ خاص سے سیراب ہے سارا جہاں
ثانیٔ قاسمؒ ہے، احمدؒ کا جگر پارہ ہے تو — ہاں رشیدؒ و اشرفؒ و محمودؒ کا پیارا ہے تو
تو صلاح و خیر کی اقلیم کا ہے تاجدار — شوکتِ تقویٰ تری ہر ہر ادا سے آشکار
تو نے رکھا پرچمِ اسلاف دنیا میں بلند — تجھ پہ نازاں کیوں نہ ہو دارالعلوم دیوبند
تیرے اخلاقِ کریمانہ کا ہر خاطر اسیر — نورِ باطن سے ترے ہر ذرۂ دل مستنیر
نطق کو تیرے میسر قوتِ روح الامیں — فکر تیرا لامکانی سطوتوں کا ہے مکیں
صورتِ طیب تری آوازہ طوبیٰ نصیب — سیرتِ اکمل میں ہے اسلاف کا رنگِ عجیب
تیری ایمانی فراست رو کشِ اعجاز ہے — تیری آنکھوں میں خداوالوں کا ہر انداز ہے

علم تیرا بے نظیر اعمال تیرے بے مثال
شوقیؔ ناکارہ کو تعریف کی ہے کب مجال

اکابر دیوبند کی یاد میں

اشرف علی تھانوی خطیب جامع مسجد واپڈا کالونی اپر مال لاہور

بھول کر بھی نہ آئیں گے یہ لوگ !
جا کے واپس نہ آئیں گے یہ لوگ

سرمدی ہو گیا ہے ان کا سفر
اب کہاں پائے جائیں گے یہ لوگ

اپنے حق میں وسیع و بے پایاں !!
رحمت حق کو بلائیں گے یہ لوگ

اب تو فردوس خلد میں جا کر
اپنی محفل سجائیں گے یہ لوگ

بے حجابانہ ہوگا نظارہ !
جلوۂ حق کو پائیں گے یہ لوگ

کون ملک عدم سے داعی ہے
کس کی مجلس میں جائیں گے یہ لوگ

بستیاں کر کے چل دیئے ویران
اپنی دنیا بسائیں گے یہ لوگ

ایک ہی راہ کے یہ سالک تھے
ایک منزل پہ جائیں گے یہ لوگ

جا رہے ہیں جو آج کر کے حجاب !
چھپ کے پھر دل میں آئیں گے یہ لوگ

کون پھر اس نظر میں جچتا ہے
جس نظر میں سمائیں گے یہ لوگ

ہم انھیں آج تک نہیں بھولے
کیا ہمیں بھول جائیں گے یہ لوگ

دل کی گہرائیوں میں بستے ہیں !
کیوں نہ پھر یاد آئیں گے یہ لوگ

جتنی مدت گزرتی جائے گی
اور بھی یاد آئیں گے یہ لوگ !

ہم بھلا بھول جائیں کیسے انھیں
جب نہ ہم کو بھلائیں گے یہ لوگ !

محفل لامکاں میں اے عارف
ہم کو کس دن بلائیں گے یہ لوگ

تھا زمیں پر جو مثالِ آسماں جاتا رہا

مرتب

آبروئے دین و ملت کا نشاں جاتا رہا
جس کے دم سے زندگی تھی قوم کی تابندہ تر
کاروانِ علم کا جو قافلہ سالار تھا !
وہ کہ جس کو دیکھ کر ہوتے تھے دل سب کے نہال
نطق جس کا قلبِ مردہ کیلئے آبِ حیات !
جس کی ہر ہر بات تھی اک علم و دانش کی کتاب
یادگارِ قاسم و محمود جس کی ذات تھی !
رہ گزارِ زندگی میں آنے والوں کے لئے
قوم کو جس نے دکھائی تھی رہِ رشد و نجات !
شارحِ قرآن و سنت، واقفِ اسرارِ دین
عارفِ سرِ حقیقت تابشِ نورِ جمال ! !
جس کا ڈنکا بج رہا تھا عالمِ اسلام میں
جس کے سینے میں تڑپ تھی ملتِ اسلام کی
جس سے ہوتے تھے عیاں سب رازہائے زندگی
زندگی کی راہ میں اک نیرِ تاباں جو تھا!
وہ امینِ علم و حکمت نکتہ سنج و نکتہ رس
مظہرِ شانِ جمالِ مصطفےٰ تھی جس کی ذات
دل پریشان، روح مضطرب بات کچھ آتی نہیں
خوب صورت، خوب سیرت پاک باطن جس کی ذات
ہائے میں کیسے کہوں کہاں سے وہ کیسے گیا!
لم یکن فی عصرنا احد یدانی فضلہ ! ! !
خبرہ قد شاع فیما بیننا لاریب فیہ
لم یزل فی سعیہ فی نشر دین المصطفےٰ !
لا تلم یا لائمی قد طاب عندی ذکرہ !

کاروانِ علم کا وہ پاسباں جاتا رہا!
وہ چراغِ روشن و کوکب نشاں جاتا رہا
چھوڑ کر سب کو وہ میرِ کارواں جاتا رہا
وہ سکونِ قلب، وہ آرامِ جاں جاتا رہا
وہ خطیبِ قوم و ملت خوش زباں جاتا رہا
ہائے وہ شیریں سخن وہ خوش بیاں جاتا رہا
تھا سلف کا آخری جو اک نشاں جاتا رہا
چھوڑ کر اپنا وہ نقشِ جاوداں جاتا رہا
قوم و ملت میں جو تھا گوہر نشاں، جاتا رہا
دینِ حق کا ترجمان و پاسباں جاتا رہا
تھا زمانہ میں جو مثلِ کہکشاں جاتا رہا
بت کدے میں دے رہا تھا جو اذاں جاتا رہا
اب وہ فخرِ قوم و ملت از میاں جاتا رہا
زندگی کے راز کا وہ رازداں جاتا رہا
جس کا ہر نقشِ قدم تھا ضو فشاں جاتا رہا!
یادگارِ قاسمی کا وہ نشاں جاتا رہا!
وہ جمالِ مصطفےٰ کا اک نشاں جاتا رہا
چھوڑ کر ہم کو یہاں وہ خود کہاں جاتا رہا!
تھا زمیں پر جو مثالِ آسماں جاتا رہا!
لیکے اپنے دل میں زخمِ خونچکاں جاتا رہا
چھوڑ کر اپنا یہاں نام و نشاں جاتا رہا!
برکتِ اہلِ زماں فخرِ زماں جاتا رہا
امتحانگاہِ عمل سے کامراں جاتا رہا
اس جہاں سے ساکنِ باغِ جناں جاتا رہا

طیب اللہ ثراہ، انعم اللہ علیہ
از میاں قوم میں سے کارواں جاتا رہا

بیادگار حکیم الاسلام حضرت العلامہ مولانا قاری محمد طیب صاحب
قدس سرہٗ مدیر دار العلوم دیوبند

ذکرِ طیّبؒ

از ـــــ حضرت مولانا محمد سلطان ذوق صاحب استاذِ حدیث و ادب جامعہ اسلامیہ چاٹگام بنگلہ دیش

متوفی ۶ رشوال ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء

ملائک آسماں سے بہرِ استقبال آتے ہیں ـــ فلک کی راہ پر دہ جنتی قالیں بچھاتے ہیں
عجب انداز سے وہ بہشت جنت کو سجاتے ہیں ـــ کھڑی ہے کہکشاں اور ماہ انجم مسکراتے ہیں
یہ فخرِ خاندانِ قاسمی دنیا سے جاتے ہیں
ملائک آسماں سے بہرِ استقبال آتے ہیں

کہا قاسم نے آکر اے مرے نورِ نظر آجا ـــ وہ آئی روح والد اور کہا لختِ جگر آجا
کہا محمود و اشرف نے ہمارے لال ادھر آجا ـــ شبِ رنج و محن کا ہوگیا وقتِ سحر آجا
تجھے اب گردشِ ایّام سے ہم لینے آتے ہیں

ہمارے باغ کو تم نے کیا ہے ہر طرح شاداب ـــ بڑی محنت سے تا عمرِ دراز اس کو کیا سیراب
جوارِ رحمتِ حق میں ہے گا اب سے محوِ خواب ـــ دلِ اسلاف تیرے دردِ غم سے ہیں بڑے بیتاب
اُسے کیا فکر جس کا غم جہاں کے لوگ کھاتے ہیں

دلِ مسلم سے تا عرشِ الٰہی آہ جاتی ہے ـــ صدائے نالہ و فریاد ہر مسکن سے آتی ہے
زمینِ ہند و پاکستان و بنگلہ تھرتھراتی ہے ـــ بچشمِ نم سے میرِ کارواں کی روح جاتی ہے
خدا خود اپنے قربِ خاص میں ان کو بلاتے ہیں

مدیرِ جامعہ دار العلوم و جانِ جاں طیّبؒ ـــ وہ فخرِ دیوبند و یوسفِ ہندوستاں طیّبؒ
وہ مردِ باخدا شیریں سخن جادو بیاں طیّبؒ ـــ علومِ قاسمی کے وہ امین و ترجماں طیّبؒ
وہ جس کو دیکھ کر غنچہ و گل مسکراتے تھے

وہ جب سے مہتمم تھے بڑھ گئی تھی زینتِ مسند ستم ہے ایسے رہبر کی طرف اٹھیں جو چشمِ بد
وہ جنکی قدر کرتے تھے براہیم اور حسین احمد خلیل و انور و شبیر جن کو چاہتے بیحد!
الٰہی شکوۂ بیداد ہم تجھ کو سناتے ہیں

زباں پر جس کی اک بہتا ہوا حکمت کا دریا تھا وہ جس کی ذات سے اسلام کا بھی بول بالا تھا
جہاں میں ہر طرف جس کی ضیاؤں کا اُجالا تھا صحابی تو نہیں لیکن صحابہ کا نمونہ تھا!
وہ جس کی نقل و حرکت میں درسِ عشق پاتے ہیں

ولایت کو شرف بے تاجدارِ اولیا تم تھے لباسِ زُہد نازاں ہے کہ زاہد باصفا تم تھے
یہ ملت فخر کرتی ہے کہ اسکے مقتدا تم تھے ہے ناز اپنی جماعت کو مبقرِ رہنما تم تھے
تری اک اک ادا پر ہم یہ اشکِ خوں بہاتے ہیں

کہوں اب الوداع ای زینتِ ہر بزمِ ایمانی ہمیں رہ رہ کے یاد آئی تری اک ایک قربانی
کرے خود ربِّ عالم تیرے گلشن کی نگہبانی ترے مرقد پہ ہو دائم فلک کی شبنم افشانی
خدا رحمت کا دریا ایسے پیاروں پر بہاتے ہیں

الٰہی اس جماعت کا نہ شیرازہ بکھر جائے نہ جانے قافلہ جنگل میں ٹکرا کر کدھر جائے
تری رحمت سے رفتہ رفتہ حال اُسکا سُدھر جائے بڑھا دستِ کرم زلفِ پریشاں اب سنور جائے
غضب ہے آج ہم کیا گوہرِ یکتا گنواتے ہیں

یہ کیسے شیرِ ملت آج زیرِ خاک سوتے ہیں یہ کیسے بلبلِ نغمہ سرا خاموش سوتے ہیں
نہ ہوگا حق ادا خونِ جگر سے بھی جو روتے ہیں سفینہ علم و حکمت کا بھنور میں آج کھوتے ہیں
غلط ہے ذوق اِس دنیا سے جو ہم کو لگاتے ہیں
ملائک آسماں سے بہرِ استقبال آتے ہیں

وفات کا آنکھوں دیکھا حال

ہجوم دیوبند

دیوبند کا ہر مسلمان ہر گلی اور ہر سڑک ماتم کدہ بن گئی تھی غم زدہ واشکبار لوگوں کا ہجوم اس دروازے پر اکٹھا ہو۔ جہاں سے ہر روز علم دین کا آفتاب طلوع ہوتا تھا اور ہر آنے والے کے دل کو اللہ اور اسکے رسول کے پیغام کی روشنی سے منور کر دیا تھا لیکن علم دین کی وہ شمع آج خاموش ہو گئی تھی۔ ۸۶ رسال تک پیغام حق کی صدائیں دینے والی شخصیت اپنے مالک حقیقی سے جا ملی تھی، ۱۷ رجولائی کی صبح حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب حسب معمول فجر کے وقت بیدار ہوئے نماز اور عبادات سے فارغ ہو کر تاریخ اسلام کا مطالعہ فرمایا اس کے بعد مزاج پرسی کو آنے والے حضرات سے گفتگو فرماتے رہے۔ آج قاری صاحب زیادہ چاق و چوبند نظر آرہے تھے، گو کہ پچھلے دو ماہ سے مسلسل علیل رہنے کے بعد بہت کمزور و نحیف ہو چکے تھے لیکن آج کے دن ایک عجیب چمک ان کے چہرے پر نظر آرہی تھی حسب عادات صحابہ کے واقعات اور درس حدیث و قرآن کا سلسلہ جاری تھا۔ ارد گرد بیٹھنے والوں کو کیا معلوم تھا کہ یہ سلسلۂ کلام اتنی جلد بند ہو جائے گا اور علم دین کا یہ چراغ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائے گا۔

دن کے گیارہ بجے تھے کہ حکیم محمود صاحب جو آج کل قاری صاحب کے معالج تھے تشریف لے آئے، حکیم صاحب دس منٹ تک قاری صاحب سے گفتگو کرتے رہے کہ آنِ واحد میں پیغام الٰہی آیا اور ملت اسلامیہ کی اس عظیم شخصیت کو دار فانی کی طرف لے گیا۔ اس وقت ان کے پاس مولانا محمد سالم صاحب عاصم صاحب اور اعجاز حسین صاحب بھی موجود تھے ان لوگوں نے جو حکیم صاحب سے گفتگو کر رہے تھے دیکھا کہ انہوں نے ہاتھ میں تسبیح کے دانوں پر انگلیاں پھیریں۔ ایسا لگا کہ کچھ پڑھ رہے ہیں۔ تبھی چہرے پر نظر ڈالی تو وہ پرسکون ہو چکا تھا اور نور کی بارش سے بھیگا ہوا تھا۔ ابھی لوگ سمجھ ہی نہیں پائے تھے کہ آخر ایکدم حضرت نے خاموشی کیوں اختیار کر لی۔ تبھی حکیم صاحب نے نبض پر ہاتھ رکھا تو معلوم ہوا کہ اللہ کے راستے کا یہ مسافر اپنے آخری سفر پر روانہ ہو چکا ہے۔ ۱۱ بجکر دس منٹ پر قاری صاحب نے داعی اجل کو لبیک کہا اور دس پندرہ منٹ میں خبر آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا شہر ماتم کدہ بن گیا۔ گھروں میں عورتوں نے اپنے چولہے بجھا دیئے، مردوں نے اپنی دکانیں کاروبار بند کر دیئے اور علم دین کے اس عظیم مجاہد کے آخری سفر میں شرکت کیلئے چل پڑے شام ہوتے ہوتے یہ خبر اطراف کے گاؤں اور قصبوں میں پھیل گئی اور لوگ بیل گاڑیوں، موٹروں اور ٹرکوں کے ذریعے دیوبند آنا شروع ہو گئے۔

آل انڈیا ریڈیو نے ایک بجے کی خبروں میں انتقال کی خبر نشر کی اس خبر سے پورے عالم اسلام میں صف ماتم بچھ گئی، ملک بیرون ملک کے دور دراز علاقوں سے عقیدت مندوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا رات گیارہ بجے تک بمبئی، مدراس، اور بنگلہ دیش تک سے افراد دیوبند پہنچ گئے تھے اور قاری صاحب کی آخری رسومات میں شرکت سے سرفراز ہوسکے۔

ان کی وصیت کے مطابق میت کو جلد دفن کرنا تھا اس لئے تدفین کی تیاریاں جلد مکمل کرلی گئیں موصوف کا کفن پہلے ہی دفتر اہتمام میں رکھا ہوا تھا جسے خود قاری صاحبؒ نے اپنے ہاتھوں سے رکھا تھا۔ اسی کفن میں میت رکھی گئی اور پھر زیارت کرنے والوں کے دیدار کیلئے جنازہ بھی رکھدیا گیا۔

آج یہاں ایک ایسا شخص اپنے آخری لباس میں لپٹا ہوا تھا ــــ بے داغ، پرسکون اور تکمیل یافتہ ابدی نیند کی چادر میں لپٹا ہوا ــــ جس کے ہونٹوں پر تھرے ہوئے پانی جیسی مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں ایک ایسے خواب کی تحریر جسے اپنی تعبیر مل چکی ہو جہاں وہ جسد خاکی رکھا ہوا تھا اس کے نیچے زمین اور اوپر آسمان اور گردوپیش موجود لوگ ایک آب دیدہ خاموشی میں ساکت وصامت کھڑے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی کوئی دبی ہوئی سسکی یا بے تابو چیخ ادب واحترام کی پابندیوں کو توڑتی ہوئی سنائی پڑتی تھی چاروں طرف جو چہرے تھے وہ آنسوؤں کی جلن سے چھپ گئے تھے اور کبھی تو ایسا لگتا تھا جیسے صرف آنسوؤں نے مختلف شکلیں اختیار کرلی ہیں بچے اور نوجوان جو ابھی قاری صاحب کی زندگی کے تمام اوصاف سے واقف بھی نہیں تھے بیقراری سے تڑپے جارہے تھے۔

ادھر پورا دیوبند شہر تقریباً معطل ہوچکا تھا۔ کسی کو کسی کا احساس اور علم نہیں تھا۔ کسی کو کسی کام دکاروبار کی یاد نہیں تھی ہر شخص کو یوں لگ رہا تھا جیسے خود اس کے اپنے گھر میں کوئی بہت بڑی ہی قریبی شخص مرگیا ہے یا جیسے کوئی شدید محبت والا رشتہ اچانک ٹوٹ گیا ہے۔

دارالعلوم بند تھا۔ طلباء اور اساتذہ اس طرح غم زدہ تھے جیسے ان کا باپ مرگیا ہو غم و اندوہ اور رنج وافسوس کی اسی گلوگیر اور اشک بار فضا میں شب کو تقریباً ۱۱ بجے جنازہ اٹھایا گیا۔ نماز جنازہ **احاطہ** مولسری ادا کی گئی اور تدفین بھی عمل میں آئی۔

حالات زندگی

مولانا قاری طیبؒ قاسمی صاحب بانئ دارالعلوم دیوبند مولینا قاسم نانوتوی کے پوتے تھے۔ ان کی ولادت ۱۸۹۷ء ماہ جون بروز یکشنبہ کو ہوئی ــــ ان کا تاریخی نام مظفر الدین تھا۔ قاری صاحب کی ولادت بڑی دعاؤں کا ثمرہ تھی۔ ان کے والد حافظ محمد احمد صاحب کو جب کافی دنوں تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تو اس وقت کے بزرگ شیخ الہند کو فکر ہوئی کہ کہیں مولینا نانوتوی کا خاندان کا سلسلہ رک نہ جائے۔ انہوں نے ایک بزرگ سے جو مستجاب الدعوات تھے اس سلسلے میں دعا کرنے کو کہا۔ اس بزرگ کی دعا اور خدا کی عطا سے حافظ محمد احمد کے یہاں تین اولادیں ہوئیں۔ ان میں

سے ایک قاری طیبؒ تھے۔

قاری صاحبؒ بچپن ہی سے بڑے سلیم الطبع اور نیک سیرت تھے انھیں سات سال کی عمر میں دارالعلوم میں داخل کرایا گیا۔ دو سال کی قلیل مدت میں انھوں نے قرآن مجید قرأت وتجوید کے ساتھ حفظ کیا۔ پانچ سال ریاضی اور فارسی کی تعلیم حاصل کر کے عربی کا نصاب شروع کیا جس سے ۱۹۱۸ء میں فراغت اور سندِ فضیلت حاصل کی۔ انھیں وقت کے مشاہیر علماء اور بزرگوں کا خصوصی شاگرد ہونے کا شرف حاصل رہا۔ ان میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الہند اور مولانا اشرف علی تھانوی شامل ہیں۔

تکمیل کے بعد آپ نے دارالعلوم میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ ذاتی علم وفضل اور ذہانت وذکاوت کے سبب جلد طلباء میں مقبولیت حاصل ہو گئی ۱۹۲۳ء میں وہ نائب مہتمم بنائے گئے اور ۱۹۲۹ء میں مہتمم کے عہدے پر فائز ہوئے۔

قاری صاحبؒ بے مثال خطیب اور مقرر تھے۔ ان کی آواز میں اتنی شیرینی اور حلاوت تھی کہ صرف اسی کے اثر سے ہزاروں لاکھوں کے مجمعے کا دل جیت لیتے تھے۔ انکی تقریروں کے ریکارڈ بھی بنائے گئے ہیں۔

انہوں نے ساٹھ سے زیادہ کتابیں تصنیف فرمائیں جیسے سائنس اور اسلام، خاتم النبیینؐ، اسلام میں اخلاق کا نظام، فطری حکومت، اسلام اور مسیحی اقوام اور کلمۂ طیبہ وغیرہ ہیں۔

وہ ہر جمعہ کو جامع مسجد دیوبند میں تقریر کیا کرتے تھے۔ یہ معمول بیس بائیس سال تک جاری رہا۔ ان کے مواعظ اور تقاریر سے لاکھوں افراد روشنی اور اطمینان قلب حاصل کرتے تھے۔ ان کے بیان میں ایسی سلاست تھی اور علم وعرفان کی اتنی گہرائی تھی کہ لوگ اس کے سحر میں گرفتار ہو جاتے تھے۔

آخری ایام

قاری طیب صاحب تقریباً پچاس برس تک دارالعلوم دیوبند کے مہتمم رہے ۱۹۴۷ء کے بعد چند برسوں کے دوران جب وہ پاکستان چلے گئے تھے وہ دارالعلوم سے غیر حاضر رہے لیکن اس عرصے میں بھی اس درسگاہ اور اس کے بہی خواہوں کو ان کی کمی کھٹکتی رہی۔ جس زمانے میں وہ پاکستان میں تھے مولانا اشرف علی تھانوی نے پنڈت نہرو سے انھیں دوبارہ ہندوستانی شہری بنانے کی درخواست کی تھی۔ پنڈت جی سے مولانا تھانوی نے کہا تھا کہ دارالعلوم کو مہتمم تو بہت سے میسر آجائیں گے لیکن قاسم نانوتویؒ کا پوتا میسر نہ ہو سکے گا۔ آپ کا خیال یہ تھا کہ بانیٔ دارالعلوم سے خاندانی نسبت کے سبب قاری طیب صاحبؒ کو وراثتاً ایسے اوصاف ودلیعت ——— ہوئے ہوں گے جو دارالعلوم کو شعوری لاشعوری طور پر اس کے بانی کے تصور اور خواب کے قریب تر رکھیں گے۔

قاری صاحبؒ نے اپنے عہدِ اہتمام کے دوران دارالعلوم کو ایک وقار اور اعتبار دینے میں قابل قدر کاوشیں کیں انکے مریدین وارادت مندوں کا سلسلہ چونکہ ہندوستان کے اندر کئی شہروں بیرون ہند کئی ممالک میں پھیلا ہوا تھا اس لئے ان کے تعاون سے یہ درسگاہ روز افزوں

ترقی کرتی رہی اور اس نے دنیا کی اسلامی درسگاہوں میں ایک مخصوص مقام حاصل کر لیا۔ یہاں تک کہ دارالعلوم دیوبند دنیائے اسلام کی چند بڑی اسلامی یونیورسٹیوں میں شمار ہونے لگا۔ عمارتوں میں پھیلاؤ اور مادی وسائل میں اضافے کے ساتھ ساتھ طلباء و اساتذہ کے معیار و تعداد میں بھی اضافہ ہوا اور وہاں سے فارغ ہونے والے علماء نے دور دور تک علم دین کی شمعیں جلائیں۔

لیکن اپنی عمر کے آخری دو تین برسوں میں قاری طیب صاحبؒ کی پرسکون اور پاکیزہ زندگی میں ایک ایسا طوفان آیا جس نے ان کے حواس اور دل و دماغ پر بڑی کاری ضربیں لگائیں۔ وہ طوفان تھا دارالعلوم میں اقتدار کی رسہ کشی۔ اقتدار کی اس جنگ کا کیا انجام ہوا وہ اب عیاں ہو چکا ہے۔ لیکن ان المناک اور قابل مذمت معاملات نے قاری صاحبؒ کی روح کو اندوہ سے بھر دیا۔ اگر وفات سے کچھ قبل ان سے بہت مخصوص اور تنہائی کا انٹرویو لیا جاتا تو شاید ان کے تاثرات کا حقیقی علم ہو جاتا۔ لیکن پھر بھی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس دار فانی سے ان کی رخصتی انتہائی کرب ناک اور الم انگیز تھی۔ اور کسی بھی قوم کیلئے یہ انتہائی رسوائی کی بات ہے کہ وہ اپنے عالموں اور روحانی شخصیتوں کو اتنے دکھ دے کر رخصت کرے۔

۱۔ لہٰذا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں اس کی ضرورت ہے کہ شفقت ہو اور نرمی سے بھائی بندی کے طرز پر ہو، مسئلہ بھی معلوم ہو جائے اور دوسرا شرمندہ بھی ہو جائے۔ (حکیم الاسلامؒ)

۲۔ نفس کو اتنا آزاد چھوڑ دینا کہ وہ حاکم بن جائے آدمی پر یہ فساد کی جڑ ہے۔ (حکیم الاسلامؒ)

عوام اور خواص کی توبہ میں فرق

۳۔ توبہ صرف معصیت ہی پر نہیں کی جاتی بلکہ ہر ایک کی توبہ الگ الگ ہے عوام کی توبہ تو یہ ہے کہ کوئی کبیرہ گناہ کر لیا تو آئندہ اس کو کرنے سے توبہ کر لیا۔ اور خواص کی توبہ یہ ہے کہ اگر وہ گناہ صغیرہ بھی کرتے ہیں تو پھر بھی توبہ کرتے ہیں، اور اخص الخواص کی توبہ یہ ہے کہ اگر وہ خلاف اولیٰ بھی کرتے ہیں تو اس کو گناہ سمجھتے ہیں اور اس پر توبہ کرتے ہیں یہ ہر ایک کے مقام کی بات ہے۔ (حکیم الاسلامؒ)

۴۔ حکیم الاسلام نے فرمایا کہ ہم نے اس کا تجربہ کیا ہے واقعی حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں میں عجیب عجیب علوم اور حقائق ہیں وہ جزئی سے چلتے ہیں اور وصول کی طرف جب آتے ہیں تو اس میں ہزاروں جزئیات پیدا ہو جاتی ہیں بعض لوگ دقیق سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں یہ ان کی غلطی ہے کیونکہ جب ایک جگہ بات سمجھ میں نہیں آتی تو دوسری اس کی تفصیل مل جاتی ہے جو ابتداء میں ڈر کر چھوڑ دے وہ تو گیا اس کو کچھ نہیں ملیگا لیکن جو شخص اول سے آخر تک لگا رہا تو آخر میں ساری باتیں خود بخود سمجھ میں آجائیں گی۔

(حکیم الاسلام اور ان کی مجالس)

اَخبار و جرائد

راشدات طیبات

ماہنامہ الرشید پاکستان

وجاہتِ حضرت قاری محمد طیب صاحب قاسمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

سرخ و سپید رنگ، بیضوی چہرہ، غلافی آنکھیں، کشادہ پیشانی، دلکش خد و خال، تیکھے نقش، موزوں قامت اکہرا بدن، زنگار آتش رخ، سر پر کلاہِ فضیلت، آنکھوں میں حیا، طبیعت میں گداز، روشن پر اسلام کی سیزدہ صد سالہ روایات کی تابندگی کا پرتو، ایک پیکرِ حسن و جمال، ایک مجسمۂ خوبی و رعنائی، ایک سراپا اخلاص و للہیت و جوذ علم و معرفت کا سرچشمہ، رشد و ہدایت کا منبع، شریعت و طریقت کا مرکز، حسنِ ظاہری و باطنی کا جامع، ایک مینارۂ نور جس کی ضیا باریوں سے فکر و نظر کا دامن منور اور دلوں کی دنیا جگمگاتی تھی۔ جس کا سینہ معرفتِ الٰہی کا گنجینہ اور دل انوار و تجلیات کا خزینہ تھا۔

مولانا قاری محمد طیبؒ ہمارے کاروانِ علم و فضل کے ان باقیات و صالحات میں سے تھے جنھیں دیکھکر ایک گونہ اطمینان ہوتا تھا کہ یہ دنیا ابھی اہل اللہ سے خالی نہیں ہوئی اور ابھی ہمارے دامن میں ایسے گنج ہائے گراں مایہ موجود ہیں جن سے نہ صرف ہماری عظمت کا قومی بھرم قائم ہے بلکہ جو خود انسانیت کی آبرو اور اس کے چہرے کا غازہ ہیں۔ وہ اس خانوادۂ شرف و مجد کے گوہر شب چراغ تھے جو خاندانِ ولی اللّٰہی کے روحانی اثاثہ کا امین اور علمائے سلف کی متاعِ عظمت کا وارث رہا ہے۔ ان کے جدِ امجد مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے دار العلوم دیوبند کی بنیاد رکھی اور آج ہندوستان کی ناموافق آب و ہوا وقت کی ناسا عدت اور حالات کی ناسازگاری کے باوصف یہ حضرت قاری صاحبؒ کی کرامت تھی کہ وہ اس مرکز علمی اور اپنی نوعیت کی دنیا بھر میں منفرد درسگاہ کی آب و تاب اور اس کی روایتی شان و شوکت کو برقرار رکھے ہوئے تھے۔ تقسیم ملک کے ابتدائی دور میں انھوں نے پاکستان کو اپنا مستقر بنانا چاہا مگر یہاں کی فضا انہیں راس نہ آسکی اور وہ حضرتِ مدنیؒ کے تقاضا داصرار پر واپس دیوبند تشریف لے گئے۔ آج دار العلوم دیوبند اس ظلمت کدۂ شرک و معصیت میں روشنی کا وہ مینارہ ہے جس سے اکناف و اطرافِ عالم کے تشنگانِ علم اکتساب ضیا کرتے ہیں۔

حضرت قاری صاحبؒ تقریر کرتے تھے تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے نسیم صبحگاہی محوِ خرام ناز ہو، وہ بولتے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے ان کے اندازِ تکلم میں جوئے آبِ رواں کی نغمگی تھی جو فردوسِ گوش بن جاتی تھی ان کے لب لہجہ میں حدی خوانوں کا سوز اور انکی گفتگو میں نو دمیدہ غنچوں کی مہک تھی جو دماغوں کو معطر کرتی اور دلوں کی دنیا میں ہلچل برپا کر دیتی، بے رہی عظمتِ رفتہ کی حسین و جمیل یادگار تھے۔ قاری صاحبؒ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ اجل تھے۔ سیاست سے الگ ہو کر علم کی دنیا کے سیاح عمل کی وادیوں میں تھے۔

جستجو کر "خوب سے خوب تر کہاں" کے متلاشی، خیال و کردار میں پاکیزہ، فکر و نظر میں راستباز، تقویٰ و طہارت میں نمونہ کے انسان، خوش وضع، خوش قطع، خوش لباس، خوش پوشاک، خوش بخت، خوش خصال، خوش اطوار، خوش نہاد، ایک نورانی وجود (والدین) کر ادب کی درخشندہ مثال جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک اور شبنم کا صحیح مصداق......

بانیٔ دارالعلوم دیوبند کے پوتے مہتمم دارالعلوم مولانا حافظ محمد احمدؒ کے فرزندِ طیب، حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت حضرت حکیم الامتؒ کے خلیفہ، علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے تلمیذ رشید دارالعلوم دیوبند کے پچپن سال خدمتگار۔ مزاج ایسا کہ بچوں کے ساتھ ہوں تو حکایتِ لطیف، نوجوانوں، بزرگوں کو کلماتِ طیبات فرمادیں تو اخلاقِ محسنی۔ دلچسپ لطائف سنائیں تو گلستان، منظوم ہدایت کا باب کھلے تو "ہست قرآں در زبانِ پہلوی"

حلیم و بردبار شخص و متواضع وجودِ مسعود ؞ مگر بلند سخن و نواز جاں پُر سوز

فاضل رشیدی القاسمی

دارالعلوم دیوبند کا آخری چراغ بجھ گیا

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

دارالعلوم دیوبند کی محفل دوشین کا وہ چراغ سحر جو پچھلے دو سال سے حوادث وانقلابات زمانہ کے جھونکوں کو بجھ بجھ کر بھی ٹمٹما رہا تھا بالآخر شوال ۱۴۰۳ھ کے پہلے ہفتہ میں ہمیشہ کیلئے خموش ہو گیا یعنی حکیم الاسلام، مظہر انوار قاسمیہ، مسند نشین جامعہ دیوبند، ترجمان حقائق اسلامیہ مولانا حافظ قاری محمد طیب صاحب قاسمی قدس اللہ سرہ العزیز نے داعی اجل کو لبیک کہا اور دیوبندی مکتب فکر کے اس میر مجلس کے بساط لپیٹ دینے سے محفلیں اجڑ گئی ہیں اور ہر سو وحشت اور دیوانگی کا سا عالم ہے اب اس دور کا بالکل خاتمہ ہو گیا ہے جو شیخ الہند مولانا محمود الحسن، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، علامۃ العصر مولانا انور شاہ کشمیری، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ شبیر احمد عثمانی کا یادگار تھا ان کی ذات ان اکابر کی نہ صرف بقیۃ السلف نشانی تھی بلکہ ان کی ذات میں ان تمام اکابر و اساطین دیوبند کی نسبتیں جمع تھیں اور وہ زندگی بھر اپنی ذاتی حسبی اور نسبی گوناں گوں خصائص و کمالات کی وجہ سے ان تمام اکابر کے محبوب بن چکے تھے ایک مرحلہ ایسا آیا کہ شاید آپ دارالعلوم دیوبند چھوڑ کر پاکستان سکونت اختیار کر لیتے ادھر اکابر دیوبند باصرار آپ کو دوبارہ دیوبند کھینچ لائے تو استقبالیہ تقریب میں حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ نے دیدہ پرنم اور گلوگیر آواز میں انکو مخاطب کر کے فرمایا ؎

اے تماشا گاہ عالم روئے تو
تو کجا بہر تماشا می روی

بلاشبہ ان کی ذات محبوبیت میں تماشا گاہ عالم تھی، وہ اس گلشن علم و معرفت کے مالی اور شجرۂ طوبی کے امین تھے جس کے لئے حجۃ الاسلام ولی اللہ دہلوی حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور شہداء بالاکوٹ نے زمین ہموار کی

جسکی داغ بیل حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور فقیہ الاسلام رشید احمد گنگوہی نے ڈالی اور جسکی آبیاری میں شیخ الہند محمود الحسن، حکیم الامت اشرف علی تھانوی، علامۃ العصر انور شاہ کشمیری اور مجاہد اعظم مولانا حسین احمد مدنی جیسے مجاہدین امت نے اپنی زندگی تج دی۔ یہ امانت جب آپ کے ہاتھوں آئی تو پون صدی کے طویل اور صبر آزما شبانہ روز خداداد اہلیت وصلاحیت، اخلاص و دیانت اور والہانہ جہد و عمل کے ساتھ آپنے اس مدرسہ علم کو ایک ایسے جامعہ میں تبدیل کر دیا جسکے انوار و تجلیات سے ایک عالم جگمگا اٹھا اور وہ اس امانت سے الگ ہو کر جب دنیا سے رخصت ہوئے تو دیوبند کا وہ سرچشمہ علم علوم نبوت کا ایک بحر ذخار بن کر علم و دانش کی پوری دنیا سے اپنی برتری اور فضیلت کا لوہا منوا چکا تھا۔

آپ حضرت بانیٔ دارالعلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی کے پوتے مولانا محمد احمد مہتمم خاص کے صاحبزادے تھے حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری کے خصوصی تمیذ حضرت شیخ الہند سے بیعت اور حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی کے خلیفۂ مجاز تھے پورے طبقہ کے محبوب منظور نظر اور مرکز علمی کی سیادت کے لحاظ سے پوری جماعت کے سید الطائفہ تھے علمی فیض کے علاوہ بیعت ارشاد کے میدان میں بھی لاکھوں مسترشدین کے روحانی رہبر و رہنما تھے ۱۳۳۶ھ میں درس نظامی سے فراغت پائی اور دارالعلوم دیوبند میں درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا۔

۱۳۴۳ھ سے ۱۳۴۸ھ تک دارالعلوم کے نائب مہتمم رہے ۱۳۴۸ھ سے لیکر وفات سے کچھ عرصہ قبل تک اس مرکز علم و ہدایت کی سیادت آپ کو حاصل رہی نیرنگیٔ زمانہ یا چرخ نیلگوں کی ستم ظریفی کہیے کہ زندگی بھر علم و حکمت کے حسین "تاج محل" (دارالعلوم دیوبند) کی آرائش و تزئین میں مصروف رہے۔

جب وہ نبار عظیم جشن صد سالہ کی شکل میں عظمت و ترقی کے اوج کمال کو چھونے لگی تو اس عمارت کا یہ "شاہجہاں" جدائی اور مجبوری کے داغ لئے ہوئے اس دنیائے رنگ و بو سے الگ ہو گیا جو کچھ پیش آیا کون اسکے محرکات ان عہد اہتمام کی طرح دیرینہ اور قدیم تھے اور مشیت ایزدی کے سامنے کس کی چلتی ہے۔ مگر پھر بھی بے اختیار جی میں آتا ہے کہ کاش یہ صورت حال دو ایک سال مزید پیش نہ آتی اور دارالعلوم دیوبند کا یہ جرنیل انہیں عظمتوں اور رفعتوں کے ساتھ اور انہیں قدر شناسیوں کے ساتھ ہم سے رخصت ہوا ہوتا جو زندگی بھر ہم سب نے انہیں کیلئے مخصوص کر رکھی تھی اور جس کے وہ سزاوار تھے کہ سالار کارواں کی شوکت و سطوت پوری جماعت اور قافلہ کی شان بڑھاتی ہے ولکن ماشاء اللہ کان وما لم یشأ لم یکن

حکیم الاسلام نسبی اور روحانی رشتوں کے ساتھ ساتھ علم و حکمت کے لحاظ سے اپنی ذات سے بھی ایک انجمن

تھے۔ ان کے علوم و تصانیف اور خطبات حکمت ولی اللہی اور معرفت نانوتوی کے ابلتے ہوئے سرچشمے ہوتے تھے۔ اسرار دین کی تشریح اور رموز شریعت کی ترجمانی میں ان کا شمار گنے چنے حکماء اسلام میں ہو سکتا ہے ان کی ہر تقریر حقائق معارف کا ایک سمندر اور ہر تحریر اسرار و نکات کی ایک دنیا اپنے اندر لئے ہوئے تھی ان کے خطبات سے نہ صرف برصغیر کا گوشہ گوشہ بلکہ عالم اسلام کے علاوہ افریقہ اور یورپ کی دور دراز بستیاں بھی مستفید ہوئیں دین اور مادر علمی دیوبند کی آواز پہنچانے میں زندگی کا اکثر حصہ طویل اسفار کی نذر ہوا اسلام کے اہم اور عصر حاضر کے جدید مسائل پر ایک سو سے زائد تصانیف چھوڑیں حدیث و تفسیر اور فن حقائق و اسرار کی کتابیں اکثر زیر درس بھی رہتیں دعوت و بیان کا انداز حکیمانہ تصنیف و تالیف کی شان فلسفیانہ ہونے کے باوجود شعر و سخن میں بھی اعلیٰ ذوق اور اچھا انداز رکھتے تھے انکی مثنویاں قصائد اور فصیح و بلیغ نظمیں اعلیٰ ترین ذوق سخن کی غمازی کرتی ہیں۔

الغرض وہ اپنے جامع الصفات اکابر و اسلاف کے کمالات و محاسن نجابت و سعادت شرافت و وجاہت فضل و کمال، اخلاق و شرافت، وقار و تمکنت، فکر و اصابت، تواضع و متانت کا ایک پیکر جمیل اور دیوبند کی اعلیٰ روایات کا ایک مرقع اور ظاہری لطافت و نظافت اور حسن و پاکیزگی کا ایک مجسمہ تھے۔ ان کا ماتم ان سب صفات کا ماتم ہے پوری قوم اور پوری ملت کا ماتم ہے دنیائے علم و فضل کا ماتم ہے درسگاہوں جامعات اور خانقاہوں کا ماتم ہے اور دارالعلوم حقانیہ کے لئے بھی اس لحاظ سے ایک عظیم ماتم کہ دارالعلوم اور اسکے بانی مدظلہ کے ساتھ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے علائق و روابط اور خصوصی عنایات و توجہات کی داستان تقریباً نصف صدی پر پھیلی ہوئی ہے۔

کبھی فرصت میں سن لینا بڑی ہے داستاں میری

الوداع اے فخر دین و ملت، الوداع اے خادم حسن اسلام، الوداع اے شارح علوم قاسمیہ، الوداع اے امین گلشن علوم نبویہ۔ الوداع اے میر کارواں الوداع۔ تیری تربت پر ہزاروں رحمتیں ہوں۔ اور تو رب کریم کی بے پناہ لطف و کرم سے مالامال ہوئے

نذر من اشک بے قرار از من پذیر
گریۂ بے اختیار از من پذیر

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند

۶؍ شوال ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷؍ جولائی ۱۹۸۳ء یوم دوشنبہ کو دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم خطیب العصر حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نبیرہ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ طویل علالت کے بعد اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے۔ (نوراللہ مرقدہٗ وبرّد اللہ مضجعہ)

اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دنیا میں آنیوالے ہر مسافر کی آخری منزل موت ہے اور یکے بعد دیگرے سب کو اسی منزل پر پہونچنا ہے۔ اس لئے اس دنیا سے کوچ کرجانا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہے لیکن اسکے باوجود بعض شخصیتیں ایسی گوناگوں خصوصیات اور ہمہ گیر صلاحیتوں کی مالک ہوتی ہیں کہ ان کا اس عالم سے رخصت ہوجانا واقعۃً ایک عظیم حادثہ ہوتا ہے جس کے فراق اور جدائی سے پوری قوم وملت سوگوار ہوجاتی ہے۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس سرہٗ کی ذات گرامی ان ہی ممتاز ومنفرد شخصیتوں میں سے ایک تھی۔

حضرت قاری صاحب مرحوم ومغفور اس دور میں نہ صرف ہند وپاک بلکہ پورے عالم اسلام کے ممتاز ترین اور مشہور ترین رجال علم دین میں سے تھے۔ شخصی وجاہت اور علمی تبحر کے ساتھ خطابت وتقریر میں آپ کو ایسا ملکہ حاصل تھا جس کی نظیر اس دور میں پیش نہیں کی جاسکتی۔ اسرار وحکم بالخصوص فلسفۂ ولی اللّٰہی اور حکمت قاسمی کی توضیح وتشریح آپ کا دلچسپ موضوع تھا۔ مسلک دیوبند کے ترجمان وشارح کی حیثیت سے علماء کی صف میں جو مقام حاصل تھا وہ ان کے معاصرین میں سے کسی کے حصہ میں نہیں آیا۔ عالمی شہرت ووقعت کے بلند ترمقام پر فائز ہوتے ہوئے تواضع وخاکساری اور شرافت نفس کا مجسمہ تھے، متانت ووقار، ظرافت ومروّت اور لحاظ وپاسداری آپکی عادت ثانیہ تھی۔ تصنیف وتالیف کا نہایت ستھرا ذوق پایا تھا۔ دارالعلوم کے اہتمام کی ہمہ جہت مصروفیات اور

کثرت اشغال کے باوجود تصنیفات کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ آپ کی علمی یادگار ہے جس میں بعض کتابیں اپنے موضوع گرامی اور اسلوب نگارش کے لحاظ سے اسلامی لٹریچر میں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

تاریخ ولادت اور علمی نشو و نما

محرم الحرام ۱۳۱۵ھ مطابق جون ۱۸۹۷ء یکشنبہ کو آپ کی پیدائش ہوئی۔ تاریخی نام مظفر الدین اور اصلی نام محمد طیب تجویز ہوا۔ حضرت قاری صاحب نے ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جو علم و فضل کا مرکز تھا آپ کے والد ماجد حضرت مولانا حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ صاحب نسبت عالم ہونے کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم اور مرجع علماء و فضلاء تھے۔ اس لئے گھر کا پورا ماحول علم دین اور روحانیت کی خوشبو سے رچا بسا تھا جس کا اثر طبعی طور پر حضرت قاری صاحب کی نشو و نما پر نہایت اچھا پڑا اور بچپن ہی سے دل و دماغ علم و علماء کی عظمت و محبت سے مانوس ہو گئے تھے۔

سن شعور کو پہنچے تو خاندانی روایت کے مطابق علماء و صلحاء کے ایک بڑے مجمع میں آپ کی رسم بسم اللہ ادا کی گئی اور مکتب میں بٹھا دیا گیا۔ حضرت مولانا فضل الرحمن عثمانی کے از بانیان دارالعلوم نے موقع کی مناسبت سے اس وقت ایک قصیدہ پڑھا تھا جس کا مطلع اور مقطع یہ تھا۔

مکتب طیب کی مبارک تقریب ؛ کچھ عجب طرح کا جلسہ تھا ئی طرح کی سیر

رب یسر جو کہا اس نے تو بے روئے رہا ؛ فضل تاریخ میں بول اٹھا کہ تمم بالخیر

مقطع کے آخری جملہ تمم بالخیر سے رسم بسم اللہ کی تاریخ نکلتی ہے جو ۱۳۲۲ھ ہے۔

حفظ قرآن اور تحصیل و تجوید

حضرت قاری صاحب کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں اساتذہ دارالعلوم بالخصوص مولانا حبیب الرحمن عثمانی قدس سرہم نے آپ کی آبائی نسبت اور خاندانی وجاہت و شرافت کے پیش نظر خصوصی توجہ سے کام لیا اور خود آپ کے والد ماجد کو بھی اس کا خاص اہتمام تھا۔ چنانچہ عام روش کے برخلاف آپ کو حفظ قرآن تجوید کے ساتھ کرایا گیا اور اس کے لئے مولانا قاری عبدالوحید خاں صاحب الہ آبادی کو ذاتی طور پر بلا کر اپنے گھر پر رکھا بعد میں حضرت شیخ الہند قدس سرہ کے مشورے سے قاری صاحب کو باقاعدہ دارالعلوم میں مدرس رکھ لیا گیا تو حضرت قاری صاحب بجائے گھر میں پڑھنے کے باقاعدہ دارالعلوم میں داخل ہو گئے اور دو سال کی قلیل مدت میں پورا قرآن مجید باتجوید حفظ کر کے ۱۳۲۶ھ میں شعبہ تحفیظ القرآن سے فارغ ہو گئے۔ اسی وقت سے لفظ قاری آپ کے ساتھ لگ گیا اور پھر اس طرح چسپاں ہوا کہ نام کا جزو بن گیا۔

ابتدائی عمر میں حضرت قاری صاحب کی آواز نہایت بلند اور دلکش تھی اپنے ہم عمر طلبہ میں خوش آوازی میں ممتاز و منفرد درجہ رکھتے تھے۔ حضرت قطب الارشاد مولانا گنگوہی قدس سرہٗ اور دیگر اکابر دارالعلوم بطورِ خاص آپ سے قرآن کریم کا رکوع پڑھوا کر سنا کرتے تھے۔

تعلیم فارسی

حفظ قرآن سے فراغت کے بعد سنہ ۱۳۲۲ھ میں آپ کو درجۂ فارسی میں داخل کیا گیا اور تین سال کی مدت میں فارسی کے مروجہ نصاب کی تکمیل کے ساتھ ساتھ ریاضی حساب، جغرافیہ وغیرہ کی بھی تحصیل کرلی اور اسی کے ساتھ ساتھ تجوید کی کتابیں بھی پڑھتے رہے۔ آپ کے فارسی اساتذہ میں مولانا محمد یٰسین صاحب والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مولانا موصوف فارسی دانی میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ اور اپنے طویل تجربہ اور طریقۂ تعلیم کی خوبی کی بنا پر مختصر سی مدت میں اپنے تلامذہ کے اندر فارسی زبان کا اچھا خاصا ذوق پیدا کر دیتے تھے۔ چنانچہ ایک طرف استاد کی حسن تعلیم و تربیت اور دوسری طرف خداداد ذہانت و فطانت دونوں نے مل کر سونے پر سہاگہ کا کام کیا کہ دوران تعلیم ہی میں آپ اردو اور فارسی میں غزلیں اور قصائد کہنے لگے تھے۔ فارسی زبان میں اسی پختہ استعداد کا ثمرہ تھا کہ جب آپ نے سنہ ۱۳۵۸ھ میں دارالعلوم دیوبند کے نمائندہ کی حیثیت سے افغانستان کا سفر فرمایا تو آپ نے بالعموم فارسی زبان ہی میں تقریریں کیں اور علمی و دینی سوالات کے جوابات دیئے جس کا وہاں کے لوگوں پر بڑا اچھا اثر پڑا۔

درجہ عربی میں داخلہ اور درس نظامی کی تحصیل

سنہ ۱۳۲۵ھ میں درجۂ فارسی کی تکمیل کر کے اگلے سال درس نظامی کی تعلیم و تحصیل کا آغاز کر دیا۔ اور سات سال کے عرصہ میں صرف، نحو، بلاغت، منطق، فلسفہ، فقہ، اصول فقہ، عقائد، تفسیر وغیرہ پڑھ کر آٹھویں سال دورہ حدیث میں داخل ہوئے اور محدث عصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری وغیرہ اساتذہ دارالعلوم سے کتب صحاح ستہ وغیرہ پڑھ کر ۱۳۳۷ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔

اسے حضرت قاری صاحب کی خوش نصیبی کہیے یا قدرت کا خصوصی انعام کہ انہیں تعلیم و تربیت کے ابتدائی دور ہی سے ماہر فن اور پختہ کار اساتذہ کی رہنمائی حاصل رہی۔ چنانچہ حفظ و تجوید اپنے دور کے ممتاز قاری مولانا قاری عبدالوحید خاں الہ آبادی سے پڑھا۔ فارسی کی تحصیل مولانا محمد یٰسین دیوبندی سے کی جو فارسی دانی میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ فن معقولات میں آپ کے اساتذہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی اور حضرت مولانا غلام رسول جیسے جہابذہ تھے۔ علم فقہ میں اپنے وقت کے شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا

اعزاز علی امروہوی سے شرف تلمذ حاصل تھا درحدیث شریف کی تعلیم اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد احمد صاحب حضرت مولانا سید اصغر حسین دیوبندی، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی اور محدث عصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری، جو اپنی کثرت معلومات، وسعت مطالعہ، قوت حافظہ اور دقت نظر میں ابن حجر ثانی تھے۔ اور معاصر علماء میں چلتا پھرتا کتب خانہ کے نام سے مشہور تھے۔

درس و تدریس

چونکہ حضرت قاری صاحب کی ابتداء سے کر انتہا تک پوری تعلیم دارالعلوم ہی میں ہوتی تھی آپ کی طالب علمی کا مکمل زمانہ حضرت اکابر کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ آپ کی نسبت طبعی ذہانت، طبعی شرافت و متانت اور علمی مناسبت روز روشن کیطرح سب پر آشکارا تھی، اس لئے تعلیم سے فراغت کے بعد آپ کو دارالعلوم کے شعبہ تدریس میں لے لیا گیا اور شروع میں ابتدائی درجات کی کتابیں آپ کے زیر درس رکھی گئیں، علمی استعداد اور زبان و بیان پر قابو یافتہ ہونے کی بنا پر آپ کے درس کو تھوڑی ہی مدت میں قبول عام حاصل ہوگیا۔ اور چند ہی سالوں میں وسطی اور علیا کی کتابیں آپ کے زیر درس آگئیں۔ تدریس کا یہ سلسلہ آخر تک قائم رہا اگرچہ اسفار کی کثرت اور کار اہتمام میں مشغولیت کی بناء پر درس کا موقع کم ہی ملتا تھا لیکن جب بھی فرصت مل جاتی تو حجۃ اللہ البالغہ یا کسی حدیث کی کتاب کا درس ضرور دیتے تھے

تدریس سے مسند اہتمام

ربیع الاول ۱۳۴۱ھ میں جب آپ کے والد حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم نظام دکن کی تجویز و طلب پر بمشاہرہ ایک ہزار روپے ماہانہ ریاست دکن کی عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) کے مفتی ہوکر حیدرآباد چلے گئے اور اہتمام کی ساری ذمہ داری حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ نائب مہتمم پر آپڑی تو اس وقت کی مجلس شوریٰ نے حضرت مولانا عثمانیؒ کا ہاتھ بٹانے کی غرض سے حضرت قاری صاحب کو نائب مہتمم ثانی مقرر کیا۔ پھر ذیقعدہ ۱۳۴۱ھ کے اجلاس شوریٰ میں جبکہ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب (جو حیدرآباد میں قیام کے باوجود منصب اہتمام پر فائز تھے۔) کو ان کی کبر سنی اور طول علالت کی بناء پر بجائے مہتمم کے اعزازی صدر مہتمم منتخب کیا گیا اور ان کی جگہ پر حضرت مولانا عثمانیؒ مہتمم بنائے گئے۔ تو حضرت قاری صاحب کو نائب مہتمم اول مقرر کیا گیا۔ مگر ایک جماعت کی اختلاف کی بناء پر جس میں بعض اہم ترین اکابر بھی شامل تھے (۱) حضرت قاری صاحب نے اہتمام کی ذمہ داریوں سے استعفا دیدیا جسے مجلس شوریٰ نے منظور کرکے بمشاہرہ یک صد روپیہ انہیں دوبارہ تدریس میں منتقل کر دیا لیکن دو ڈھائی ماہ کے بعد حضرت مولانا عثمانی کی تحریک و تجویز پر حضرت قاری صاحب کو دوبارہ منصب اہتمام پر فائز کر دیا گیا اور رجب ۱۳۴۸ھ میں حضرت مولانا

عثمانی مہتمم دارالعلوم کے سانحۂ وفات کے بعد حضرت اقدس مولانا تھانوی قدس سرہٗ سرپرست مدرسہ کی حسب ذیل تجویز کے مطابق قائم مقام مہتمم بنا دیے گئے۔

تجویز حضرت اقدس مولانا تھانوی قدس سرہٗ

مصالح مدرسہ پر نظر کر کے حتی الامکان جلد سے جلد تجویز ہے کہ ارکانِ شوریٰ کا جلسہ منعقد کر کے نسبت تقرر مہتمم مستقل و دیگر ضروریات وقتیہ کا فیصلہ کیا جائے جب تک جلسہ میں معاملات مصالح مدرسہ نظر کر کے فیصلہ نہ ہو مناسب معلوم ہوا کہ مولوی طیب صاحب کو جو اس وقت تک نائب مہتمم ہیں فوری طور پر عارضی مہتمم مقرر کر دیا جائے پھر جلسہ شوریٰ جو کچھ باقاعدہ طے کرے اس کا اعلان دوبارہ کر دیا جائے گا۔ مزید احتیاط اس کی بھی ضروری محسوس ہوئی کہ انعقاد جلسہ اور مسئلہ اہتمام طے ہونے تک قائم مقام مہتمم کی امداد و تقویت کیلئے حضرت مولانا حسین احمد صدر مدرس مدرسہ ہٰذا اور حضرت میاں سید اصغر حسین صاحب مدرس مدرسہ ہٰذا اور مولانا مولوی سید مرتضیٰ حسن ناظم تعلیمات مدرسہ کو ان کا مشیر مقرر کیا جائے کہ معمولی کاموں کے علاوہ جو امر اہم پیش آجائے ان تینوں حضرات سے مشورہ کر کے عمل کریں اگر اتفاقاً باہم اختلاف ہو تو سرپرست ایک شق کو ترجیح دے سکے گا۔

اشرف علی رجب ۱۳۴۷ھ

حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہٗ کی تجویز کے مطابق اکابر ثلٰثہ کے رائے اور مشورہ کے ساتھ بحیثیت قائم مقام مہتمم کے آپ نے تقریباً تین ساڑھے تین ماہ کار اہتمام انجام دیا۔ علم و فضل، حلم و تدبر اور اہلیت کار کی بنا پر بہت جلد پورے ملک میں مقبولیت و شہرت حاصل کر لی جس سے دارالعلوم کی عظمت و وقعت میں بھی اضافہ ہوا۔ اور مکمل نیک نامی اور عزت و احترام کے ساتھ ۱۴۰۱ھ تک اس منصب پر فائز رہے۔

خدائے بزرگ و برتر کا قاری صاحب کے ساتھ یہ خاص فضل و احسان رہا کہ ابتداء اہتمام ہی سے انہیں معاملہ فہم، مخلص، خیرخواہ، اور صاحب صلاح و تقویٰ بزرگوں کی رفاقت حاصل رہی جس سے ان کے جوہر کمال کو پروان چڑھنے کا خوب موقع ملا چنانچہ جس وقت پورے طور پر نیابت اہتمام کی ذمہ داری ان کے سپرد ہوئی اسوقت حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی علامہ مسند اہتمام کے صدر نشین تھے۔ حضرت مولانا عثمانی رح کا تدبر اور فہم و بصیرت آج بھی حلقۂ دارالعلوم ضرب المثل ہے۔ چونکہ حضرت مولانا عثمانیؒ کو خانوادہ قاسمی سے بڑا تعلق تھا۔ خاص طور پر حضرت قاری صاحب کو تو وہ ایک بیٹے کی طرح سے مانتے جانتے تھے اور قاری صاحب کی تعلیم تربیت کے بیشتر مراحل انہی کے زیر نگرانی طے پائے تھے۔ اس لئے یہ مربیانہ رفاقت اور مشفقانہ اشتراک عمل

اس ابتدائی دور میں بہت مفید اور کارآمد ثابت ہوا۔ حضرت مولانا عثمانی قدس سرہٗ کے وصال کے بعد ۱۳۶۹ھ سے ۱۳۷۷ھ تک حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی جیسی جامع صفات اور ہمہ گیر اثرات کی مالک شخصیت آپ کی معاون و مددگار رہی۔ حضرت مولانا مدنی قدس سرہٗ کی رحلت کے بعد ۱۳۹۲ھ تک یکے بعد دیگرے حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم بلیاوی۔ اور خاتم المحدثین حضرت مولانا فخر الدین مرادآبادی آپ کے دست راست بنے رہے اور دارالعلوم کا علمی قافلہ اپنی تابندہ روایات کے مطابق منزل کی جانب رواں دواں رہا۔ لیکن آخر میں جبکہ بتقاضائے عمر قویٰ اور اعصاب بڑی حد تک جواب دے گئے تھے اور فکر و عمل میں پہلی جیسی توانائی باقی نہیں رہی تھی۔ اس طبعی ضعف اور فطری اضمحلال کے دور میں آپ کے گرد اتفاقاً ایسے افراد کا حلقہ اکٹھا ہو گیا جنہیں دارالعلوم اور حضرت قاری صاحب قدس سرہٗ کی ذات و خدمات کے مقابلے میں اپنے مقاصد و مصالح زیادہ عزیز تھے جس کے نتیجے میں ایسے حالات و واقعات رونما ہوئے کہ ان سے نہ صرف دارالعلوم کی عظمت و شہرت غبار آلود ہوئی بلکہ خود حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتی و علمی وجاہت اور پچاس ساٹھ سالہ روشن خدمات بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔ جس مجلس شوریٰ کے اقتدار اور بالادستی کو وہ زندگی بھر تسلیم کرتے رہے اور جس کے ایک ایک ارکان کے فضائل و محاسن کی اپنی تازہ ترین طویل نظم "ارمغان دارالعلوم" میں دل کھول کر تعریف و توصیف کی تھی۔ یاروں نے اپنی اغراض پسندی اور مقصد برآری کے پیش نظر حضرت قاری صاحب کو اسی مجلس کے مد مقابل لاکر کھڑا کر دیا۔ حضرت قاری صاحب قدس سرہٗ کی تاریخ زندگی کا یہ ایسا اندوہناک باب ہے جہاں مورخ کا قلم آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حضرت قاری صاحب کی سلامتی مزاج، وسعتِ قلبی، اور صلح جویانہ طبع کے پیش نظر یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اگر انہیں کھلے ماحول میں آزادی کے ساتھ فیصلہ کرنے کا موقع ان کے گرد و پیش کے لوگوں کی طرف سے مل گیا ہوتا تو اس طرح کی تکلیف دہ اور افسوسناک حالات قطعاً پیش نہ آتے یہی وجہ ہے کہ مجلس شوریٰ کے تمام تر ارکان، اساتذۂ دارالعلوم اور ہمدردان جو بھی صحیح صورت حال سے واقف تھے وہ ان معاملات میں قاری صاحب کو معذور ہی سمجھتے رہے اور شروع سے آخر تک ان کی یہ خواہش رہی کہ حضرت قاری صاحب کو اغراض پسندوں کے اس نرغے سے نکال کر انہیں ان کے بلند مرتبے کے مطابق صحیح مقام پر فائز رکھا جائے مگر ساری کوششیں ناکام رہیں۔ اور قضاء و قدر کا فیصلہ نافذ ہو کر رہا۔ ماشاء اللہ کان و مالم یشاء لم یکن

تحصیل علوم باطنی

حضرت قاری صاحب قدس سرہٗ کی ذات والاصفات علوم ظاہر کے ساتھ علوم باطنی

سے آراستہ و پیراستہ تھی۔ ابتداء میں آپ نے حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ سے بیعت کی تھی لیکن ابھی تعلیم و تلقین کا سلسلہ شروع ہی ہوا تھا کہ حضرت شیخ الہند کی وفات کا سانحہ پیش آیا۔ اور یہ سعادت بخش سلسلہ منقطع ہوگیا۔ اسکے بعد اپنے استاد حدیث حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے دامن تربیت سے وابستہ ہو گئے۔ اور ایک عرصہ تک انہیں کی رہنمائی میں سلوک کے منازل طے کرتے رہے مگر جب ۱۳۴۶ھ میں اہتمام اور حضرت محدث کشمیریؒ اور ان کے رفقاء کے درمیان اختلافات نے شدت اختیار کرلی۔ اور حضرت شاہ صاحب مع اپنے رفقاء حضرت مولانا عزیز الرحمٰن عثمانی اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کے دارالعلوم سے علٰحدہ ہو گئے تو انکے ساتھ اصلاح و تربیت کا سلسلہ قائم نہ رہا۔ اس لئے اپنے مربی خاص حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی قدس سرہٗ کے ایماء پر ـــــ جماعت دیوبند کے عظیم المرتبت شیخ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ سے بیعت ہوئے۔ چونکہ صلاحیت و استعداد پہلے ہی سے موجود تھی مزید براں شیخ کامل کی صحبت و رہنمائی بھی حاصل ہوگئی۔ اور نہایت برق رفتاری سے سلوک و تصوف کے جملہ مراحل طے کرکے خلافت و اجازت سے مشرف ہوئے۔ تحصیل خلافت کے بعد بزرگوں کے طریقہ کے مطابق بیعت و ارشاد کا سلسلہ شروع کیا۔ اور جو کوئی آپ سے منسلک ہونا چاہتا اسے سلسلے میں داخل فرمالیا کرتے تھے۔ اسی راہ سے بھی حضرت قاری صاحب کی خدمت کا دائرہ وسیع ہے اور ملک و بیرون ملک کے ہزاروں تشنگان معرفت آپکے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے۔

تصنیف و تالیف مضمون نگاری اور انشاء پردازی کا سلسلہ آپ نے زمانہ طالب علمی ہی سے شروع کردیا تھا۔ اس وقت کے رسالہ "القاسم" وغیرہ میں آپ کے علمی و تحقیقی مقالات چھپتے رہتے تھے اور علمی حلقوں میں وقعت و پسندیدگی سے پڑھے جاتے تھے۔

قلمی افادہ کا یہ سلسلہ وفات سے پانچ چھ سال پہلے تک جاری رہا اور مختلف دینی، علمی اور تاریخی موضوعات پر تقریباً سو سے زائد مطبوعہ و غیر مطبوعہ رسالے اور کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں جن میں سے بعض یہ ہیں۔

(۱) التشبہ فی الاسلام (۲) سائنس اور اسلام (۳) تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام (۴) اصول دعوت اسلام (۵) اسلام اور فرقہ واریت (۶) اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام (۷) اسلامی مساوات (۸) الشرفی القضاء والقدر (۹) دین و سیاست (۱۰) مسئلہ اردو زبان ہندوستان میں (۱۱) اسباب عروج و زوال اقوام (۱۲) الاجتہاد والتقلید (۱۳) تفسیر سورۂ فیل (۱۴) فطری حکومت (۱۵) شان رسالت (۱۶) فلسفۂ نماز (۱۷) شرعی پردہ (۱۸) ڈاڑھی کی شرعی حیثیت (۱۹) علم غیب

(۲۰) خاتم النبیین (۲۱) نظریہ دو قرنوں پر ایک نظر (۲۲) فلسفۂ طہارت (۲۳) آفتاب رسالت (۲۴) حدیث رسول کا قرآنی معیار (۲۵) انسانیت کا امتیاز (۲۶) اسلام کا اخلاقی نظام (۲۷) مشاہیر امت (۲۸) شہید کربلا اور یزید (۲۹) حاشیہ عقیدۃ الطحاوی وغیرہ

فن خطابت خطابت و تقریر میں اس وقت قاری صاحب کو خداداد قدرت اور ملکہ حاصل تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خطابت و تقریر میں اس وقت علماء کی صف میں آپ کا کوئی ثانی نہیں تھا جس وقت آپ تقریر کیلئے کھڑے ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ علوم و معارف اور اسرار و حکم کا ایک چشمۂ ذخار ہے جو پوری توانائی کے ساتھ ابل رہا ہے۔ پیرایۂ بیان اتنا مؤثر اور دلپذیر ہوتا تھا کہ سامعین دو دو تین تین گھنٹے سراپا گوش بنے بیٹھے رہتے تھے اور کوئی ذرا بھی اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا تھا۔ تقریر کی یہ اثر اندازی علماء و طلباء اور مذہبی حلقہ تک ہی محدود نہ تھی بلکہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی آپ کے حکیمانہ اسلوب بیان سے بہت متاثر تھا، بالخصوص مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ دہلی وغیرہ جامعات میں آپ کی تقریریں بہت پسند کی جاتی تھیں۔

شعر و شاعری بلند پایہ مصنف اور خطیب ہونے کے ساتھ آپ قادرالکلام شاعر بھی تھے اور جب کبھی کہنے پر آتے تو چار چار پانچ پانچ سو اشعار پر مشتمل نظمیں کہہ ڈالتے تھے۔ جس پر آپ کے شعری مجموعے (۱) عرفان عارف، آنکھ کی کہانی اور ارمغان دارالعلوم شاہد ہیں۔ (۱) جنون شباب (۲)

تبلیغی و دعوتی اسفار دارالعلوم کے اہتمام پر مسند نشیں اکابر میں تنہا قاری صاحب کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ آپ کے دعوتی اور تبلیغی اسفار صرف ہندوستان کی حدود تک محدود نہیں رہے بلکہ بنگلہ دیش، پاکستان، افغانستان، برما، جنوبی افریقہ، نیروبی، کینیا، روڈیشیا، ری یونین، مڈغاسکر، ایتھوپیا، مصر، سعودیہ عربیہ، انگلینڈ، فرانس، جرمنی، امریکہ وغیرہ دور دراز ممالک تک ان علمی و عرفانی اسفار کا دائرہ وسیع ہے۔ جس سے ایک طرف خود قاری صاحب کو عالمگیر شہرت و مقبولیت حاصل ہوتی اور آپ کا دعوتی و روحانی فیض عام ہوا تو دوسری طرف دارالعلوم دیوبند کا اور جماعت دیوبند کا عالمی پیمانہ پر تعارف ہوا اور حلقہ اثر میں توسیع ہوتی۔

زندگی کے آخری ایام ادھر دو ایک سال سے ضعف پیری کے ساتھ امراض کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا جس میں چند ماہ سے مزید شدت پیدا ہوگئی تھی۔ طول علالت کی بناء پر کبھی

تشویشناک حد تک ضعف پہونچ جاتا تھا اور کبھی دوا علاج سے اطمینان بخش افاقہ ہو جاتا تھا۔ مرض و صحت کا یہ سلسلہ یونہی جاری تھا کہ وفات سے تقریباً ایک ماہ پہلے مرض کا شدید حملہ ہوا جس سے غذا بالکل ختم ہو گئی اور ضعف و نقاہت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ بغیر سہارے چارپائی سے اٹھ بھی نہیں پاتے تھے۔ دوا علاج سے اس کیفیت میں کچھ کمی پیدا ہوئی۔ تو آپ کو دہلی پنتھ اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ جہاں ایک ہفتہ سے کچھ زائد دنوں تک زیر علاج رہے۔ اور بظاہر مرض ختم ہو گیا تھوڑی تھوڑی غذا لینے لگے۔ ضعف و نقاہت میں بھی کافی حد تک کمی پیدا ہو گئی۔ یہاں تک کہ بغیر کسی سہارے کے دو چار قدم چلنے لگے تھے۔ جس روز سانحۂ وفات پیش آیا اس دن بھی طبیعت اچھی خاصی تھی باہر بیٹھک میں لیٹے ہوئے حکیم محمود دیوبندی سے مرض اور مزاج کی کیفیت دیر تک بیان کرتے رہے، صاحبزادہ محترم مولانا محمد سالم صاحب بھی پاس بیٹھے یہ بات سن رہے تھے انہیں کیا خبر تھی کہ ریاض رسول کا یہ چہکتا ہوا بلبل ابھی چند سکنڈ میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خاموش ہو جانے والا ہے۔ حکیم محمود صاحب سے گفتگو کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ اچانک آنکھیں بند ہو گئیں حکیم صاحب سمجھا کہ طول کلام کی بنا پر تکان ہو گئی ہے اس لئے آنکھیں بند کر لی ہیں مگر مولانا محمد سالم صاحب نے چہرے کو بغور دیکھا تو انھیں تشویش ہوئی اور حکیم صاحب کو متوجہ کیا کہ نبض دیکھئے علامت کچھ اچھی نہیں نظر آتی۔ چنانچہ حکیم نے جب نبض پر ہاتھ رکھا تو معلوم ہوا کہ نبض ڈوب چکی ہے اور علوم قاسمی کا امین، اکابر کا اداشناس، مسلک دیوبند کا شارح اور علم و دین کا سچا خادم اپنے مالک کے حضور پہونچ چکا ہے۔

وفات کی اطلاع ملتے ہی حضرت مولانا معراج الحق صاحب صدر مدرس دارالعلوم اور حضرت مولانا محمد عثمان صاحب نائب مہتمم فوراً مرحوم و مغفور کے دولت کدہ پر آخری زیارت کیلئے پہنچے اور زیارت و تعزیت کے بعد مولانا محمد سالم صاحب سے خواہش ظاہر کی، کہ نماز جنازہ احاطہ دارالعلوم میں ادا کی جائے۔ جسے موصوف نے قبول کر لیا۔ چنانچہ اسی وقت دارالعلوم کی مسجد کے لاؤڈ سپیکر سے اعلان کر دیا گیا کہ نماز جنازہ دارالعلوم میں ادا کی جائیگی۔

حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مہتمم دارالعلوم چونکہ اس وقت اپنے بجنور تھے اس لئے انہیں عظیم سانحہ کی اطلاع پہونچانے کیلئے بجنور ایک آدمی بھیجدیا گیا۔ اطلاع ملتے ہی وہ اپنے برادر نسبتی مولانا شفیق الرحمن صاحب کو لیکر بجنور سے روانہ ہوئے اور بعد مغرب دیوبند پہونچ گئے۔ حضرت مولانا قاضی زین العابدین صاحب میرٹھی رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند بھی اپنے صاحبزادے کے ہمراہ مغرب کے لگ بھگ دیوبند آگئے۔

حضرت مولانا سید اسعد مدنی مدظلہٗ اس وقت بمبئی تھے انہیں وہیں بذریعہ ریڈیو اس حادثۂ جانکاہ کی خبر ملی وہ اپنے سارے پروگرام منسوخ کرکے بذریعہ ہوائی جہاز وہاں سے دہلی کیلئے روانہ ہوگئے، اور دہلی سے بذریعہ کار نماز عشاء کے قریب دیوبند پہنچ گئے۔ اتفاقاً موصوف اس وقت شدید نزلہ و بخار میں مبتلا تھے لیکن تجہیز و تکفین میں شرکت کی غرض سے تکلیف کے باوجود مسلسل سفر کی صعوبت برداشت کرکے دیوبند پہنچے۔

اعلان کے مطابق بعد نماز عشاء جنازہ احاطۂ دارالعلوم میں لایا گیا اور دارالعلوم کے اساتذہ، طلبہ، ذمہ داران و کارکنان اور دیوبند و قرب و جوار کے تقریباً ۶۰ ہزار کے عظیم اجتماع نے صاحبزادہ مولانا محمد سالم صاحب کی امامت میں نماز جنازہ ادا کی اور تقریباً رات کے ساڑھے دس بجے علوم و معارف اور اسرار و حکم کے اس خزانہ کو مقبرۂ قاسمی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مدفون کر دیا۔

از حکیم عبدالقوی دریابادی

حکیم الاسلام کا سانحہ وفات

خانوادہ قاسمی کے چشم و چراغ، دارالعلوم دیوبند کے اوج ترقی پر پہونچانے والے اور تقریباً نصف صدی تک اس کی انتظامی خدمات انجام دینے والے جامع شریعت و طریقت فاضل اجل مولانا قاری محمد طیب قاسمی ایک عرصہ کی علالت کے بعد ۸۸ سال کی عمر میں اس جہان فانی سے اپنے وطن دیوبند میں رحلت فرما گئے انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ادھر ہفتوں سے نہیں مہینوں سے گوناگوں شدید امراض کے باعث انکی حالت انتہائی غیر اطمینان بخش نظر آرہی تھی۔ مولانا نے اصلی شہرت و ناموری برصغیر ہی میں نہیں عالم اسلام میں اور چار براعظموں ایشا، افریقہ، یورپ اور امریکہ کے ان ممالک میں جہاں مسلمان آباد اور دین کی دولت سے بہرہ ور اور بزرگان دین سے عقیدت رکھتے ہیں۔ جو حاصل کی تھی وہ ایشیا کی سب سے بڑے اور قدیم دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم کی حیثیت سے حاصل کی تھی۔

شروع جوانی میں وہ اپنے مرحوم والد مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم کے نائب کی حیثیت سے کام کرنے لگے تھے ان کی وفات پر وہ باتفاق رائے اور دختلاف احدے سند اہتمام پر رونق افروز ہوئے تقریباً چالیس سال اس منصب جلیل پر رہ کر دارالعلوم کو باعتبار کیفیت و کمیت ترقی کی انتہائی سربلندیوں پہ پہونچا دیا اس کی شاندار عمارتوں کی تعمیر کرائی اس کے معیار تعلیم کو بلند کیا اس کے لئے سرمایہ فراہم کیا انھوں نے وقت کی وقتی اور ہنگامہ خیز سیاسی تحریکات سے کنارہ کش رہ کر سارا وقت دارالعلوم کی تعمیری و تعلیمی خدمات میں صرف کیا اور ۱۹۸۰ء میں انھیں کے زیر اہتمام اس دارالعلوم کا جو جشن صد سالہ تین روز منعقد ہوا اسکی یاد دیکھنے والوں میں ابر تک تازہ ہے۔

یہ اور بات ہے کہ ملت اور اس ادارہ کی بدقسمتی سے اس جشن کے معاً بعد اختلاف کی باد سموم چلنے لگی اور اس سلسلہ کی افسوسناک کشمکش جس کا ذکر ہرگز خوش آیند نہیں کہ نتیجہ میں دارالعلوم کا نظام و اہتمام دارالعلوم کیلئے

اپنی زندگی کو قربان کر دینے کے ہاتھ میں نہ رہ سکا۔

مولانا محمد طیب صاحب کو ان کے اہل نظر معاصرین نے "حکیم الاسلام" کا لقب اسماً ہرگز نہیں دیا تھا بلکہ ان کی جامع شریعت طریقت شخصیت کی پوری جانچ پرتال کے بعد دیا تھا زندگی بھر وہ اپنے عمل و کردار کو اپنی ایمان پرور تقریروں اور مواعظ اور اپنی گرانقدر تصانیف و رسائل کے ذریعے اور اپنے حلقہ سلسلہ مریدان کی اصلاح و تربیت باطن کے ذریعے اس لقب کے مصداق ثابت ہوتے رہے۔

وہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت اور ان کے خلیفہ مجاز کی حیثیت رکھتے تھے انکے وعظ بڑے مؤثر اور ایمان پرور ہوتے تھے لہجہ میں مناظرانہ خشونت کے بجائے انتہائی شگفتگی ہوتی تھی۔ احقر نے ان کی صرف ایک تقریر درگاہ حضرت نظام الدین کے قرب میں خواجہ حسن ثانی نظامی کے طلب کردہ سیمینار میں شریعت و طریقت کے اہم موضوع پر سنی تھی تقریر ڈیڑھ دو گھنٹہ جاری رہی لیکن وہ اس درجہ مربوط دلچسپ اور شگفتہ تھی کہ سننے والے جن میں تصوف میں غلو رکھنے والے اور تصوف کے نام سے بیزار دونوں قسم کے اہل علم خاصی تعداد میں موجود تھے پوری طرح محظوظ ہوتے رہے تھے۔ مقرر نے اپنی اس تقریر میں ان دونوں میں تضاد اور مخالفت کے بجائے ربط و مناسبت کو اس خوش اسلوبی سے واضح و ثابت کیا تھا کہ کسی گروہ کو اعتراض کا کوئی موقع نہ مل سکا۔

جس طرح وہ دارالعلوم کے انتظامی حلیفہ اور عمارات وغیرہ کی توسیع و تعمیر جدید میں اپنے پدر بزرگوار مولانا محمد احمد کے صحیح جانشین تھے اسی طرح علوم و معارف دین، سلوک و طریقت، اور کلاسیات میں اپنے جد امجد مولانا محمد قاسمؒ کی جانشینی کا پورا حق زندگی بھر ادا کرتے رہے اور چونکہ ان کا طرز تحریر سلیس ہونے کے ساتھ بڑا ہی دلنشین تھا اس لئے معمولی استعداد والے اور جدید تعلیم یافتہ لوگ بھی انکے اشحات قلم سے پورا فیض حاصل کر لیتے تھے۔

احقر نے سب سے پہلے ان کی اپنے موضوع پر نادر اور شاید پہلی تصنیف "التشبہ فی الاسلام" کا مطالعہ اپنے زمانہ طالب علمی میں عم مرحوم مولانا عبدالماجد دریابادی کے حسب ہدایت کیا تھا اور اس سے بڑا نفع حاصل کیا تھا۔ انکی تصانیف کی جن میں کی تقاریر کے مجموعے اور چھوٹے رسائل بھی شامل ہیں کہ میزان پچاس ساٹھ سے ہرگز کم نہ ہوگی جن میں تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام خاص طور سے قابل ذکر ہے ان کی دوسری کتابوں میں جن میں ہر ایک قابل مطالعہ و لائق استفادہ ہے چند کے نام درج ذیل ہیں جن سے اندازہ

ے حضرت قاری صاحب کی تصانیف کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو ہے

ہو سکتا ہے کہ مرحوم کا علم کتنا متنوع تھا اور اس کے ذریعہ موجودہ نسل اور آنے والی نسلوں کو جو علم دین کا ذوق رکھتی ہے اور اس کی تحصیل میں معروف ہیں کتنے علمی فوائد و معلومات حاصل ہو کر رہیں گے

(۱) سائنس اور اسلام (۲) فطری حکومت (۳) مشاہیر امت (۴) سیرت خاتم الانبیاء (۵) انسانیت کا امتیاز (۶) علم غیب (۷) اسلام اور موجودہ تہذیب (۸) حجیت حدیث (۹) داڑھی کی شرعی حیثیت (۱۰) اصل کتاب و سنت کی روشنی میں (۱۱) تقاریر مولانا محمد طیب (۱۲) سنت رسول کا معیار۔

قاری صاحب کا ایک طویل مقالہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی رفیقۂ حیات کی وفات پر مولانا دریابادی کی حصول تسلی کے لئے "موت و مابعد الموت" کے عنوان سے صدق جدید کے کئی نمبروں میں نکلتا رہا اور غالباً یہ بھی کسی اور نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔

آزادی ملک کے بعد اسلامی قانون شریعت میں ترمیم و تنسیخ کا جو فتنہ بعض غیر مسلموں اور ان سے بھی بڑھ کر تجدد کے مارے نام نہاد روشن خیال مسلمانوں کی طرف سے اٹھا اس کے مقابلہ و سرکوبی کے لئے آل انڈیا مسلم پرسنل لار بورڈ کا قیام بمبئی کے ایک اجلاس میں جس میں ہر طبقۂ خیال اور نقطۂ فکر کے مسلمان شریک تھے عمل میں آیا تھا اس کی صدارت انھیں حکیم الاسلام کے سپرد کی گئی تھی اور اس عہدہ پر وہ غالباً تادم وفات فائز رہے اس اجتماع میں انھوں نے جو خطبۂ صدارت پڑھا تھا وہ بڑا ہی مدلل اور دلنشیں تھا مخالفین نے قوانین اسلام پر غیروں سے مرعوب و متاثر ہو کر جو اعتراضات کئے تھے اس میں بلا کسی تلخی کے ان کی دھجیاں بکھیر کر رکھدی تھیں اس سلسلہ کی ان کی دیگر تقاریر بھی سننے والوں کو ہمیشہ یاد رہیں گی۔

مولانا زندگی کے ہر دور میں حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت کے لحاظ سے بھی ممتاز رہے موصوف بڑے خوش الحان قاری تھے ان کی اقتداء میں جہری نماز میں سامعین کو غیر معمولی لذت و حلاوت محسوس ہوتی تھی بڑھاپے میں ان کی صورت بڑی پر نور نظر آتی تھی ساتھ ہی حسن اخلاق خصوصاً حلم و انکسار کے اعتبار سے بھی یگانۂ روزگار تھے۔

آخری عمر میں دارالعلوم کے اختلافات کے سلسلے میں انھیں بہت کچھ سننا پڑا لیکن انھوں نے تلخ سے تلخ بات کا جواب درشتی و تلخی سے کبھی نہیں دیا اور انتہائی اشتعال دلانے والے مواقع پر انتہائی صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا۔ جس کا اعتراف انکی وفات کے بعد برملا کیا جا رہا ہے اور اسے مرحوم کے اوصاف امتیازی میں شمار کیا جا رہا ہے۔

یہ لکھنا تو رہ ہی گیا کہ مرحوم جس طرح وہ اردو کے ایک بہترین مصنف نثر نگار کی حیثیت رکھتے تھے اور علمی و دینی موضوعوں پر داد تحقیق دیتے رہتے تھے وہیں آپ ایک بلند پایہ و قادر الکلام شاعر بھی تھے! انھوں نے زمانہ قیام علیگڈھ میں جہاں وہ اپنی آنکھ کے آپریشن کے سلسلہ میں داخل اسپتال رہے تھے" ایک طویل نظم " آنکھ " سے عنوان سے کہی تھی جو کتابی شکل میں شائع ہو کر اہل نظر میں نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی دوسری طویل نظم جشن دیوبند کے سلسلے میں ایک چھوڑ تین زبانوں عربی فارسی اور اردو میں انکے قلم سے نکلی تھی یہ بھی بہت خوب تھی اور اس میں کمال یہ تھا کہ انھوں نے نہ صرف اکابر دیوبند کے اسمائے گرامی بلکہ مجلس شوریٰ کے نام ارکان کے نام بھی بڑی خوبی سے نظم کئے تھے۔

مولانا دریابادیؒ سے ان کے روابط شروع سے تھے یہ مولانا سے ہمیشہ نیازمندانہ طور پر ملتے تھے اور مولانا بھی ان کا خاص خیال رکھتے تھے اور ان کے حسن اخلاق اور علم و فضل سے بہت متأثر تھے انکی فاضلانہ تصانیف پر ان کے قلم سے بڑے اچھے تبصرے سچ و صدق میں نکلتے رہے تھے مولانا دریابادی کا مقالہ " تمدن اسلام " جب وہ کتابی شکل میں نکلا پر " مقدمہ مولانا طیب صاحب کے قلم سے بہت خوب نکلا تھا مولانا دریابادی کے زمانہ علالت (فالج) میں قاری صاحب انکی عیادت کے لئے چند گھنٹوں کیلئے ایکبار دریاباد تشریف لائے تھے اور مولانا کی وفات سے صرف ایک شب قبل جبکہ مولانا پر مکمل غفلت طاری تھی مولانا طیب صاحب کسی وعظ کے سلسلے میں لکھنؤ تشریف لائے ہوئے تھے جیوں ہی انھیں مولانا کی شدید علالت کا علم ہوا وہ فوراً تشریف لائے مولانا دریابادی کو اس وقت بالکل غافل تھے اگر وہ ہوش میں ہوتے تو یقیناً انھیں مولانا طیب کی اس سے انتہائی تشفی حاصل ہوئی مولانا دیر تک غافل بلکہ مریض کے بائیں پر کھڑے دعائیں پڑھتے رہے مولانا دریابادی کی وفات کی خبر پاکر انھوں نے دیوبند سے تعزیتی تار اور بڑا ہی مفصل تعزیتی خط ارسال فرمایا تھا جس سے ان کے سوگوار عزا کو بڑی تسلی حاصل ہوئی تھی۔

مولانا دریابادیؒ کی وفات کے بعد وہ ان کے اخبار " صدق جدید " اور ساتھ ہی احقر مدیر صدق جدید کی انتہائی قدر افزائی کرتے رہے۔ صدق جدید کے وہ تادم آخر خریدار رہے اور اس کے بعض نوٹ اور تبصرے دارالعلوم کی روئیدادوں اور دوسرے رسائل میں نقل کرکے انکی حوصلہ افزائی فرماتے رہتے تھے۔

گذشتہ سال ملک کے ایک نامور عالم دین اور شیخ طریقت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کے حادثہ وفات سے ملت کو صدمہ عظیم پہونچا تھا اس سال اس قسم کا دوسرا بڑا اور بظاہر ناقابل تلافی صدمہ مولانا قاری محمد طیب صاحب کی وفات سے ملت اسلامیہ کو پہونچ رہا ہے۔

آہ! قاری محمد طیبؒ

افسوس کہ قاری محمد طیب صاحب ۱۹ جولائی کو اپنے اللہ سے جا ملے، قاری صاحب مولانا محمد قاسم نانوتوی کے خاندان کے چشم و چراغ تھے، انکی روایات کے وارث، ان کے علم کے حامل اور گوناگوں خوبیوں کے مالک تھے، تقریر و تحریر و تدریس کے ذریعہ دین و مذہب کی گراں قدر خدمات انجام دی، جس کو تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی، سنجیدگی و متانت تحمل و برداشت، رواداری، وضع داری، اپنی مثال آپ تھے، وہ عرصہ تک ایشیا کی سب سے بڑی دینی درسگاہ دار العلوم دیوبند کے مہتمم رہے، بلکہ اس کی علامت بنکر رہے، اب دیوبند کو ایسی شخصیت کے لئے ایک مدت تک انتظار کرنا پڑے گا، کئی کتابوں کے مصنف تھے، نکتہ رسی دقیقہ سنجی ان کے رگ و ریشہ میں سرایت تھی تقریر میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے، ہندوستان کے باہر بھی مختلف ملکوں کے دعوتی و تبلیغی سفر کرتے رہے، حضرت مولانا تھانوی کے خلیفہ تھے، اور پیری و مریدی کا سلسلہ تھا۔ ہزار ہزار ان کے شاگرد ہیں جو اپنی جگہ دین و مذہب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اللہ نے ان کے لئے دین و مذہب کی خدمت کے بڑے مواقع فراہم کئے تھے اللہ سے دعا ہے کہ ان کی خدمات قبول فرمائے، اور ان کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور پسماندگان کو بھی صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

حضرت حکیم الاسلام سے ۱۹۷۱ء میں

واحد فیاضی جلالپوری اور شفیق احمد قاسمی کا

ایک انٹرویو

یہ سرزمین دیوبند ہے — تھوڑی دیر آپ ایٹمی دنیا سے باہر آکر دیکھیں، یہ علم و معرفت سے بھرا شہر، چھوٹی چھوٹی تنگ و پختہ گلیاں، لکھوری اینٹ کے بنے ہوئے قدیم طرز کے مکانات سمنٹ کی پھیلی ہوئی سڑکیں۔ جنوب میں ریلوے لائن و شوگر مل، شمال و مشرق میں دلی جانے والی گران ٹرنیک روڈ، مغرب میں درختوں سے بھری ہوئی وسیع عیدگاہ۔ اس کے متصل لہلہاتے ہوئے پھولوں سے بھرا ہوا پارک عیدگاہ سے ملا ہوا حضرت خاتم المحدثین علامہ انور شاہ کشمیری کا مزار پر انوار، شہر کے شمال مغرب میں ہزاروں نونہالوں کو تعلیم و تربیت دینے والا دارالعلوم، مزارِ قاسمی پر تقدس کے برستے ہوئے انوار و برکات آسمان سے باتیں کرتے ہوئے مسجد کے منارے اور شیخ لطف اللہ کا فلک بوس شکستہ دیوان عہد شاہجہانی کی یاد دلا رہا ہے۔

مہمانخانہ دارالعلوم سے متصل دیوان گیٹ کے بالکل سامنے حضرت مہتمم صاحب کا دولت کدہ ہے، اندر داخل ہوتے ہی ایک وسیع صحن ہمارا استقبال کرتا ہے۔ لوگ برآمدے میں حسب مراتب بنچوں اور کرسیوں پر بیٹھے طلوع مہر اہتمام کا انتظار کر رہے ہیں۔ یکایک وہ تشریف لائے اور ایک آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔

۷۰ سال عمر، والہانہ قد، گورا ہتابی رنگ، بیضوی چہرہ، ستواں ناک، اور چوڑی پیشانی، رفتار و گفتار میں وقار کے ساتھ علم و فضل کا مظہر اتم — یہ ہیں حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب کے خدّ و خال جو پہلی ہی نظر میں دیکھنے والوں کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتے۔

(۱) حضرت والا! آپ مصنفین اسلام میں سب سے زیادہ کس مصنف سے متاثر ہوئے اور کیوں؟

— سکوت توڑتے ہوئے سوال کیا گیا۔

مسکراتے ہوئے — اس کا جواب تو وہی شخص دے سکتا ہے جس کا مطالعہ وسیع ہو، مجھے تو مطالعہ کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی — اتنا کہہ کر بالکل چپ ہو گئے لیکن فوراً سکوت توڑتے ہوئے فرمایا کہ

ہاں! اس سلسلہ میں ایک مقولہ سن رکھا ہے اسے عرض کردیتا ہوں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دینی اعتبار سے ہمارے اکابر کن مصنفین کو زیادہ پسند کرتے تھے۔

استاد محترم حضرت گنگوہیؒ فرمایا کرتے تھے کہ امت میں چار مصنفین ایسے ہیں جن کی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے اگر آدمی غبی بھی ہو تب بھی ذہین ہو جائے۔

امام غزالیؒ۔ محی الدین ابن عربیؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ـــ حضرت شیخ الہند نے فرمایا کہ ان چار کے بعد ایک کا اضافہ میں اور کرتا ہوں، وہ ہیں میرے استاد محترم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تسلسل جاری رکھتے ہوئے فرمایا ـــ اس وجہ سے کہ ان حضرات کے یہاں اصولی کلام ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب آدمی کو اصول معلوم ہو جائے گا تو اس سے ہزاروں جزئیات خود بخود نکال لے گا۔

یہ چاروں مصنفین حقائق کے اعتبار سے گفتگو کرتے ہیں۔ حضرت نانوتویؒ کا بھی یہی طرز کلام تھا۔ اگر کسی نے سوال کیا تو اس کا جواب اس انداز سے اصول میں قائم کر دیتے کہ بہت سے مسائل کا جواب نکل آتا۔ اور فنون آلیہ مثلاً ادبیات تاریخ وغیرہ کی طرف ان حضرات کی زیادہ توجہ نہ تھی۔

فلاسفہ جو اصول نقل کرتے ہیں ان کا تعلق زیادہ تر تکوینیات سے ہوتا ہے۔ اور ان حضرات کا موضوع شرعیات ہیں۔ یہ ان اصول سے شرعیات کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اگر تکوینیات کے اصول معلوم ہوں تو ان سے تکوینی مسائل حل ہو جاتے ہیں۔

جب ہمارے اکابر ان مصنفین سے متاثر تھے تو ہم بھی تقلیداً متاثر ہی ہیں۔

آج دنیا بھر میں جو انتشار اور بدامنی پھیلی ہوئی ہے اسکو کس طرح دور کیا جا سکتا ہے حضرت مہتمم صاحب سے ایک اور سوال کیا گیا۔

فرمایا ـــ اصول کی پابندی سے ـــ اور ایک دم سے خاموش ہو گئے پھر قدرے توقف کے بعد اپنے مخصوص انداز میں کہنا شروع کیا ـــ کوئی بھی اصول بنا لیا جائے اسے بلا رو رعایت سب پر لاگو کیا جائے۔ امن قائم ہو جائے گا۔ اور اگر رو رعایت برتی گئی تو خلفشار کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اس لئے اصول کا نفاذ سب پر یکساں ہونا لازمی ہے۔

اسلام نے تمدن کے بھی اصول بنائے۔ سیاست اور معاشیات کے بھی اب دوسرے لوگ تو اسے اپنا رہے ہیں۔ اور ہم ہیں کہ اس سے دور بھاگتے جا رہے ہیں۔

۔ انگریزوں کے یہاں ہر چیز کا اصول ہے۔ اور وہ اس اصول کی پابندی کرتے ہیں ان کے یہاں کھیل کے اصول ہیں۔ کہ فلاں وقت سے فلاں وقت کھیلیں گے کھانے کا اصول ہے کہ اتنے بجکر اتنے منٹ پر کھائیں گے۔ انھوں نے اگر وقت مقرر کر رکھا ہے کہ صبح کی چائے ۸ بجکر ۵ منٹ پر پئیں گے تو وہ ٹھیک اسی وقت پر پئیں گے۔ کیا مجال کہ فرق پڑ جائے۔

انھوں نے کھانے پینے کے اعتبار سے اپنے اوقات کو منضبط کر رکھا ہے اور اسلام نے عبادت کے اعتبار سے انضباط اوقات کی تعلیم دی ہے۔

دیکھئے! اصول یہاں بھی ہے اور اصول وہاں بھی۔ فرق اتنا ہے کہ یہاں خدا پرستی کے اعتبار سے ہے اور وہاں دنیا پرستی کے اعتبار سے۔ وہ اپنے اصول کی پابندی کرتے ہیں اس پر عمل کرتے ہیں ہم نہیں کرتے۔

"پہلو بدلتے ہوئے فرمایا" تو اصول کی پابندی اصل چیز ہے۔ جہاں اصول کی پابندی ہو گی وہاں لوگ مطمئن رہیں گے اور امن قائم رہے گا۔

۔ اچھا حضرت! مسلمانوں کے اس زوال کے اسباب کیا کیا ہوئے؟ بطور وضاحت ایک اور سوال کیا گیا ــــ مہتمم صاحب نے اس سوال پر ایک سرد آہ کھینچی اور کہا ــــ ہم نے مدافعت تو کی لیکن کسی چیز میں اقدام نہیں کیا۔

"لہجہ بدلتے ہوئے فرمایا" بات دراصل یہ ہے کہ کوئی قوم مدافعت سے زندہ نہیں رہ سکتی مدافعت کرتے کرتے وہ پیچھے ہٹتی چلی جائے گی۔ اور ایک ایک کر کے اس کی سب ریاستیں چھن جائیں گی۔

اقوام ہمیشہ اقدام ہی سے آگے بڑھتے ہیں۔ ایک سرمایہ دار اگر اپنے ایک لاکھ روپیہ کو دس لاکھ بنانے کی کوشش نہیں کرے گا تو پھر ایک دن ایسا آئے گا کہ گھٹتے گھٹتے وہ مفلس و قلاش بن جائے گا۔ اس لئے سرمایہ کو بڑھانے کی فکر میں لگے رہنا چاہیئے ورنہ اصل سرمایہ بھی جاتا رہے گا۔

حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص عمل پر اقدام کرے اس کو آگے نہیں بڑھائے گا تو جتنے پر وہ قانع ہے وہ بھی باقی نہیں رہے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جیسا عمل میں ہے ویسے ہی سیاست میں بھی۔

انگریزوں کی پالیسی ہے کہ اقدامات کرتے رہو سیاست باقی رہے گی انھوں نے ہندوستان کو فتح کر کے اس پر قناعت نہیں کی، برما کو ختم کیا۔ افغانستان پر بھی نظریں اٹھائیں، ترکوں کی خلافت تباہ کی، شریف مکہ

کو سمجھایا کہ خلافت کا اصل حق تمہارا ہے۔ اس لئے تم ترکوں سے بغاوت کردو۔ ہم فیڈریشن قائم کردیں گے اور گنیوں کے صندوق تمہارے پاس بھیجیں گے۔ اس نے اپنی سیاست اور تدبیر سے شریف مکہ کو جب سبز باغ دکھائے۔ تو شریف مکہ بھی لے میں آگیا اور ترکوں سے بغاوت کردی۔ ترک ہے۔ خلافت ٹوٹی۔ نہ نکلا۔ مصر علیحدہ ہوا، شام اور عراق نے بھی اپنی راہ الگ بنائی۔ غرض کہ بندر بانٹ کے اعتبار سے سبھوں نے اپنے اپنے رنگ کی الگ الگ ریاستیں بنالیں۔

جب شریف مکہ نے بغاوت کردی تو انگریزوں سے کہا کہ اب اپنا وعدہ پورا کرو تو انھوں نے اپنا وعدہ اس طرح پورا کیا کہ گنیوں کے نام سے صندوق بھیجا ان کو کھولا گیا تو اس میں گنیوں کے بجائے پیتل کے سکے نکلے۔ فیڈریشن یہ ہوا کہ اسرائیل کو لاکر ان پر مسلط کردیا ــــ ظاہر کے اعتبار سے کتنا خوبصورت عنوان تھا کہ خلافت تمہارا حق ہے تم ان سے بغاوت کردو، ہم تمہاری امداد کریں گے لیکن اس کے نتائج کتنے تلخ نکلے۔

تو توں کا سرچشمہ دراصل سیاسی لائن ہے۔ وہ مذہب و تمدن پر بھی اثر انداز ہوتی ہے ــــ مسلمانوں کو ان کی چالیں سمجھنا چاہیئے۔ اور تدبیر کے ساتھ اپنے مشکلات کی رسی کو کھولنا چاہیئے ورنہ محض کیو جبر سے جال کی گرہیں اور مضبوط ہوتی چلی جائیں گی۔

اختلاف تو انگریز نے اتنا پھیلا دیا کہ اتحاد مشکل ہوگیا۔ عرب بھی نسل کے اعتبار سے عرب ہی ہیں مگر انگریز نے انھیں دل و دماغ کے اعتبار سے فرنگی بنا رکھا ہے۔

شام میں انقلاب، عراق میں انقلاب، مصر میں انقلاب، یہ دنیا بھر کے انقلابات آخر انھیں کی تو چالوں کا نتیجہ ہیں۔

" منہ میں پان رکھتے ہوئے فرمایا" ــــ ویسے ..... مسلمان اب ان چالوں کو سمجھ گئے ہیں مگر کئی صدی کے بعد سمجھے۔ پھر بھی یہ ایک نیک فال ہے اگر پوری طرح ان کی چالوں کو سمجھ جائیں گے تو ممکن ہے کہ ان کے چالوں سے نکل آئیں اور سیاسی و معاشی اعتبار سے اپنا کوئی مقام پیدا کرلیں۔

ہر قوم کا ایک مزاج ہوتا ہے مسلمان اپنے مزاج ہی کے اعتبار سے آگے بڑھ سکتے ہیں، اگر وہ کسی غیر اسلامی اصول و طریقے سے آگے بڑھنا چاہیں تو ممکن ہے کہ وہ آگے بڑھ جائیں اور کامیاب ہو جائیں لیکن یہ ان کی کامیابی نہیں بلکہ ان کی ہوگی جن کے اصول کو اپنا کر آگے بڑھے ہیں، مسلمان جب تک اپنے اصولوں

کو مضبوطی سے نہیں تھامیں گے اس وقت تک حقیقی ترقی اور کامیابی سے محروم رہیں گے —— ہاں اگر ایسا ہو کہ دوسرے لوگوں کے اصول میں کچھ کارآمد چیزیں ملتی ہوں۔ اور وہ شرعی اصول سے متصادم بھی نہ ہوں۔ تو ان کو اختیار کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔

" قدرے تلخی کے ساتھ فرمایا بڑی خرابی کی بات تو یہ ہے کہ ہم نے مغربی اقوام کے نظریات کو تو اختیار کر لیا اور عملیات کے اندر کسی چیز کو بھی نہ اختیار کر سکے۔

اسلامی سیاست کی بنیاد حقائق کے اوپر ہے اور ان کی بنیاد جذبات اور توہمات کے اوپر ہے۔ اسلامی سیاست کا معیار نبوت ہے قوت نہیں۔ اسلامی سیاست کردار و اخلاق کی بلندی۔ سچائی اور صداقت سکھاتی ہے۔ جوڑ۔ توڑ۔ نفاق اور ڈپلومیسی نہیں سکھاتی۔

مخدوم و مکرم حضرت مولانا حکیم عبدالرشید محمود صاحب دامت برکاتہم نے اپنے جوابات کے ساتھ مجھے جو نامہ گرامی تحریر فرمایا تھا وہ ان کے امر سے درج ذیل کیا جاتا ہے۔

محترم!

میری جہالت و سفاہت کو نظر انداز فرما کر اسی جواب پر اکتفار کیجئے سمجھتا ہوں اس تحریر و جواب سے آپ کا منشا اور مطالبہ پورا نہ ہو گا۔ مگر مجھ سے اتنا ہی بن پڑا، میں ضمیر کی آواز کو دبا نہ سکا ـــــ خلا پر ہونے کی بات دلچسپ ہے، آپ محسوس نہ کریں مطایبۃً عرض کرتا ہوں، یہ لفظ "خلا" ہر موت پر استعمال کرنے کی اب رسم اور عادت بن گئی ہے۔ علماء کیلئے، ارباب سیاست کیلئے ہر نمایاں شخصیت کیلئے ہر موت پر خلا پیدا ہو جاتا ہے، اور جلد ہی بھر بھی جاتا ہے ایام و شہور کی چند گردشیں آپ ہی اس خلا کو طبعاً بھر دیتی ہیں تازہ تازہ حادثہ پر مختلف صورتیں سطح اذھانی پر ذوق عقیدت واقعی یا رسمی کی تسکین کیلئے ابھرتی ہیں، کہیں کسی لائبریری کا قیام، اجرار جریدہ کی تجویزیں، اقبال اکیڈمی آزاد اکیڈمی، نہرو کالج، ڈاکٹر ذاکر حسین کالج، پٹیل ہاسپٹل، غالب پارک، اقبال گلشن، محمد علی روڈ، ظفر مارگ، رجال حکومت کے لئے ڈاک ٹکٹ مختلف یادگاریں، یہ دراصل خلا بھرنی کے جذبات کی تسکین ہے،

خلا تو دراصل وفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر پیدا ہوا تھا جو کبھی نہیں بھرے گا حضرت ام ایمن رض کا رونا اور یہ بتلانا کہ اسلئے رو رہی ہوں کہ جو بات لاکھ تئیس ہزار انبیاء علیہم السلام کی وفات سے نہ ہوئی تھی وہ اب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پیدا ہو گئی کہ وحی مقدس کا سلسلہ جبریل علیہ السلام کا اللہ کی طرف سے آنا پیغام لانا ہم کلامی ہمیشہ کیلئے ختم ہو گئی، اب نہ کبھی کوئی نبی آئے گا اور نہ جبریل قد انقطع الوحی و الدین ارشاد صدیقی سے ہی،

یا پھر دوسرا خلا جب عہد صحابہ و تابعین ختم ہوا اور قرون اولی شہود لہا بالخیر کا دور اٹھا، اسکے بعد تو بس لایزال طائفۃ قوامون علی الحق ظاہرین ہی کے تصور سے تسلی کر لیجئے، اور لا یعدی ام لخیرام

اسوہ کا انتظار، اور ظنی احتمالات ذاک وذاک اور فرق باطلہ قدیمہ وجدیدہ میں تو ہر ایک کہتا ہے ھذا انا ذاک

دیوبند کا اسی ہفتہ عشرہ کا حادثہ آپ نے سن لیا ہوگا کہ صدر جمعیۃ الطلبہ کو ہموار کر کے ہنگامہ برپا کردیا گیا منصوبہ طے شدہ تھا، یہ کرداری کی اصل سے شبہہائے مکروہ پھوٹ رہے ہیں کیا کوئی کسی کے کمالات کے بیان سے عوام کو مطمئن کر سکے، تو ریث ہی کے ذہن سے یہ گل وگلاب اپنی شمیم عنبر سے فضا کو معطر کر رہے ہیں...... جو جاہلیت خالصہ ہے۔ اور گولیاں چل رہی ہیں، رب، اغفر وارحم وانت خیر الراحمین۔

(آمین)

پانچ چھ پستول سے چڑھائی کی گئی یہ اعلان کر کے کہ اب ہم دارالعلوم پر قبضہ کر رہے ہیں اس سورش میں تذکرہ طیب سے کیا خوش فہمی اور ازالہ بدظنی کی توقع کی جا سکتی ہے، اس تذکرہ طیب کا وقت وہ ہے جب ہنگامے ختم ہو کر ایک مدید مدت گزر جائے، گو تاریخ کے نقوش انمٹ ہیں وہ باقی رہتی ہے۔

یہ ہنگامہ اس وقت ہوا جب ایک وفد مولانا نعمانی کے پاس پہونچا، صلح کی پیشکش کی انھوں نے جواب میں فرمایا کہ پہلے مقدمہ عدالت واپس تو پھر بات کرو، تذکرہ طیب کا یہ وقت نہیں مقصد پورا ہونا لندوش بھی لندور بھی۔

آئندہ منصوبہ

مکتبہ اثریہ کے زیر انتظام

المعہد الاثری

کا قیام

جس میں عربی زبان ذریعہ تعلیم ہو گی!